۲۰

معیاری ادب

گذشتہ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

معیاری ادب ۲۰

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

یعنی

گذشتہ لکھنؤ

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

تصحیح و ترتیب

رشید حسن خاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ اور حکومتِ جموّں وکشمیر کے اشتراک سے

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار۔ دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

شمشاد مارکیٹ، علیگڑھ

ستمبر ۱۹۷۱ء

تعداد ۱۱۰۰

قیمت: طلبہ اڈیشن ۵/۵۰

~~لائبریری اڈیشن ۱۰/۰۰~~

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ۱۵۲۸۔ پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۶

مجلسِ ادارت

حرفِ آغاز

پرانی کتابیں کم یاب ہوتی جارہی ہیں۔ جو کتابیں ملتی ہیں، اُن میں سے بیش تر قابلِ اعتبار نہیں۔ عام طور سے اُن کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ جو اچھی کتابوں کو خریدنا چاہتے ہیں، قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے نہیں خرید پاتے۔

اِن امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مکتبہ جامعہ نے، حکومتِ جموّں و کشمیر کے تعاون سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت قدیم معیاری کتابیں، صحتِ متن اور حُسنِ طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔ اِن کتابوں کا متن بہت اہتمام کے ساتھ تیار کیا جائے گا جو اُس کتاب کے معتبر ترین نسخے پر مبنی ہوگا۔ صحتِ متن کے ساتھ ساتھ صحتِ اِملا کا بھی بہ طورِ خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ اور یہ ساری کتابیں آفسٹ پر نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی جائیں گی۔ اس کے باوجود ان کتابوں کی قیمتیں کم سے کم ہوں گی اور اس کے لیے مکتبہ جامعہ حکومتِ جموّں و کشمیر کا ممنون ہے جس کی مالی امداد نے اِس بات کو ممکن بنایا۔

ہمیں اُمید ہے کہ حکومتِ جموّں و کشمیر کی مالی امداد سے مرتّب کیا ہوا کتابوں کا یہ سلسلہ اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اور اچھی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت میں بے حد معاون ثابت ہوگا۔

شاہد علی خاں
(جنرل منیجر)

تعارف

آصف الدّولہ اور واجد علی شاہ کے زمانے کا لکھنؤ! تصوّر کے ساتھ ہی رنگ و نور کی بے شمار پرچھائیاں آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں، اور یہ عالم اُس وقت ہے جب کہ نفاست و تہذیب اور عیش و عشرت کی اُس طلسماتی دنیا کا حال ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اُس عالمِ رنگ و نور اور اُس فردوسِ تہذیب و تمدّن کی آخری بہاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اُس دنیا کے آداب کو سمجھا اور برتا ہو اور پھر اُس بہار پر خزاں آتے بھی اُنھی آنکھوں سے دیکھی ہو، اُن کے تاثرات کیا ہوں گے؟ مولانا شررؔ کی کتاب "گذشتہ لکھنؤ" انھی تاثرات کی کہانی ہے۔

شررؔ کی عمر کا ابتدائی حصہ مٹیا بُرج میں واجد علی شاہ کے "ظلِّ حمایت میں" بسر ہوا تھا۔ ان کے والد مولوی تفضّل حسین، دفترِ انشا میں ملازم تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی اور "ہنوز ۱۵ سال کے تھے کہ منشی السّلطان کی ماتحتی میں ملازم ہو گئے" (یادِ ایام)۔ واجد علی شاہ سے لکھنؤ چھُٹ گیا تھا، مگر اُنھوں نے مٹیا بُرج میں ایک نیا لکھنؤ بسا لیا تھا، جہاں وہ سب کچھ تھا جو لکھنؤ میں اُن کو میسّر تھا، یا جس سے لکھنؤی معاشرت عبارت تھی۔ شررؔ

کے الفاظ میں :

"اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا، اور اُس کی منتخب صحبت مٹیابرج میں چلی گئی تھی . . . . یہی چہل پہل تھی، یہی زبان تھی، یہی شاعری تھی، یہی صحبتیں اور بذلہ سنجیاں تھیں، یہیں کے علما و اتقیا تھے، یہیں کے امرا و رؤسا تھے اور یہیں کے عوام تھے، کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ہم بنگالے میں ہیں، یہی پتنگ بازیاں تھیں، یہی مرغ بازیاں تھیں، یہی بٹیر بازیاں تھیں، یہی افیونی تھے، یہی داستان گوئی تھی، یہی تعزیہ داری تھی، یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی، یہی امام باڑے تھے اور یہی کربلا تھی . . . . مٹیا برج کے دکان دار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو . . . . .

محلات کی ڈیوڑھیوں اور محل سراؤں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیے تو عجب لطف کی دھوم دھام ہے کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آجاتیں اور ایسی فصیح و دل کش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں آجاتیں کہ انسان مدتوں بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا . . . .

لکھنؤ میں تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اس کے پاس کی چند عمارتیں یا اپنے والدِ مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا، مگر مٹیا برج میں نفیس اور اعلا عمارتوں کا ایک خوب صورت شہر بسا دیا تھا۔"

اودھ کی حکومت کی طرح، یہ عشرت کدۂ سمت بنیاد بھی، واجد علی شاہ

کی آنکھیں بند ہوتے ہی اِس طرح مٹ گیا، جیسے صفحۂ ہستی سے کوئی نقشِ غلط محو ہو گیا ہو۔ دوسری طرف ۱۸۵۷ء کے بعد اور مقامات کی طرح لکھنؤ میں بھی نئی معاشرتی اقدار کا نقش درست ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پُرانی تہذیبی زندگی کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور بہت سے لوگوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ سب کچھ لٹا جا رہا ہے۔

شررؔ نے اِن واقعات کو دیکھا تھا محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں، یہ موجِ خوں گویا اُن کے سر سے بھی گزری تھی۔ ناول نگار کا ذہن، انشائیہ نگار کا مزاج، جذباتی طبیعت، مشتعل احساس اور وہ جانب داری جس سے ہم دردی کا وفادارانہ جذبہ کارفرما رہتا ہے، یہ سارے عناصر ان کی ذات میں یک جا تھے۔ اور اس داستان کو قلم بند کرنے کے لیے ایسے ہی کسی فرد کی ضرورت تھی۔

شررؔ کو ہم کئی حیثیتوں سے اچھّی طرح جانتے ہیں۔ وہ اردو کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے تاریخی ناول نگار تھے، ان میں سے اکثر ناولوں میں منظر نگاری وغیرہ کے علاوہ، سب سے نمایاں چیز اُن کا جذباتی اندازِ بیان ہے۔ ان کے شاہ کار ناول فردوسِ بریں میں تو کردار نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے۔ یا پھر اُن کا نام چکبست و گلزارِ نسیم کے یادگار معرکے کے ساتھ ذہن میں آتا ہے، جس میں اُن کی مناظرانہ افتادِ طبع کی روشنی صاف صاف نظر آتی ہے۔ ہاں ایک اور موضوع بھی ایسا ہے جس میں اُن کی حیثیت بہت نمایاں ہے اور وہ ہے انشائیہ نگاری ——— مگر یہ سب منتشر جلوے ہیں۔ کہیں کسی کی نمود ہے، اور کسی کتاب میں کسی دوسرے عنصر کی جلوہ گری ہے۔ لیکن گذشتہ لکھنؤ میں اِن سب عناصر نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایسی تصنیف ہے جس میں اُن کے مزاج اور قلم کے سارے جوہر، قدِ آدم تصویر کی صورت میں روشن ہیں۔ اِس میں بے حد جذباتی اندازِ نظر بھی ہے۔ تاریخی حقیقت پسندی کے نقش بھی ہیں، وہ ناتمام سہی، مناظرانہ مزاج کی

گل کاریاں بھی ہیں۔ نیم روشن کردار بھی ہیں اور جذبات سے بھرپور وہ اندازِ نگارش بھی ہے جس کے بغیر، خواہ حقیقت نگاری کا حق ادا ہو جائے، دل کشی کا رنگ نہیں نکھرتا۔ یہ واقعہ ہے کہ اسی جذباتی اندازِ نظر نے اس کتاب کو بہت سی کتابوں سے زیادہ مقبول بنایا ہے۔ یہ اِسی اندازِ بیان کا کمال ہے کہ پڑھنے والا، لکھنے والے کی طرح، اُس تمدن کے ہر منظر سے اپنے آپ کو قریب محسوس کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ اُس تمدن کی تباہی کو، ایک بہت بڑا المیہ تسلیم کر لیتا ہے اور تاریخی واقعات کی کڑوی حقیقتیں یا تہذیب و تمدن کی تشکیل اور ارتقا کے مسلّمہ قوانین کا علم و عرفان بھی اُس کے اِن جذبات کو دھندلا نہیں پاتا۔

اس کتاب کا مکمل نام "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ" ہے۔ نام ہی سے مصنف کے اندازِ نظر اور اس کتاب کے موضوع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شرر کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے عہد میں تہذیب نے جس قدر ترقی کی تھی، مغل حکومت کی تباہی کے ساتھ ہی، وہ ساری تہذیبی دولت لکھنؤ منتقل ہو گئی۔ اور یہاں ایک نئی معاشرت کا نقش بننا شروع ہوا، جس کی بنیاد اگرچہ دہلی سے آئی ہوئی تہذیبی روایتوں پر تھی، لیکن جس نے جلد ہی یہاں ایک نیا پیکر اختیار کر لیا۔ یہ پیکر کئی اعتبارات سے دہلوی تہذیب یا عہدِ مغل کی معاشرت سے زیادہ لطیف، نفیس، شان دار، روشن اور ترقی یافتہ تھا۔ اور اِس حد تک ترقی یافتہ تھا کہ اُس کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا جانا چاہیے۔ اس میں اُن لطافتوں کی روح سمٹ آئی تھی جو تہذیب کے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے۔ مولانا نے صرف دعوا نہیں کیا ہے، بلکہ ان خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے جن سے اُن کے خیال کے مطابق اس تہذیب کو پہچانا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بہت تفصیل کے ساتھ اُن باتوں کو نمایاں کیا ہے

جو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور اُن چیزوں کی بھی وضاحت کی ہے جو یہاں آکر ذرّے سے آفتاب بن گئیں۔

جس چیز کو لکھنؤ کا تمدّن کہا جاتا ہے، اس کی شروعات تو اُس وقت سے ہوتی ہے، جب بکسر کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد، نوّاب شجاع الدّولہ کی توجہات کا مرکز فیض آباد قرار پایا۔ اس شکست نے شجاع الدّولہ کی اُس مضطرب زندگی کا ایک طرح سے خاتمہ سا کر دیا، جس نے اُن کے ذہن کو فوجوں اور میدانِ جنگ کی فکروں میں زیادہ مشغول کر رکھا تھا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ تلوار ان کے ہاتھ میں رہی، لیکن ان کی زیادہ توجہ فیض آباد کی رونق و آراستگی اور طرح الفنون کی سرپرستی کی طرف مبذول ہونا شروع ہوئی اور درباری حلقے میں اس مجہول عیش پرستی کا آغاز ہوا، جس نے واجد علی شاہ کے زمانے میں کسی کو اور کسی کام کا رکھا ہی نہ تھا۔

لیکن پھر بھی، اُس وقت تک نوّاب برہان الملک اور صفدر جنگ کی روایتوں کے اثرات کارفرما تھے۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ مرکزی حیثیت اُس وقت تک فیض آباد کو حاصل تھی۔ نواب آصف الدّولہ نے مسند نشیں ہوتے ہی، لکھنؤ کا رخ کیا۔ فیاضی اور عیش پرستی میں وہ اپنے باپ شجاع الدّولہ سے کہیں آگے تھے، لیکن ملک داری و ملک گیری کے جذبات ان کو گویا ورثے میں ملے ہی نہیں تھے۔ اس کے بعد ہی سے لکھنؤ میں تعمیرات کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اختتام کا سرا واجد علی شاہ کے قیصر باغ سے ملا ہوا ہے اور اُس تہذیبی امتیاز کی بنیاد پڑتی ہے جس نے بعد کے فرماں رواؤں کے زمانے میں ارتقا کے مرحلے طے کیے ——— اِس لحاظ سے لکھنوی تمدّن جس کا نام ہے، اُس کا اصل آغاز عہدِ آصف الدّولہ سے شروع ہوتا ہے جو ۱۷۷۵ء میں شجاع الدّولہ

کی موت کے بعد اُن کے جانشین ہوئے تھے۔

اس سلسلے کا دوسرا اہم موڑ وہ تھا جب نوّاب سعادت علی خاں کے بیٹے غازی الدّین حیدر کو انگریزوں نے بادشاہ کا خطاب عطا کیا۔ اس سے پہلے اودھ کے حکم راں نوّاب وزیر کہلاتے تھے اور رسماً اور روایۃً اپنے کو تختِ دہلی کا ماتحت تصوّر کرتے تھے۔ یہ گویا دہلی کی بالادستی اور یکتائی کا جواب تھا۔ اور اُس روایتی تصوّر کو ختم کرنے کی باضابطہ کوشش تھی جو اُس وقت پورے شمالی ہند کو ایک رشتے میں کسی نہ کسی واسطے سے منسلک رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو بادشاہت اس طرح عالمِ وجود میں آئی ہو، وہ لازماً یہ کوشش کرے گی کہ پچھلے احساسِ زیردستی کے سارے نقوش فنا ہو جائیں اور یہاں وہ سب کچھ ہو جس سے تاج داری کا روایتی تصوّر پروان چڑھتا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ غازی الدّین حیدر ہی کے زمانے سے سلطنت میں مذہبی عناصر نے زیادہ نمود حاصل کی۔ اُن سے پہلے کے حکم رانانِ اودھ بھی شیعہ تھے، لیکن کچھ تو تختِ دہلی سے نسبت کی بنا پر اور کچھ اس بنا پر کہ اُن حکم رانوں کو ملک داری کے کچھ نہ کچھ کام ضرور درپیش رہتے تھے، مذہبیّت میں انہماک کم تھا۔ برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدّولہ کی زندگیوں کا خاصا بڑا حصّہ میدانِ جنگ میں گزرا تھا، یا ملک اور فوج کی نگہداشت میں۔ آصف الدّولہ کو فیّاضی اور عیّاشی سے فرصت نہ تھی۔ سعادت علی خاں واقعی کچھ کرنا چاہتے تھے، لیکن اُنھی کے زمانے میں مملکتِ اودھ کا خاصا بڑا حصّہ انگریزوں کی نذر ہوا تھا، وہ زندگی بھر اسی کے غم میں کڑھتے اور حد سے زیادہ کفایت شعاری کر کے روپیا جمع کرتے رہے تھے۔

غازی الدّین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کروڑوں روپیا ملا تھا، اور

ملک داری کے حوصلے یا ہمت میں سے بالکل حصّہ نہیں ملا تھا۔ سیاسی حالات وہ صورت اختیار کر چکے تھے کہ اب اس حوصلے اور ہمت کے لیے میدان بھی نہیں بچا تھا۔ اُن کی بیگم کو مذہبی معاملات میں بے حد انہماک تھا۔ لہٰذا شاہِ وقت کے دو ہی مشغلے تھے: تفریحات یا نئی نئی مذہبی رسموں کی بجا آوری۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں مذہبیت کے عناصر ہر چیز پر غالب آ چکے تھے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اگرچہ دلّی میں ایرانی امرا شروع ہی سے اہم حیثیت رکھتے تھے۔ فارسی زبان سرکاری زبان تھی اور ایرانی ادب و تہذیب سکّۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتے تھے لیکن خالص مذہبی حدود میں وہ بے تکلّفانہ آزادی حاصل نہیں تھی جو کسی خالص شیعہ حکومت میں حاصل ہو سکتی تھی۔ ماوراء النّہری رقابتیں بھی اپنا کام کرتی رہتی تھیں اور آخر میں تو اس آویزش کے اثرات ذرا کھل کے نمایاں ہونے لگے تھے۔ لیکن دربارِ لکھنؤ میں اور خاص طور سے غازی الدین حیدر کے زمانے سے وہ فضا بھی مل گئی جس میں عقیدوں کو پوری تفصیلات اور آب و تاب کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ امجد علی شاہ کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی کام جناب قبلہ و کعبہ سے پوچھے بغیر کرتے ہی نہیں تھے ——— اس طرح مذہب نے تہذیبی مظاہر کو تیزی سے متاثر کرنا شروع کیا اور یہ سب سے بڑا عنصر تھا جس نے لکھنؤ کی معاشرت میں بہت سے ایسے عناصر کی تشکیل کی، جس سے وہ دلّی سے آئی ہوئی معاشرت سے متمائز معلوم ہونے لگی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عزاداری کی وسیع الذّیل تفصیلات نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو بدل کے رکھ دیا۔ مرثیہ نگاری، تعزیہ داری، سوز خوانی، مجالس اور اُن سے متعلق بہت سے اُمور اور ان کے گہرے اثرات نے ایک بالکل نئے انداز

کی صورت نگاری کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ لکھنؤ میں جس نئے تمدّن کی داغ بیل پڑی اور جس نے عہدِ آصف الدّولہ سے فروغ پذیر ہونا شروع کیا تھا، اُس کی تشکیل کیا تہذیب و تمدن کے فطری قوانینِ تشکیل و ارتقا کے تحت ہوئی تھی اور کیا واقعی اُس میں ایسے بنیادی طاقت ور عناصر شامل تھے جو کسی پایدار اور تہ نشین تہذیب کی نقش گری میں شامل ہوا کرتے ہیں۔ ایک ضمنی بات یہ بھی کہ اس تہذیب میں "ظاہر" پر اس قدر زور کیوں ملتا ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے میں ملمّع کاری اور مرصّع کاری کو اعلا مرتبہ بخش دیا تھا۔

تہذیب ایک ایسا نقش ہے جس کو تہ نشین ہونے اور سنورنے کے لیے خاصی لمبی مدّت درکار ہوتی ہے۔ یہاں ضابطے بنتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ بے شمار عناصر، قدرتی طور سے آمیزش و آویزش کے تہ در تہ عمل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، بنتے اور مٹتے رہتے ہیں، تب صورتوں کی نمود ہوتی ہے۔ جس طرح اچھی شاعری کو محض صنعت گری راس نہیں آتی، اُسی طرح تہذیبی سطح پر بھی ایسی کوششیں دیرپا نہیں ہوتیں جن کی مدد سے کوئی طبقہ یا علاقہ یہ چاہے کہ تہذیبی عوامل کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ یا یہ کہ ارتقائے تہذیب یا تشکیلِ تہذیب کے آہستہ خرام فطری قانون کو تبدیل کر دیا جائے۔ ضد میں سب کچھ کیا جا سکتا ہے، کیا بھی جاتا ہے، لیکن ایسی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقش، چمک دار تو بن جاتے ہیں، دیرپا نہیں ہوتے اور اُن میں تہ داری کی بھی کمی ہوتی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ نو آمدہ تہذیبی عناصر اگر اس قدر طاقت ور ہوں کہ اُن کے سامنے رائج معاشرت کا سر خود بہ خود جھک جائے، اِس صورت میں

ضرور آمیزش و ارتقا کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے یہی شرط ہے کہ ان نئے تمدنی عوامل میں متاثر کرنے کی اس قدر طاقت ہو کہ اُس علاقے کی معاشرتی زندگی اُن کو قبول کر لینے کے لیے مجبور ہو، کچھ تو اپنی کمزوری کی وجہ سے اور کچھ ان نئے عناصر کی بالادستی کی وجہ سے، اور یہ بھی کہ ان عوامل کے پیچھے ایک طاقت ور معاشرتی نظام کی طاقت بھی شریک ہو۔

کیا لکھنؤ میں یا فیض آباد میں یہی صورت پیش آئی تھی؟ یہ معلوم ہے کہ یہاں سب کچھ دہلی سے آیا تھا، افراد بھی اور معاشرت بھی، اپنی پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ۔ یہاں کے خاص حالات کی بنا پر، فلسفۂ عشرت اندوزی اور مذہبیت کے کچھ اہم عناصر کا اضافہ ہوا۔ اور دہلی کے مقابلے میں ایک نئی متمائز معاشرت اختیار کرنے کی شعوری کوششوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی چیزیں پیدا کرنا شروع کیں، جن میں نمود تو بہت تھی، تہ داری نہیں تھی۔ چوں کہ ان اضافوں کی بنیاد کسی اہم نقطۂ نظر پر مبنی نہیں تھی، یہ کسی ایسی معاشرت کے پیدا کردہ نہیں تھے جو تہذیب و تمدن کے ارتقائی مراحل طے کر کے، ایک مستقل روپ میں ڈھل چکی ہو؛ اس لیے زبان کے چند خارجی امتیازات، لباس کی کچھ ظاہری تراش خراش اور نشست و برخاست کے کچھ مرصّع آداب کے سوا، اور کوئی چیز ایسی پیدا نہیں ہو سکی جس سے معاشرت کو آبِ حیات ملتا ہے اور نمود کے ساتھ ساتھ گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔

ہاں! بس ایک چیز ایسی ضرور ہے جس نے دیرپا اثرات ڈالے، اور وہ ہے مذہبیت کی طاقت ور روایت۔ مذہب کا تعلق انسان کے ظاہر سے کم، اور اُس کے باطن سے زیادہ ہوتا ہے۔ آدمی مذہبی فرائض پر عمل نہ کرے، لیکن مذہب ایسے فکری عناصر کو پیدا کیا کرتا ہے، جو بہت تہ نشیں ہوتے ہیں اور جن

کی صورت نگاری کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ لکھنؤ میں جس نئے تمدّن کی داغ بیل پڑی اور جس نے عہدِ آصف الدولہ سے فروغ پذیر ہونا شروع کیا تھا، اُس کی تشکیل کیا تہذیب و تمدّن کے فطری قوانینِ تشکیل و ارتقا کے تحت ہوئی تھی اور کیا واقعی اُس میں ایسے بنیادی طاقت ور عناصر شامل تھے جو کسی پایدار اور تہ نشین تہذیب کی نقش گری میں شامل ہوا کرتے ہیں۔ ایک ضمنی بات یہ بھی کہ اس تہذیب میں "ظاہر" پر اس قدر زور کیوں ملتا ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبے میں ملمّع کاری اور مرصّع کاری کو اعلا مرتبہ بخش دیا تھا۔

تہذیب ایک ایسا نقش ہے جس کو تہ نشیں ہونے اور سنورنے کے لیے خاصی لمبی مدّت درکار ہوتی ہے۔ یہاں ضابطے بنتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ بے شمار عناصر، قدرتی طور سے آمیزش و آویزش کے تہ در تہ عمل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، بنتے اور مٹتے رہتے ہیں، تب صورتوں کی نمود ہوتی ہے۔ جس طرح اچھی شاعری کو محض صنعت گری راس نہیں آتی، اُسی طرح تہذیبی سطح پر بھی ایسی کوششیں دیرپا نہیں ہوتیں جن کی مدد سے کوئی طبقہ یا علاقہ یہ چاہے کہ تہذیبی عوامل کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ یا یہ کہ ارتقائے تہذیب یا تشکیلِ تہذیب کے آہستہ خرام فطری قانون کو تبدیل کر لیا جائے۔ ضد میں سب کچھ کیا جا سکتا ہے، کیا بھی جاتا ہے، لیکن ایسی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقش، چمک دار تو بن جاتے ہیں، دیرپا نہیں ہوتے اور اُن میں تہ داری کی بھی کمی ہوتی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ نو آمدہ تہذیبی عناصر اگر اس قدر طاقت ور ہوں کہ اُن کے سامنے رائج معاشرت کا سر خود بہ خود جھک جائے، اِس صورت میں

ضرور آمیزش و ارتقا کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے یہی شرط ہے کہ ان نئے تمدنی عوامل میں متاثر کرنے کی اس قدر طاقت ہو کہ اُس علاقے کی معاشرتی زندگی اُن کو قبول کر لینے کے لیے مجبور ہو، کچھ تو اپنی کم زوری کی وجہ سے اور کچھ ان نئے عناصر کی بالادستی کی وجہ سے اور یہ بھی کہ ان عوامل کے پیچھے ایک طاقت ور معاشرتی نظام کی طاقت بھی شریک ہو۔

کیا لکھنؤ میں یا فیض آباد میں یہی صورت پیش آئی تھی ؟ یہ معلوم ہے کہ یہاں سب کچھ دہلی سے آیا تھا، افراد بھی اور معاشرت بھی، اپنی پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ۔ یہاں کے خاص حالات کی بنا پر، فلسفۂ عشرت اندوزی اور مذہبیت کے کچھ اہم عناصر کا اضافہ ہوا۔ اور دہلی کے مقابلے میں ایک نئی متمائز معاشرت اختیار کرنے کی شعوری کوششوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی چیزیں پیدا کرنا شروع کیں، جن میں نمود تو بہت تھی، تہ داری نہیں تھی۔ چوں کہ ان اضافوں کی بنیاد کسی اہم نقطۂ نظر پر مبنی نہیں تھی، یہ کسی ایسی معاشرت کے پیدا کردہ نہیں تھے جو تہذیب و تمدن کے ارتقائی مراحل طے کر کے، ایک مستقل روپ میں ڈھل چکی ہو؛ اس لیے زبان کے چند خارجی امتیازات، لباس کی کچھ ظاہری تراش خراش اور نشست و برخاست کے کچھ مرصع آداب کے سوا، اور کوئی چیز ایسی پیدا نہیں ہو سکی جس سے معاشرت کو آبِ حیات ملتا ہے اور نمود کے ساتھ ساتھ گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔

ہاں! بس ایک چیز ایسی ضرور ہے جس نے دیرپا اثرات ڈالے، اور وہ ہے مذہبیت کی طاقت ور روایت۔ مذہب کا تعلق انسان کے ظاہر سے کم، اور اُس کے باطن سے زیادہ ہوتا ہے۔ آدمی مذہبی فرائض پر عمل نہ کرے، لیکن مذہب ایسے فکری عناصر کو پیدا کیا کرتا ہے، جو بہت تہ نشیں ہوتے ہیں اور جن

کے اثرات سے انسان چاہنے کے بعد بھی جلد چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا۔ یہ افراد کے احساس میں شامل ہوتے ہیں اور پورے گروہ کی زندگی پر حاوی رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اودھ میں مذہبیت کا فروغ، بعض خاص حالات میں ہوا تھا اور در پردہ اُس میں بھی دہلی کے مقابلے میں ایک نئی نمود یا آزادی کا احساس شامل تھا۔ اس احساس نے مذہبیت کے عناصر کو بھی خارجی زندگی سے زیادہ قریب رکھا اور عرفان سے زیادہ اظہار اس کا اہم جز رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں وہ بے شمار مذہبی رسمیں پیدا ہوگئیں جن کو نفسِ مذہب سے بہت زیادہ تعلق نہ تھا لیکن چوں کہ فرماں روایانِ وقت نے ان کو اختیار کیا تھا، اس لیے عوام میں ان کا مقبول ہونا ضروری تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے سارے علاقوں کے برخلاف وہاں تبرّا اور تولّا کے بے محابا اظہار کو بہت فروغ ہوا، تعزیہ داری کا رواج بڑھا، مرثیہ خوانی گویا ادبی اور تہذیبی زندگی کا جزِ لازم قرار پائی اور مجالس نے تہذیبی اداروں کی سی اہمیت اختیار کرلی۔ شامِ غریباں، کربلا، درگاہیں، امام باڑے، ان کے بہترین مظہر تھے اور اس زاویے سے دیکھا جائے تو واقعی اودھ میں ایک نئی معاشرت نظر آئے گی، جو دہلی ہی سے نہیں، ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی مختلف ممتاز اور بجائے خود معیاری تھی۔ اس کے اثرات آج بھی وہاں کی تہذیبی زندگی میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

آصف الدولہ کے زمانے میں تلوار گویا ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑی تھی۔ شجاع الدّولہ کے بعد، اودھ کی حکومت نے کسی اہم لڑائی میں حصّہ نہیں لیا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ سارے کام انگریزی فوجیں انجام دیا کرتی تھیں۔ جہاں گیری و جہاں بانی کی قدیم روایتوں کی چھاپ بھی عہدِ شجاع الدّولہ کے آخر سے مٹ چلی تھی۔ لہٰذا اب دربار اور اس کے امرا و اعیان کے لیے زندگی

کے دوسرے میدان ہی بچے تھے جہاں وہ دل کی حسرتیں نکالیں۔ گھر کے دیوان خانے تھے جہاں مصاحبین جمع ہو کر زبانوں کی تلوار کے جوہر دکھائیں۔ طوائفوں کے کوٹھے تھے، جہاں تہذیب و شائستگی کے سایے میں تفریح کی لذت حاصل کی جائے۔ مرغوں اور بٹیروں کی پالیاں تھیں، جہاں بازیاں لگا کر، اجداد کی جنگ جوئی کی یادیں تازہ کی جایا کریں، اور داستان گو تھے، جو لفظوں کے پھولوں سے طلسمی باغ لگا کر، خیالوں کی ایسی نئی نئی دنیائیں زمین پر بسا دیا کرتے تھے، جن میں چار گھڑی کے لیے محو ہو کر، اپنی دنیا کی تلخ حقیقتوں سے نجات حاصل جا سکتی تھی۔ لطیف و خوش ذائقہ کھانے تھے، جو اس قدر بھاری ہوا کرتے تھے کہ ان کو ہضم کرنا، ہر معدے کا کام نہیں تھا۔ ایک زمانے میں بھاری کمان نشانِ امتیاز ہوا کرتی تھی، جس کو ہر شخص جُھکا نہیں پاتا تھا اور وہ گھروں میں نہیں، لڑائی کے کام آیا کرتی تھی۔ اب ایسے ایسے بھاری پلاو پکا کرتے تھے، جن کو ہضم کرنا، ہر ایرا غیرا کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور یہ بڑے امتیاز کی بات تھی کہ فلاں رئیس کے باورچی خانے میں مثلاً ڈھائی سو روپے روز کی پخت ہوتی ہے، یا یہ کہ رئیس کے لیے جو خاص پلاو پکتا ہے اُس میں چھٹانک بھر چاولوں میں سیر بھر گھی کھپا دیا جاتا ہے۔ برہان الملک اور منصور جنگ کی تلواروں کی دھار کُند ہو چکی تھی، اور بسم اللہ کے گُنبد میں بند رہنا، کمالِ وضع داری بن گیا تھا۔ گھروں کے اندر ماماؤں، مغلانیوں اور ڈومنیوں کے دم سے زندگی کا کاروبار رواں تھا اور باہر طوائفوں، مصاحبوں، داستان گویوں، افیمیوں، اور بٹیر بازوں، مرغ بازوں، کبوتر بازوں کے وجود سے زندگی کے ہنگامے گرم تھے۔ ان سب مظاہر میں بڑی رونق تھی، نمود تھی، چمک دمک تھی، ایسی دل کشی تھی کہ ایک خاصے لمبے عرصے کے لیے تہذیب و تمدن کا ایک نیا مرقع سجا ہوا نظر

آثار ہا۔ لیکن اِن کی تہ میں ایسی مضبوط بنیادیں نہیں تھیں جن پر طاقت ور افکار و نظریات، فنونِ لطیفہ کی روایات اور تمدّنی خصوصیات کی پائیدار عمارت تعمیر ہو سکے۔

تہذیبی مظاہر کے عکس سب سے زیادہ تہ داری کے ساتھ فنونِ لطیفہ میں اُتر آتے ہیں۔ اِن میں تہذیب و تمدّن کا عطر کھنچ آتا ہے۔ آپ کسی قوم یا علاقے کی تہذیبی میراث کی بلندی یا پستی کا اندازہ، فنونِ لطیفہ کے انداز و معیار سے بھی لگا سکتے ہیں۔ اودھ میں حکومت کے شعلۂ مستعجل نے زندگی کی چمک دمک تو بڑھا دی تھی، لیکن اُس میں وہ گہرائی نہیں پیدا ہو سکی تھی جس کی تہ میں تخلیق کا اضطراب موجیں مارتا ہے۔ غالب نے ایک جگہ خواہش اور پرستش کا فرق بھلا دیا جانے کا ماتم کیا ہے، اُسی طرح کی صورت یہاں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ عام معاشرت کی ظاہر آرائی نے، ان کی جس حد تک بھی نمود ہوئی، اس میں سطحی رنگ کی آمیزش کو نمایاں رکھا۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کہ لکھنؤ کی اُس عہد کی شاعری کا بڑا حصّہ لفظوں کی سجاوٹ سے گراں بار ہے اور رعایتوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہے۔ ہاں رہس اور اندر سبھا جیسی چیزوں کو اس قدر فروغ ہوتا ہے کہ زمین آسمان اُن آوازوں سے گونجنے لگتے ہیں۔ ڈومنیاں اور بھانڈ معاشرت کا ضمنی نہیں، نمایاں جُز بن جاتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کو معاشرت کی گہری بنیادوں سے اور اُس کی پشت پر طویل افکار کا جو سلسلہ ہوا کرتا ہے، اُس سے مدد ملا کرتی ہے۔ جہاں معاشرت سطحی تعیّنات پر مبنی ہو اور اُس کے قیام و اختتام میں بہت زیادہ فاصلہ بھی نہ ہو، وہاں فنونِ لطیفہ اور اُن کے متعلقات کی یہی صورت ہوگی۔

یہاں پر ایک اہم پہلو کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ دہلی میں مغل حکومت کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ، معاشرت کے ہر شعبے میں خرابیاں بڑھنا

شروع ہوگئی تھیں۔ طوائف، بھانڈ، بھگتیے، نقّال، غرض وہ سب کچھ یہاں بھی تھا جو لکھنؤ میں فروغ پذیر صورت میں نظر آتا ہے، وہی سطحی عیش کوشیاں اور وہی مآل سے بے پروائی۔ بدحالی مزید برآں، جس سے ان برائیوں کو اور زیادہ پستی ملا کرتی ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ عناصر یہاں کی معاشرت کا نمایاں جز نہیں معلوم ہوتے؛ معاشرت انھی سے عبارت نہیں معلوم ہوتی۔ تلواروں کی دھار کُند ہو چکی تھی، اور جنگ جوئی کا میدان بالکل چھوٹ گیا تھا، لیکن پھر بھی زندگی کے شعبوں میں اُس نسائیت آمیز شائستگی کا عکس اُس انداز سے نہیں نظر آتا، جو اودھ کی اُس معاشرت کا امتیازی وصف ہے۔ یہاں آدابِ نشست و برخاست میں، لہجے میں اور لباس میں وہ تزئینی انداز غالب نہ آسکا جس کے ڈانڈے انفعالیت سے مل جایا کرتے ہیں۔ وجہ یہی تھی کہ ساری تباہی کے باوصف اس معاشرت کی پشت پر ایک طویل و عریض اور واقعی عظیم تہذیب کا سرمایہ تھا۔ وسیع الذّیل اور طاقت ور تہذیبوں کی تباہی یا شکست کے لمحات میں بھی، اُن کے عوامل اپنا اثر نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ دہلی کی سلطنت اصل میں ترکوں اور مغلوں کی ورثہ دار تھی۔ ایرانی اثرات یہاں تھے، لیکن ان کی حیثیت حاکمانہ اثرات کی نہیں تھی، یہ شرف ماوراء النّہری تہذیبی عوامل کو حاصل رہا۔ یقیناً یہاں کے فنونِ لطیفہ نے، زبان نے اور معاشرت نے ایران کی جمالیاتی دولت اور تہذیبی سرمایے سے بہت کچھ حاصل کیا، لیکن یہ نقش و نگارِ پردۂ در تھے، یہ آرائش کے اجزا تھے، تہذیب کی بنیاد ترکوں اور مغلوں کی سنگلاخ روایتوں پر قائم ہوئی تھی، صلابت جن کا جزوِ اعظم تھی۔

اودھ کی سلطنت کا پہلا مرکز فیض آباد تھا۔ اس سلطنت کے بانی نوّاب برہان الملک، نیشاپوری تھے، ایرانی النسل تھے، لیکن دہلی کے دربار سے منسلک تھے،

اور جب یہاں آئے تو شمشیر و سناں کے ساتھ آئے۔ شجاع الدولہ کے عہد تک فیض آباد ہی مرکزِ حکومت تھا اور لکھنؤ ایک معمولی علاقہ تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ اُس وقت تک لباس، زبان اور دوسرے مظاہر میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئے گی جس کو واجد علی شاہی معاشرت کا نقشِ اول کہا جا سکے۔ آصف الدولہ نے مسند نشیں ہوتے ہی لکھنؤ بسایا اور اسی کے ساتھ زندگی کے اکثر شعبوں میں تغیّر کی ایک ہلکی سی لہر شروع ہوئی، جو نواب سعادت علی خاں کے بعد سے زیادہ طاقت ور صورت میں نمایاں ہوئی۔ اُس وقت تک وہ سارے اثرات اور عناصر ختم ہو چکے تھے جو نواب برہان الملک کے ساتھ دہلی سے آئے تھے۔ اور مذہبی اثرات کی مدد سے ایرانی مزاج نے اپنی اُس شائستگی کو نمایاں کرنا شروع کر دیا تھا جو مزاجاً ترکمانی کلچر سے مختلف تھی اور جس میں غالب عنصر جمالیات کا تھا۔ پھر جب بادشاہت کا لقب ملا اور مذہبی اثرات نے ہمہ گیر ہونا شروع کیا تو یہاں کے خاص حالات کی بنا پر، جمالیاتی تہذیبی عناصر نے، اُس آرائشی انداز کی صورت میں نمو پذیر ہونا شروع کیا، جس میں انفعالیت کی لہریں رواں دواں تھیں۔ سیاسی حالات کے لحاظ سے ساری چٹک بھڑک کے باوجود، اصلاً وہ معاشرت انحطاط پذیر تھی۔ ان انحطاطی اثرات کے گہرے سایے میں ایرانی جمالیاتی عناصر نے ایک ایسی تہذیب کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنا شروع کیا، جو مزاجاً اُس ترکمانی تہذیب سے بالکل مختلف تھی اور بعض اعتبارات سے متضاد تھی جس نے کئی طاقت ور عناصر کی مدد سے دہلی میں ارتقا کی منزلیں طے کی تھیں۔ انحطاط پذیر معاشرے نے ایرانیت کے جمالیاتی عناصر کو انفعالی اثرات کی آمیزش کے ساتھ جذب کیا۔

لکھنؤ کے آدابِ نشست و برخاست کی بڑی شہرت ہے، لہجے کی شائستگی اور مناسب الفاظ کے استعمال کی بڑی حیثیت ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو

آپ کو نظر آئے گا کہ صفاتی الفاظ کا اعتدال سے زیادہ استعمال ایرانی مزاج کا جزو رہا ہے اور اس کو آج بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ایرانی مزاج کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تنقید کو گوارا نہیں کرتا ایرانی ادبیات میں آج بھی اس صنفِ ادب کی بڑی کمی ہے۔ ایرانی آپ سے مخاطب ہوکر بے حد شستہ، شایستہ، نرم اور ریشمین لہجے میں بہت سے الفاظ محبت و تعظیم ادا کرے گا، لیکن ان میں سے اکثر لفظ محض رسم کلام یا انداز بیان کی حیثیت رکھتے ہوں گے۔ لفظ و معنی کی ثنویت پر ایرانی قوم سے زیادہ شاید ہی کسی قوم کا ایمان ہو۔ یہ ثنویت زندگی کے بعض اور اہم مظاہر میں بھی نمایاں نظر آئے گی۔ دراصل اس ثنویت کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے۔ ثنویت یعنی دُہرے پن کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ تو تہذیب و شایستگی کا جزو ہے ——— اودھ کی اس تہذیب میں بھی آپ ثنویت کا گہرا عکس اور اثر پائیں گے۔ وہی مرصع صفاتی الفاظ کی بہتات، اور زندگی کے مظاہر میں دُہرے پن کا عمل دخل، جو تہذیب و شایستگی کے ریشم میں ملفوف نظر آتا ہے۔ یہ وہی ایرانی تہذیب کا اثر ہے، دہلی میں اس رنگِ تہذیب کی نمود اس انداز سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

طوائف دہلی میں بھی تھی، لیکن یہاں کی معاشرت میں اُس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ تہذیب کا نمایندہ منظر اور معیار بن سکے۔ شایستگی دہلی میں بھی تھی، لیکن اس میں رکھ رکھاو، تکلف اور صناعی کا وہ انداز نمایاں نہ ہو سکا جو لکھنوی تہذیب کا نمایاں تر بلکہ نمایندہ تر پہلو ہے۔ شاہ نصیر یہاں بھی تھے، رعایتِ لفظی اور ابتذال یہاں بھی شاعری کے اجزا میں داخل تھے لیکن ان اجزا کی وہ حیثیت نہیں تھی کہ ان کو اہم ترین خصوصیات کے ذیل میں رکھا جا سکے اور یہ عناصر وجہ امتیاز بن کے رہ جائیں، بلکہ شریکِ غالب بن جائیں۔

شجاع الدّولہ کے عہد کے بعد، جب کہ جنگ جوئی کا تصوّر ہی مبہم ہوگیا، امرا کی ساری توجّہ لباس، آرائش، تکلّفاتِ نشست و برخاست، اچھے کھانوں اور اچھی طوائفوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں نفاست، تصنّع اور نسائیت کو لازماً فروغ ہونا تھا۔ مہندی لگانا، مسّی کی دھڑی جمانا، سروں پر بالوں کی پٹّیاں جمانا، شوخ رنگ ریشمیں کپڑے پہننا اور گفتگو سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک میں لوچ لچک کو ملحوظ رکھنا، شعار بن گیا۔ شرر کی بعض عبارتیں اِس موقع پر درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اور چوں کہ اب سپہ گری و جنگجوئی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی، عیش پرستی اور عورتوں کی صحبت بہت بڑھتی جاتی تھی، اِس لیے مردوں پر عورتوں کی وضع کا اثر پڑنے لگا، جو اعتدال سے باہر ہوگیا۔ اور جس قسم کی زینت و آرائش عورتوں کے لیے موزوں ہے، مردوں نے اپنی وضع اور اپنے لباس میں اختیار کرنا شروع کر دی۔ خصوصاً اُس زمانے سے جب کہ یہاں کے حکمرانوں نے اپنے لیے نوّاب کا لفظ چھوڑ کے بادشاہ کا لفظ اختیار کیا، نیشاپوری اور سالار جنگی خاندان کے لوگ جو معتدبہ وثیقے اور پنشنیں پاتے تھے، بالکل خانہ نشین کر دیے گئے تو اُن کو سوا عورتوں کے کسی کی صحبت ہی نہ نصیب ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اُن کی وضع و لباس ہی میں زنانہ پن نہیں پیدا ہوا، بلکہ اُن کی زبان بھی عورتوں کی سی ہوگئی۔ اور چوں کہ وہی شہر کے رئیس اور وضعدار تصوّر کیے جاتے، لہٰذا اکثر عوام نے بھی اُنھی کی پیروی شروع کر دی۔ اور بہ خلاف دیگر مقامات کے رئیسوں کے، یہاں لکھنؤ

میں یہ عام وضع ہوگئی کہ سر پہ مانگ، اُس پر مسالے کی کام دار ٹوپی، کانوں تک بال جن کی کنگھی کرنے میں ماتھے پر دونوں طرف پٹّیاں جمائی جاتیں۔ منہ میں پان، ہونٹھوں پر لاکھا، پنڈے میں تین تین کمر توئیوں کا چُست انگرکھا، اُس کے نیچے گلبدن کا ریشمی کھنچا ہوا گھٹنّا، ہاتھوں میں منہدی، پاتوؤں میں ٹاٹ بافی یعنی کام دار بوٹ، جاڑوں میں انگرکھے کی جگہ نیلے، زرد، یا سبز و سرخ اطلس یا گرنٹ کا روئی دار دگلا۔"

"مردوں پر عورتوں کی وضع کے غالب آنے کا اثر اگر کپڑوں کی نزاکت اور تیز اور بھڑکیلے رنگوں تک محدود رہتا تو بہت غنیمت ہوتا، یہاں تو بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ میاں بیوی کے دگلوں، دوپٹّوں، دُلائیوں، رضائیوں اور پائجاموں میں کسی قسم کا فرق ہی نہیں رہا بجز اس کے کہ گوٹا پٹھّا اور زیور عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔"

یقیناً غدر کے کچھ عرصے بعد یہ انداز کم ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ہاں عام معاشرت میں اس کے اثرات، تکلّف، تصنّع، رکھ رکھاؤ اور ایک خاص طرح کی لچکدار وضع و انداز میں نمایاں رہے جس میں ایرانی شایستگی اور نفاست مزاجی نے رنگ آمیزی کر کے، اُس عام طرزِ گفتگو، اندازِ نشست برخاست اور اسالیبِ معاشرت کا نہایت روشن اور لطیف حصہ بنا دیا، جس کو لکھنوی معاشرت سے ایک نسبتِ خاص ہوگئی اور یہ واقعہ ہے یہ انداز و اسلوب، لکھنؤ کی معاشرت کا عطیہ ہے، دلّی میں اس کا یہ روپ نظر نہیں آتا۔ مذہبیت کے ساتھ ساتھ اس خاص چیز کو بھی لکھنؤ کی مخصوص معاشرت کی دوسری نمایاں امتیازی خصوصیت قرار دیا جانا چاہیے۔

ایک بات اور؛ شرر نے بھی یہ بات کئی جگہ لکھی ہے اور دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی معاشرت میں طوائف کی بہت اہمیت تھی۔ اعلا درجے کی طوائفوں کے کوٹھے، اعلا تہذیبی مجالس کا درجہ رکھتے تھے، وہاں کے آدابِ گفتگو اور آدابِ نشست و برخاست، لکھنؤ کی معیاری تہذیب کی نمایندگی کرتے تھے۔ شرر کے الفاظ ہیں:

"لکھنؤ میں مشہور تھا کہ جب تک انسان کو رنڈیوں کی صحبت نہ نصیب ہو، آدمی نہیں بنتا۔"

نوجوانوں کا ایسے اعلا مقامات پر جانا کچھ بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے آداب کے سیکھنے میں مدد ملے گی۔ شرر ہی کے الفاظ ہیں:

"اور ہمارے زمانے تک لکھنؤ میں بعض ایسی رنڈیاں موجود تھیں، جن کے گھر میں علانیہ اور بے باکی سے چلا جانا اور ان کی صحبت میں رہنا معیوب نہ سمجھا جاتا۔ بہ ہر تقدیر، اس چیز نے ایک بڑی حد تک اُن کے عادات و خصائل بگاڑ دیے، گو کہ اس کے نتیجے میں انھیں نشست و برخاست کا سلیقہ بھی آگیا۔"

جس معاشرت کا ایک اعلا مظہر، طوائف ہو اور اس کے کوٹھے حصولِ آداب کے مرکز ہوں، اس کے متعلق اتنی بات آسانی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اُس معاشرت کی بنیادیں بہت گہری نہیں ہوں گی، خواہ وہ تہذیب بہت دل کش، رنگا رنگ اور چمک دار نظر آتی ہو۔ اور جس معاشرت کی بنیادیں گہری نہیں ہوں گی، اُس میں طاقت ور اجزا کی آمیزش نہیں ہوگی، وہ معاشرت اپنے آپ کو فنونِ لطیفہ کے اعلا مدارجِ کمال میں نمایاں نہیں کر سکے گی۔ اور دیرپا بھی

نہیں ہوگی۔

یہ کہا جا چکا ہے کہ مذہب کو لکھنوی معاشرت میں اور اس کی تشکیل میں خاصا دخل رہا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس کے ایک چھوٹے سے مظہر کا یہاں پر ذکر کر دیا جائے۔ اس سے بعض چیزوں کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

موسیقی کو لکھنؤ میں خوب فروغ ہوا، واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ کٹر مذہبی آدمی تھے، لیکن ان کے صاحبزادے واجد علی شاہ کو اور چیزوں کے علاوہ موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا، لیکن چوں کہ مزاج میں سطحیت، ابتذال اور لذت کوشی کو دخل تھا، اس لیے اُن کے دربار کی فضاؤں میں اعلا موسیقی کا گزر کم تھا۔ موسیقی کے ایک باکمال اسد اللہ خاں کوکب کا ایک بہت طویل خط گذشتہ لکھنؤ میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے:

"واجد علی شاہ کے عہد میں موسیقی کا خوب چرچا رہا، لیکن علمِ موسیقی اپنے بلند پایے سے گر کے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر آگیا تھا۔"

حالانکہ اُس وقت لکھنؤ میں موسیقی کے بہت سے باکمال موجود تھے۔

موسیقی کا عام فہم یا مقبولِ عام ایک انداز وہ بھی تھا جسے نوحہ خوانی اور سوز خوانی کہا جاتا ہے اور اس کی ترویج میں مذہبی تاثرات کو خاصا دخل تھا، اگرچہ مذہب نے موسیقی کو کبھی قبولیت کی سند عطا نہیں کی۔

تحت اللفظ مرثیہ خوانی بھی ایک چیز تھی، لیکن لکھنؤ کی اُس وقت کی معاشرت میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ اہم چیز موسیقی کے اثرات سے محفوظ رہے۔ مرثیے میں ادبیت اور مذہبیت ایک نقطے پر جمع ہو گئی تھیں۔ لیکن ادبیت کا حصہ غالب تھا، اگرچہ محرک خالص مذہبی تھا۔ اس ضرورت سے سلام اور نوحوں نے فروغ حاصل کیا۔ جو آسانی کے ساتھ ہلکی دھنوں اور سُروں کی بندشوں کو قبول

کر سکتے تھے۔ لکھنؤ میں یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ نوحہ خوانی مردوں ہی تک محدود رہے۔ جب کہ مرثیے کو زیادہ تر مردانہ مجالس کا جز سمجھا جاتا تھا۔ طوائفیں اور شریف خواتین، دونوں میں نوحہ خوانی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشہور ہے کہ چونے والی حیدر کی سوز خوانی سننے کے لیے دُور دُور سے لوگ آیا کرتے تھے۔ مذہب نے اگرچہ اس کے سر پر منظوری کا ہاتھ کبھی نہیں رکھا، لیکن مذہبی اثرات و جذبات نے مزاجوں میں جو جگہ بنالی تھی، اس کی وجہ سے سوز خوانی بے طرح مقبول ہوئی اور ایک طرح سے موسیقی کا بدل بن گئی۔ ہلکی پھلکی اور آسان موسیقی کے لیے واجد علی شاہی مزاج، فضا پیدا ہی کر چکا تھا۔

غرض کہ سوز خوانی نے، جو دراصل موسیقی کے دائرے کی ایک چیز ہے اگر فروغ حاصل کیا تو اس کی تہ میں عام حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی اثرات بھی شامل تھے۔ ہندوستان کے کسی علاقے میں نوحہ خوانی کو وہ امتیاز و اندازِ نصیب نہیں ہوا جو لکھنؤ میں ہوا۔ حالانکہ موسیقی سے شغف اور مقامات میں بھی ہے اب یہ بھی وہاں کی معاشرت کا ایک جز ہے۔ جن تہذیبی مظاہر میں مذہبی عناصر شامل تھے، کسی نہ کسی صورت میں بھی، ان کو اسی وجہ سے دیرپائی حاصل ہو گئی۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مذہبی عوامل، زندگیِ جاوید، یا یہ نہ سہی تو عمرِ خضر کے حریف ضرور ہوتے ہیں۔

ان اصولی بحثوں سے قطعِ نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ میں جس تہذیب کا ارتقا ہوا، اُس میں نفاست، دل کشی اور صناعت کمال کے درجے کو پہنچ گئی تھی۔ ہر چیز میں وہ لباس ہو یا کھانا پینا، آدابِ محفل ہوں یا مجالسِ عزا کے ضابطے، مرغ بازی ہو یا طوائفوں کے مجرے، سلام کرنے کا انداز ہو یا شکریہ ادا کرنے کا سلیقہ، خوش سلیقگی، تمیز داری اور تراش خراش

کا کمال نظر آتا تھا۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، داستان طرازی، مصاحبت، محفل آرائی سب میں اُس نزاکت کا رنگ جھلکتا تھا جس کو ایک مخصوص شایستگی کا معیار کہا جا سکتا ہے۔ لطافت اس درجے کی تھی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ یہاں کے آداب و اسالیب میں ایسی جادو گرانہ تاثیر تھی کہ پڑھ کر، اُس سے عقیدت سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ آج بھی اِن آداب کی کہیں جھلک دکھائی دے جاتی ہے تو بے ساختہ تقلید کرنے کو جی چاہتا ہے اور دل گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ شایستگی کا ایسا انداز ہے جس کو زندگی کا جز ہونا چاہیے۔ کچھ دیر کے لیے تو نکتہ چیں کی آنکھ جھپک ہی جاتی ہے۔

اس کے ماسوا عیش و عشرت کی وہ فضائیں، جن میں لذت اندوزی یا بوالہوسی کو نشو و نما ہوتا ہے، اُن کی بھی اعلا مثالیں نظر آتی ہیں۔ اِس داستانِ رامش و رنگ، قصۂ عشرت و عبرت اور افسانۂ رنگ و نکہت کو شرر نے جس والہانہ شیفتگی کے ساتھ تحریر کیا ہے، اس کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔ اپنے موضوع پر یہ واحد تصنیف ہے، جس میں تفصیلات کا اِس قدر خزانہ جمع کر دیا گیا ہے جو اس التزام کے ساتھ اور کہیں نہیں ملے گا۔

لیکن یہ لکھنؤ کی یک رخی تصویر ہے۔ شرر کی جذباتی وفاداری نے، اُن کی نگاہ کو ایسی بہت سی تفصیلات کے قلم بند کرنے سے باز رکھا ہے، جو اودھ کی اُس تہذیب کا جزوِ لاینفک تھیں اور جن کے بغیر اِس مرقع کے بعض گوشے روشن ہو ہی نہیں سکتے۔ اِس تہذیب کے کمال نے اُمرا کے ایک خاص طبقے کو پیدا کیا تھا جس کے گرد کئی اور چھوٹے چھوٹے طبقے حاشیہ آرا تھے۔ ان کی داستان ضروری بھی ہے، دل چسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ اس کے لیے سرشار کے فسانۂ آزاد کی ضرورت تھی۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مصنف ہیں جو دو

بالکل مختلف مرقع سجائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جب تک دونوں کو سامنے نہ رکھا جائے، اُس وقت تک اس داستان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ دونوں مصنّفوں نے پہلے پہل ان کو کتابی صورت میں نہیں لکھا تھا۔ فسانۂ آزاد بالاقساط اودھ اخبار میں چھپا ہے اور گذشتہ لکھنؤ کو شرر نے اپنے رسالے دلگداز میں بالاقساط شائع کیا تھا۔ دونوں میں ایک صفت اور بھی مشترک تھی: مولوی عبدالرزاق کان پوری نے شرر کے متعلق لکھا ہے کہ:

"اکثر دلگداز کے لیے مہینا بھر میں ایک ورق بھی نہیں لکھتے تھے، لیکن جب کاتب کا سخت تقاضا ہوتا تھا تو ۲۴ گھنٹے کے اندر پورے رسالے کا مضمون لکھ دیتے تھے۔" (یاد ایام ص ۳۴۰)

یہی حال سرشار کا تھا۔ ان دونوں باتوں کے اثرات دونوں تصنیفوں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ گذشتہ لکھنؤ میں یہ فرق زیادہ نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا خاکا صرف ذہن میں آگیا تھا اور پھر جس بات کا دھیان پہلے آگیا، اس کو لکھ دیا گیا، اچانک ایک باب شروع ہو جاتا ہے اور اچانک ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بہت سی باتیں چھوٹ جاتی ہیں، اس کا اندازہ بھی واضح طور پر ہوتا ہے۔

مولوی عبدالرزاق (البرامکہ والے) نے اپنی کتاب یادِ ایام میں شرر کے مختصر سے حالات لکھے ہیں۔ دونوں میں خاصا ربط ضبط تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے:

"امیر مینائی نے طبیعت کا رنگ دیکھ کر شرر تخلص رکھا۔ چنانچہ کسی شاعر کا یہ شعر اُن کے حسبِ حال ہے:

"تخلّص کی وہ چنگاری تھی جس نے اِک جہاں پھونکا
اِدھر چمکی، اُدھر سُلگی، یہاں پھونکا، وہاں پھونکا"

واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر پوری طرح اُن کے حسبِ حال ہے۔ اُن کے مزاج میں بلا کی تیزی تھی اور جذباتیت نے اس کے رنگ کو شوخ کر دیا تھا۔ معرکۂ چکبست و شرر کو پڑھ کر، اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ لکھنؤ میں بھی اس کے مظاہرے بہت ہیں۔ سب سے نمایاں چیز اُن کا وہ اندازِ نگارش ہے جس میں طرف داری نے سخن فہمی کی حدوں کو توڑ کر، مبالغہ آمیز اعلانات کرائے ہیں۔ مثلاً اُن کو کہنا یہ ہے کہ لکھنؤ میں موسیقی کو بہت ترقی ہوئی، اِس کے لیے وہ سب کچھ لکھنے کے بعد، اِس انداز کے جملے بھی ضرور لکھیں گے:

"جیسی جیسی نامی لے دار اور گلے باز ڈومنیاں لکھنؤ میں گزرگئیں ویسے گوّیے بھی کہیں نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا!

مبالغے کی ایک اور تان دیکھیے کہاں ٹوٹتی ہے۔ مخاطب کو کن الفاظ سے خطاب کیا جا سکتا ہے، اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ہمارا دعوا ہے کہ اتنے تعظیمی الفاظِ خطاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہیں"۔ بجا و درست۔ لیکن مولانا کا مزاج اِسی پر اکتفا نہیں کرتا، آگے بڑھ کر، الفاظِ خطاب کی تعداد سے ادبی وسعت و فصاحت پر دلیل لاتے ہیں اور لکھتے ہیں: "مگر ہم مذکورہ ہندوستانی زبانوں اور ان کے ساتھ ساری دنیا کی مشہور زبانوں: فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی کو بھی چیلنج دیتے ہیں کہ اگر ان کو اردو سے زیادہ ادبی وسعت و فصاحت کا دعوا ہے تو مخاطب کے لیے اپنی لغتوں میں اتنے الفاظ نکال دیں جتنے کہ اردو میں موجود ہیں۔"

ذکر ہے الفاظِ خطاب کی زیادتی کا، اور اُس سے استدلال ہے اس پر کہ جب

الفاظِ خطاب اردو میں زیادہ ہیں تو پھر "ادبی وسعت و فصاحت" میں بھی وہ سب سے آگے ہوگی۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ طرفداری، سخن فہمی کی دشمن ہے اور اس کے سامنے ساری منطق بے کار ہو جاتی ہے۔ اور یہ شرر کا عام انداز ہے۔

لہجے کی تلخی بھی شرر کی تحریر کا ایک جز ہے۔ کبھی یہ دب جاتا ہے، بلکہ چھپ جاتا ہے اور کبھی یہ بے طرح ابھر آتا ہے۔ اس کتاب میں اس کی بہت سی مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ تلخی بھی، اُسی جذبۂ طرفداری کا عطیہ ہے۔ ایسے میں ان کی تحریر سے انشائیہ نگر کا حُسن چھن جاتا ہے اور انشاپردازی کا رنگ اُڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں اس کی صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مولانا آزاد نے آبِ حیات میں ملائی بالائی کے ذیل میں یہ لکھ کر کہ ملائی دہلی میں رائج ہے اور بالائی لکھنؤ کا ایجاد ہے، اس کے بعد صرف ایک جملہ اور لکھا ہے، جس میں وہ سب کچھ کہہ گئے ہیں اور انشاپردازی کا حُسن برقرار رہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "مذاقِ سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے" یہ تعریض کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ بھلا مولانا شرر اسے کیسے پی جاتے۔ دو پونے دو صفحے میں اس ایک جملے کا جواب دیا ہے اور اپنے مخصوص انداز کے ساتھ۔ نہایت بے کیف عبارت ہے۔ پتھر ٹوٹتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

طب کا بیان کرتے ہوئے، لکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اس کا فروغ، دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ میں زیادہ ہوا۔ اس کو وہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں: "دہلی میں صرف ایک حکیم محمود خاں کا خاندان ہے، اور لکھنؤ میں ایسے بیسیوں خاندان پڑے ہیں۔" شرر کی تحریر کا یہ عام انداز ہے کہ جوشِ طرفداری میں حُسنِ بیان کا رنگ اُڑنے لگتا ہے، نری مبالغہ آرائی رہ جاتی ہے، بے کیف، بے مزہ ——— اس کی ایک اور مثال دیکھیے۔ گلزارِ نسیم کا جھگڑا چھیڑنے کی بظاہر یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن مولانا نے یہاں بھی اُسے نہیں بخشا اور اسی التزام کے ساتھ کہ لہجے کی تلخی، لطافتِ بیان

کے گلے پر چھُری پھیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: "اوّل تو گلزارِ نسیم کو نظیر اکبر آبادی کے بنجارہ نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی، تو اُسے مثنوی میر حسن کے مقابلے میں رکھنا، اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔"

اسی ذیل میں مولانا سارے حقائق سے آنکھیں بند کر کے، بے تکلف تحریر فرماتے ہیں کہ: "اور اگر گلزارِ نسیم کی زبان، زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گلزارِ نسیم کا مقابلہ، دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں، بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اِس لیے کہ مثنوی میر حسن، لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا" ــــ گویا اُس وقت تک وہ زبان مکمل ہو چکی تھی جس کو لکھنؤ کی زبان کہا جاتا ہے! آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا اِسی کو کہتے ہیں۔

جعفر زٹلی کے متعلق لکھتے ہیں: "ان کے کلام کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گزری ہوئی بے حیائی کے، نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے، اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔" آج کوئی بھی شخص جس نے جعفر کا کلام ذرا بھی نظر جما کر پڑھا ہو، مولانا کی رائے کو بدذوقی کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بدذوقی سے زیادہ حاوی پہلو عصبیت کا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا علاقائی جذبات میں ضرورت سے زیادہ سرشار تھے۔

یہ بھی اسی جذباتی انتہاپسندی کا نتیجہ ہے کہ مولانا نے مروجہ سنہ ہجری کی جگہ سنہ محمدی ہر جگہ لکھا ہے۔ ناواقف آدمی اگر سنہ عیسوی سے تطبیق کرنے کے لیے اسے ہجری سنہ فرض کر لے تو دھوکا کھائے گا۔ حالانکہ یہ بے کار سی بات ہے۔ جو سنہ رائج ہے اُسے کیوں نظر انداز کیا جائے اور اس کی جگہ خواہ مخواہ ایک نئی بات پیدا کی جائے۔

یہ بھی اسی جذبے کا اثر ہے کہ مولانا نے جگہ جگہ فنون کو اسلامی بنا لیا ہے، جیسے اسلامی طب۔ پھر ان کے جذبۂ شدّت پسندی نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ آرایش و

زیبائش کو بھی شرعی بنا لیا ہے۔ اُس زمانے میں گھروں کو طُغروں اور خوش خط لکھے ہوئے قطعوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مولانا کی نظر میں یہ اندازِ آرائش شرعی تھا۔ فرماتے ہیں: "مگر افسوس اب ہندوستان سے قطعات اور کتبوں کا رواج اٹھتا جاتا ہے اور ان کی جگہ تصویروں نے لے لی ہے جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذب شرعی مذاقِ آرائش کے مٹ جانے کے ساتھ، خوش نویسی بھی ہندوستان سے اٹھ گئی۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ناول لکھتے لکھتے اور صلیبی لڑائیوں کا ان میں ذکر کرتے کرتے، مولانا کے یہاں مذہبی تقشّف یا جذباتیت کا پہلو ذہن و قلب میں تہ نشین ہو گیا تھا اور یہ اسلامی فنون، شرعی مذاقِ آرائش، اسلامی طب، سنہ محمدی وغیرہ اسی کے مظاہر ہیں۔ اس سے ان کی افتادِ طبع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد شرر نے رکھی ہے۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق پہلا ناول ملک العزیز ورجنا تھا۔ یہ ناول آج بھی دل چسپی کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں۔ منظر نگاری ان کا خاص حصہ ہے۔ اس سلسلے کا شاہ کار ناول فردوس بریں ہے، جس میں ناول کی کئی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں، خصوصاً کردار نگاری اعلا درجے کی ہے۔ یہ ناول آج بھی اسی قدر دل چسپ ہے۔ ان ناولوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرر کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس چیز کو تاریخی ناول کہا جاتا ہے، شرر کے بعد کسی نے اس پر اضافہ نہیں کیا، اگرچہ لکھے بہت گئے۔ ان ناولوں کی جو خوبی وجہِ امتیاز ہے، اُس کی تہ میں وہی اسلامیت کا جذباتی انداز نمایاں ہے، جو شرر کے مزاج کا اہم جز تھا۔

شرر کا دوسرا قابلِ قدر اور قابلِ ذکر کارنامہ انشائیہ نگاری ہے۔ وہ اردو کے اولین انشائیہ نگاروں میں سے ہیں۔ موضوعات کا تنوّع، عبارت کی شستگی، مختصر جملے اور تصنّع سے معرّا اسلوب ان کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں فارسی

عربی کے کچھ بوجھل لفظ بھی آجاتے ہیں۔ لیکن ایسا کم ہے۔ خیالات میں شگفتگی ہے، ناول نگاری نے، جزئیات کی تصویر کشی کا رنگ چمکا دیا تھا، ان عناصر کی بنا پر اُن کے انشائیے، خاصے دل چسپ ہیں۔ البتہ خیالات میں جتنی شگفتگی ہوتی ہے عبارت میں اتنی شگفتگی نہیں ہوتی اور اس سے کچھ نقصان پہنچتا ہے۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری نے، جو شرر کے دوست بھی تھے، اپنی کتاب یادِ ایام میں ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر کے والد کا نام شیخ تفضّل حسین تھا، یہ صوفی مشرب اور طبابت پیشہ تھے۔ لکھنؤ کے مشہور محلّے جھوائیں ٹولہ میں سکونت تھی۔ مولوی تفضّل حسین شاہی دفتر انشا میں ملازم تھے۔ جب واجد علی شاہ کلکتے بھیج دیے گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ گئے۔ شرر کا لڑکپن مٹیا برج میں گزرا، جہاں اُنھوں نے اس تہذیب کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا۔ شرر کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ مولانا نظم طباطبائی سے ادبِ عربی کی وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۵ سال کی عمر میں منشی السلطان کی ماتحتی میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے واپس آکر فرنگی محل کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ مولوی نذیر حسین محدّث سے دہلی جا کر حدیث کا درس لیا۔ ابتدا میں اودھ اخبار میں ملازم ہوئے۔ شاعری کا بھی کچھ شوق تھا، امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ شرر تخلص انھی کا رکھا ہوا ہے۔ صحافت کا شوق شروع ہی سے تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اپنا مشہور رسالہ دل گداز جاری کیا، اور ۱۸۸۸ء سے اسی کے ساتھ تاریخی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا، جن میں سب سے پہلا ناول ملک العزیز ورجنا تھا۔

تاریخی ناولوں اور ان کے تاریخی و معاشرتی مضامین اور انشائیوں نے پورے ملک میں ان کو مشہور کر دیا۔ نواب وقار الامرا کے صاحبزادوں کے اتالیق کی حیثیت سے لندن میں بھی قیام رہا اور میرا خیال ہے کہ اس سے شرر کو بہت فائدہ پہنچا۔

حیدر آباد میں بھی ان کا قیام رہا ہے۔ ان کی کتاب تاریخ سندھ پر حیدر آباد سے پانچ ہزار روپے کا انعام ملا تھا، اس سے ان کے ذوقِ تاریخ کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی گلزارِ نسیم کا ایک اچھا اڈیشن چکبست نے ۱۹۰۵ء میں شائع کیا تھا۔ شرر نے دلگداز میں اس پر تبصرہ لکھا اور اپنی عادت کے بموجب ذرا سخت زبان میں یہ لکھا کہ یہ مثنوی طومارِ اغلاط ہے۔ اس پر معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ ادھر پنج، چکبست کا طرف دار تھا، اس معرکے میں ادبی بحث سے زیادہ، طنز و تعریض اور فقرے بازی کا عمل دخل رہا۔ شرر نے جو مضامین لکھے، ان کا لہجہ غیر مناسب اور غیر متوازن تھا، وہ مناظرہ کرنے والے مولوی بن کر رہ گئے تھے۔ اس کے مقابلے میں چکبست کا اندازِ نگارش علمی و ادبی تھا۔

اسی طرح کے کئی اور معرکے ان کی زندگی کی یادگار ہیں۔ ان میں سے ایک پردے کا مسئلہ بھی تھا۔ شرر کی ایک اور اوّلیت کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ وہ ان چند اولین لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو میں نظمِ معرّا کے تجربات کیے تھے۔

۷ا جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ (یادِ ایام = یادِ رفتگان)

شرر کثیر التصانیف تھے لیکن ان کی کتابوں میں جو مرتبہ فردوسِ بریں اور گذشتہ لکھنؤ کو حاصل ہوا، وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہ ہوسکا۔ اگرچہ شہرت کے لحاظ سے ان کے بعض تاریخی ناول ان دونوں کتابوں سے کہیں آگے ہیں۔

سید مبارک علی شاہ گیلانی نے شرر کے سارے تاریخی و جغرافیائی، علمی و ادبی اور محققانہ و فلسفیانہ مضامین کو کئی جلدوں میں لاہور سے شائع کیا۔ ان سب پر مولانا نے نظرِ ثانی کی تھی۔ "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ" بھی اسی سلسلے کا ایک مجلّد ہے۔ نسخۂ جامعہ کی بنیاد اسی اڈیشن کو قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ایک دو مقامات پر ایسی غلطیاں بھی ہیں، جن سے مفہوم خبط ہو جاتا ہے، ایسے مقامات پر قوسین میں کذا لکھ دیا گیا ہے، اور فہرستِ مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

زندگی بدل گئی، نہ وہ دہلی رہی نہ وہ لکھنؤ۔ سب کچھ بدل گیا ہے لیکن ان دونوں علاقوں

کی گذشتہ تاریخ و تہذیب کی یاد آج بھی دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔ لکھنؤ کی بساط آخر میں بچھی بھی اور جس قدر جلد اس کی نمود ہوئی تھی، اسی قدر جلد اس کا عروج ختم بھی ہو گیا، لیکن اس دولتِ مستعجل میں کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جنھوں نے خاصے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ لکھنؤ کی معاشرت میں تراش خراش، نفاست، شائستگی اور ادب آداب کی ایسی چمک دمک تھی، جو آنکھوں میں عکس چھوڑ گئی ہے۔ گذشتہ لکھنؤ، اسی محفلِ طرب کی داستان ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شرر نے اسے بے حد جذباتی لگاؤ کے ساتھ ڈوب کر بیان کیا ہے، آپ ان کی جانب داری، مبالغہ آرائی، جذباتیت پر جو اعتراض چاہے کر لیجیے، لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ رہے گا کہ انھی صفات نے اِس کتاب کو قبولِ عام کا خلعت پہنایا ہے۔ دہلی کی تہذیب بہت بڑی تہذیب تھی، لیکن اس کو شرر جیسا کوئی فدائی نہیں مل سکا، نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اس کے بہت سے پہلوؤں سے ناواقفِ محض ہیں اور یہ بڑا خسارہ ہے۔

اس کتاب میں تاریخ، ناول، افسانے، انشائیے اور کہانی کے عناصر اس طرح آمیز ہو گئے ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اِس میں جو مرقع سجائے گئے ہیں، اُن میں سے کئی مرقع سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور کئی منظر متحرک سے نظر آتے ہیں۔ کسی کتاب کی اس سے بڑی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے۔ نظیری کا یہ شعر شاید ایسے ہی کسی موقع کے لیے کہا گیا ہوگا:

داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید عندلیب آشفتہ تر گفتست این افسانہ را

آج نہ وہ لکھنؤ ہے نہ وہ روشن و رقصاں تہذیبی مرقع، نہ مٹیا برج ہے نہ قیصر باغ کے جلسے، لیکن اس کتاب کو پڑھتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرچھائیاں گردش کرتے کرتے، رنگوں کے مرقعوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ صفت ایسی بہت کم کتابوں میں پائی جاتی ہے، یہی اِس کتاب کی قدر و قیمت ہے۔

رشید حسن خان

فہرست مضامین

(۱)

اِس کے تسلیم کرنے میں شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مشرقی تہذیب و تمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا، وہ گذشتہ دربارِ اودھ تھا۔ اگلے دور کی یادگار اور بھی کئی دربار موجود ہیں، مگر جس دربار پر پُرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہو گیا، وہ یہی دربار تھا، جو بہت ہی آخر میں قائم ہوا اور عجیب و غریب ترقیاں دکھا کے، بہت ہی جلد فنا ہو گیا۔ لہٰذا مندرجۂ بالا عنوان کے تحت میں، ہم اُس مرحوم دربار کے مختصر حالات اور اُس کی خصوصیتوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے تسلیم کرنے میں بھی شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جس خطّۂ زمیں پر یہ پچھلا دربار قائم ہوا، اس کی وقعت اور اہمیت، ہندوستان کے تمام صوبوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

پُرانے چندربنسی خاندان خصوصاً راجا رام چندر جی کے اعلا کارنامے اور عدیم النظیر ناموریاں اِس درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں کہ تاریخ کے ظرف کو تنگ اور محدود دیکھ کے، انھوں نے مذہبی تقدّس کا جامہ پہن لیا ہے۔ اور آج ہندوستان کا شاید نادر ہی کوئی ایسا بدنصیب گانو ہوگا، جہاں اُن کی یاد ہر سال رام لیلا کے مذہبی ناٹک کے ذریعے سے تازہ نہ کر لی جاتی ہو۔ لیکن اودھ کے اُس قدیم ترین دیوتائی دربار کے حالات اور اجدّھیا کا اُس عہد کا جاہ و جلال، والمیکی نے ایسی معجز نما فصاحت کے ساتھ دکھایا کہ وہ ہر عقیدت کیش کی لوحِ دل پر لکھ گیا۔ لہٰذا ہمیں اس کے اعادے کی ضرورت

نہیں جن لوگوں نے اجُدّھیا کے پُرشکوہ زمانے کی تصویر والمیکی کے لٹریری مرقّع میں دیکھی ہے، وہ اُسی مبارک خطّے پر آج دلگداز میں، فیض آباد کی تصویر دیکھیں۔ لہٰذا ہم سلسلۂ واقعات کو اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب اِس آخری دربار کی بنیاد پڑی، جسے فنا ہوئے، کچھ اوپر پچاس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔

جب نوّاب بُرہان الملک امین الدین خاں نیشاپوری شہنشاہیِ دربارِ دہلی کی طرف سے صوبہ دارِ اودھ مقرّر ہو کے آئے، تو شیخ زادگانِ لکھنؤ کو مغلوب کر کے، قدیم مستقرّ اودھ یعنی محترم و مقدّس شہر اجُدّھیا میں پہنچے، اور آبادی سے فاصلے پر یعنی دریائے گھاگرا کے کنارے، ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چونکہ انتظامِ صوبہ کی محویّت میں انھیں عالی شان عمارت بنانے کی فرصت نہ تھی، اور نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے، ایسے نمایشی کرّ و فر کا انھیں شوق تھا، اِس لیے ایک زمانے تک خیموں میں بسر کی، اور جب چند روز کے بعد اُنھیں برسات میں تکلیف ہوئی، تو تھوڑی دُور ہٹ کے، ایک مناسب مقام پر اپنے لیے ایک چھپّر بنوایا۔ پھر اُس کے بعد اِس چھپّر کے گرد کچّی دیوار کا ایک بہت وسیع مُربّع حصار کھنچوا لیا، جس کے چاروں کونوں پر، قلعہ بندی کی شان سے، چار کچّے بُرج بنوا دیے، تاکہ گرد و پیش کی نگرانی کی جا سکے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر متعدّد رسالے، پلٹنیں، توپ خانے، اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے۔

بُرہان الملک کو چوں کہ عمارت کا شوق نہ تھا، اس لیے ان کے زنانے اور بیگمات کے قیام کے لیے بھی کچّے ہی مکانات بنا لیے گئے۔ غرض اس کچّے بنگلے میں، اُس وقت کا والیِ اودھ، جب لمبے اضلاع کے دَورے اور سفرہائے حکمرانی سے فراغت ہوتی، آرام

فیض آباد کے یہ تمام حالات منشی محمد فیض بخش کی "تاریخ فرح بخش" سے لیے گئے ہیں۔ اصل کتاب ہم نے نہیں دیکھی مگر اس کا انگریزی ترجمہ مترجمۂ ولیم ہوئی جو ۱۸۸۹ء میں گورنمنٹ پریس الٰہ آباد میں چھپا ہے، ہمارے پاس موجود ہے۔

وآسایش کے ساتھ رہتا تھا اور کسی بات کی شکایت نہ تھی۔ اور اس کا یہ دارُالامارت چند روز میں "بنگلہ" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

برُہانُ الملک کے انتقال کے بعد، جب نوّاب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا، تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی۔ یہ ہے بنیاد شہر فیض آباد کی، جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب اُن دنوں اُس کچی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سردارانِ فوج نے اپنی دل چسپی کے لیے باغ اور پُر فضا و فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں، اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی۔ اُس کچے احاطے کا ایک پھاٹک، دلّی دروازہ کہلاتا تھا، جو مغرب کی طرف تھا۔ اُس کے باہر دیوان آتمارام کے بیٹوں نے ایک شان دار بازار بنوایا اور رہنے کے سلسلے میں رہنے کے لیے مکانات بھی تعمیر کرائے، اِسی طرح اسماعیل خاں رسال دار نے بھی ایک بازار بنوایا۔ اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکانات بھی تیّار ہو گئے۔

نوّاب صفدر جنگ کی وفات کے بعد، اس نئی بستی پر چند روز کے لیے تباہی برس گئی، جس کی وجہ سے، اتنے دنوں میں جو کچھ بنا تھا، زمانے نے بگاڑ کے رکھ دیا۔ اِس لیے کہ اُن کے فرزند نوّاب شجاع الدّولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہیں رہتے تھے۔ گو سال میں دو ایک راتیں اپنے باپ دادا کے اس قدیم مسکن میں ضرور بسر کر لیا کرتے۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۴ء میں انھیں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست ہوئی۔ اُس وقت وہ کمال بے سر و سامانی سے بھاگتے ہوئے فیض آباد میں آئے، اور وہاں کے قلعے میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا، لے کے، راتوں رات چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور بریلی کی راہ لی، تاکہ افاغنہ روہیلکھنڈ کے پاس جا کے پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزوں سے اُن سے صلح ہو گئی جس کی رُو سے شجاع الدّولہ کے ذمّے واجب تھا کہ

محاصلِ ملک میں سے پنج آنی انگریزوں کو ادا کیا کریں۔

صلح ہونے سے پہلے اس سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گزر شہر فرخ آباد میں بھی ہوا تھا، جہاں احمد خاں بنگش سے ملاقات ہوئی، جو اُس زمانے کے پُرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کیے جاتے تھے۔ انھوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ آپ کی جو تم جا کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینا، تو میری اِن دو باتوں کو نہ بھولنا: ایک تو یہ کہ مغلوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا، بلکہ اپنے دیگر ملازموں اور خواجہ سراؤں سے کام لو۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑ دو، اور فیض آباد ہی کو اپنا دار الحکومت بناؤ۔

یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئیں، اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے بعد، ۱۷۶۵ء میں جو انھوں نے اپنی قلمرو کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے اور اسی کو اپنا دار الحکومت قرار دے دیا۔ اب یہاں انھوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی، نئے رسالے مرتب کرنے لگے، اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پُرانے حصار کو ایک مضبوط شہر پناہ کی شان سے از سرِ نو تعمیر کرایا، جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔ مغلوں کے جو مکانات اندر واقع تھے، ڈھا دیے۔ اور اپنے اکثر خانگی ملازموں کو حکم دیا کہ شہر پناہ کے باہر مکان بنوائیں۔ اُس حصار کے گرداگرد ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا، جس کے گرد گہری خندق کھود کے، قلعہ بندی کی وضع سے درست کی گئی۔ اور ملازمینِ سرکار اور افسرانِ فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت اور حالت کے مناسب قطعاتِ زمین لے کے، اسی میدان میں مکان بنائیں۔ جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے، ایک دنیا کا رُخ ادھر پھر گیا۔ ہزارہا خلقت آ آ کے آباد ہونا شروع ہوئی۔ شاہ جہاں آباد میں یہ حالت تھی کہ جسے دیکھیے، فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے۔ چناں چہ دہلی کے اکثر باکمالوں نے وطن کو خیرباد کہی اور پورب کا رُخ کیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا

رہتا تھا اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے۔ جو آ کے یہاں بستے، اور فیض آباد کے سواد میں کھنچتے جاتے تھے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش، اہلِ قلم، اہلِ سیف، تاجر، صنّاع، اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہاں جمع ہو گئے۔ اور جو آتا، آتے ہی اس فکر میں پڑ جاتا کہ کوئی قطعۂ زمین حاصل کر کے مکان بنا لے۔

چند ہی سال کے اندر، اُس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلیں تعمیر ہو گئیں۔ ایک جو پہلے مربّع کے جنوبی پہلو سے ملی ہوئی تھی۔ اُس کے رقبے کا طول و عرض دو دو میل کا تھا۔ اور دوسرا حصار، ایک میل کے پھیلاؤ میں تھا جو قلعے اور بیرونی فصیل کے درمیان تھا۔ اُسی زمانے میں ترپولیا اور چوک بازار تعمیر ہوئے جن کی سڑک، قلعے کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کے سڑک الٰہ آباد کے مخرج تک چلی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر دس چھکڑے آسانی سے گزر سکتے تھے۔ فصیلِ شہر کا آثار، زمین کے پاس چاہیے جتنا ہو، درمیان میں دس گز سے کم نہ تھا جو اوپر پہنچ کے پانچ گز رہ گیا تھا۔ اِس فصیل پر قاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوجوں کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے اور جا بہ جا پہرہ دیتے۔ باقاعدہ سپاہیوں کی وردی لال تھی اور بے قاعدہ سپاہیوں کی وردی سیاہ۔ انھی سپاہیوں کی ضرورت سے برسات میں جا بہ جا چھپّر ڈال دیے جاتے۔ مگر برسات کے ختم ہوتے ہی، آگ لگنے کے اندیشے سے، وہ لازمی طور پر اتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فصیل کی دیواروں کے لیے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپّر چھائے، اور چار مہینے بعد نوچ کے پھینک دیے جاتے۔

حوالیِ شہر میں دو مرغزار، شکارگاہ قرار دیے گئے تھے جن میں سے ایک مغرب کی جانب، گرجی بیگ خاں کی مسجد سے گپتار گھاٹ تک چلا گیا تھا، جو ایک معتد بہ مسافت ہے۔ اس کے دونوں طرف کچّی دیواریں تھیں اور تیسری طرف گھاگرا واقع ہوئی تھی۔ اس میں ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، نیل گائیں وغیرہ

شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے، جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکتے ہی چوکڑیاں بھرنے لگتے۔ دوسری شکار گاہ، شہر سے مشرق کی طرف موضعِ جنورا اور چھاونی گوشائیں سے دریا کے کنارے تک تھی، جس کا پھیلاو چھے میل کا تھا۔ اس کے رقبے میں گیارہ موضع اور ان کی آراضی آگئی تھی۔ مگر یہ شکار گاہ ناتمام ہی رہی اور اس کی نوبت نہ آنے پائی کہ اس میں وحشی جانور چھوڑے جائیں۔

خاص شہر کے حلقے کے اندر تین ایسے نزہت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ اُمرا اور شاہزادے آ کے، ان میں سیر کریں اور ان کی بہار اور شادابی سے لطف اٹھائیں: ایک انگوری باغ، جو قلعے کے اندر واقع تھا اور اُس کے رقبے کے چوتھائی حصے پر حاوی تھا۔ دوسرا موتی باغ، جو عین چوک کے اندر واقع تھا۔ تیسرا لال باغ، جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی، اور دُور دُور کے لوگوں کو تمنا تھی کہ کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفا کے غول روز سہ پہر کو اس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی جاں فزائی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہِ دہلی شاہ عالم بادشاہ جب الٰہ آباد سے پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے اور کچھ زمانے تک اسی کے اندر ان کا قیام رہا۔ ان تین باغوں کے علاوہ، آصف باغ اور بلند باغ بھی نواحِ شہر میں، لکھنؤ کے راستے پر واقع تھے۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام سوار ہو کے، سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے۔ مزدور، پھاوڑے اور کدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے، جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دکان دار

کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے، فوراً اُسے کھُدوا کے برابر اور سیدھا کرا دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدّولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسالے کے اعلیٰ سردار نوّاب مرتضیٰ خاں بریچ اور ہمّت بہادر اور امراؤ گیر نام دو گوشائیں تھے۔ اِن کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان تین کے علاوہ، اور جتنے چھوٹے چھوٹے جمعدار تھے، سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے، اِن میں سے ہر ایک کی جمعیّت زیادہ تھی۔ دیگر سرداران فوج احسان کمبوہی، گرجی بیگ خاں، گوپال راؤ مرہٹا، میر جملہ کے داماد نوّاب جمال الدین خاں، مظفّر الدّولہ تہوّر جنگ بخشی ابوالبرکات خاں ساکن کاکوری، اور محمّد معزّ الدّین خاں لکھنؤ کے ایک شیخ زادے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جس کے ماتحت ہزار پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے، خواجہ سرا اور وہ نوعمر خواجہ سرا جو ان کے زیرِ نگرانی تربیت پاتے، چیلے، اور شاگرد پیشہ تھے۔ بسنت علی خاں خواجہ سرا کے ماتحت دو ڈویژن فوج یعنی چودہ ہزار باقاعدہ سپاہ تھی جس کی وردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بسنت خواجہ سرا تھا جس کے زیرِ کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزہ باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ عنبر علی خاں خواجہ سرا کی افسری میں پانسو سوار اور ایک پلٹن تھی، جن کی وردیاں سیاہ تھیں۔ محبوب علی خاں خواجہ سرا کے زیرِ عَلَم پانسو سوار تھے اور چار پلٹنیں تھیں۔ اتنی ہی فوج لطافت علی خاں کے ماتحت تھی۔ رگھوناتھ سنگھ اور پرشاد سنگھ میں سے ہر ایک کے زیرِ کمان تین تین سو سوار اور چار چار پلٹنیں تھیں۔ اسی طرح مقبول علی خاں اوّل و دوم یوسف علی خاں کے ہمراہ پان پان سو مغل سواروں اور پیدلوں کی جمعیّت تھی۔ اور توپ خانہ بے حدّ و بے حساب تھا۔

لہٰذا کُل فوج جو شجاع الدّولہ کے قبضے میں تھی، اور فیض آباد میں موجود رہا کرتی تھی، اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی: سُرخ وردی والے تیئیس ہزار باقاعدہ، اور سیاہ وردی والے

چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان کے افسرِ اعلیٰ یعنی سپہ سالارِ اعظم، سیّد احمد تھے، جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے۔ جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندوقوں کے مقابلے میں، انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔

اِس جمعیّت کے علاوہ شجاع الدّولہ کے پاس بائیس ہزار ہرکارے اور مخبر تھے، جو ہر ساتویں روز پونہ سے، اور ہر پندرھویں دن کابل سے خبریں لاتے۔ دربار میں ہمیشہ بلادِ دور دراز کے حکم رانوں کے نائب موجود رہا کرتے۔ ایک نائب مرہٹوں کا تھا، ایک نظام علی خاں فرماں روائے دکن کا، ایک ضابطہ خاں کا، اور ایک نوّاب ذوالفقار الدّولہ نجف خاں کا، جن کے ساتھ اُن کے دفتر اور سپاہی بھی تھے۔ اِن لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی افسر اپنی جمعیتوں کے ساتھ یہاں موجود رہتے۔ جیسے میر نعیم خاں جن کے جھنڈے کے نیچے ثابت خانی، بُندیل کھنڈی، چندیلا، اور میواتی سپاہیوں کا ہجوم تھا۔

محمّد بشیر خاں قلعہ دار تھے۔ شہر کی فصیلوں اور پھاٹکوں پر اُنھی کے سوار اور پیادے پھیلے رہتے، اور قلعے کے اندر ہی ان کے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور اُن کے سپاہیوں کی بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ جب بیرونی دیواروں میں بھی جگہ باقی نہ رہی تو سیّد جمال الدّین خاں اور گوپال راؤ مرہٹا نے باہر نکل کے، موضع نوراہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کیمپ وہاں بنائے۔ اور اسی جگہ کی تنگی کی وجہ سے نوّاب مرتضیٰ خاں بریچ، میر احمد بانسی والا، میر ابوالبرکات اور شیخ احسان احمد ھیا اور فیض آباد کے درمیان، خیموں میں رہتے تھے۔

آدمیوں کی کثرت اور سپاہیوں کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک میں، اس قدر بھیڑ لگی رہتی کہ گزرنا دشوار تھا اور غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص بغیر ٹکے ہوئے سیدھا

چلا جائے۔ فیض آباد نہ تھا، انسانوں کا جنگل تھا۔ بازار میں دیکھیے تو ملکوں ملکوں کا مال ڈھیر تھا اور یہ خبر سن کے کہ فیض آباد میں نفیس مزاج رئیسوں اور شوقین امیروں کا منتخب مجمع ہے، ہر طرف سے تاجروں کے قافلے لدے پھندے چلے آتے تھے۔ اور چوں کہ چاہے کیسا ہی قیمتی مال ہو، ہاتھوں ہاتھ بک جاتا، اچھی سے اچھی چیزوں کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا جب دیکھیے ایرانی، کابلی، چینی، فرنگی سوداگر نہایت گراں قیمت اور بھاری مال لیے ہوئے موجود رہتے اور جو نفع اٹھاتے، ہوس بڑھتی اور زیادہ جستجو و جاں فشانی سے نیا مال لے آتے۔ مسیو ژان تیل، مسیو سون سون، اور مسیو پیار روز وغیرہ کے ایسے دو سو فرانسیسی جو یہاں اقامت گزین ہو گئے تھے، سرکار میں ملازم تھے اور شجاع الدولہ کی سلطنت سے روابطِ اتحاد رکھتے تھے، جو سپاہیوں کو فوجی تعلیم دیتے اور توپیں، بندوقیں اور دیگر اسلحۂ جنگ اپنے اہتمام میں تیار کرا لیتے۔

منشی فیض بخش، مصنفِ تاریخِ فرح بخش، جن کی عنایت سے ہمیں یہ واقعات معلوم ہوئے ہیں، خود اُس زمانے میں موجود تھے، اور اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب پہلے پہل گھر چھوڑ کے فیض آباد میں گیا ہوں، ممتاز نگر ہی تک پہنچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر ہے؛ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیاں، گرما گرم کھانا، کباب، سالن، روٹیاں اور پراٹھے وغیرہ بک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں، مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے۔ اور صدہا آدمی خریداری کے لیے اُن دُکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گزرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں، مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں، میں اندر کیسے پہنچ گیا؟ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا: جناب، شہر کا پھاٹک یہاں سے چار میل ہے، آپ کس خیال میں ہیں!

اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور دل چسپیاں۔ جدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے، مداری تماشا کر رہے ہیں اور لوگ طرح طرح کے سیر تماشوں میں مصروف ہیں۔ میں یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب فوجوں اور پلٹنوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہروں اور گھڑیوں کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیالوں پر موگریاں پڑتیں، جن کے شور و غل سے کان اُڑے جاتے۔ سڑکوں پر دیکھیے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں، خچروں، شکاری کتوں، گائے بھینسوں بیلوں، چھکڑوں اور توپوں کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا جس میں وضع داران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضع دار شریف زادے، حاذق اطبائے یونانی، اعلادرجے کے مردانے اور زنانے طائفے، ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویتے، سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاکے، عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنا و اعلا سب کی جیبیں روپیوں، اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی مرفہ الحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں فیض آباد، دہلی کی ہم سری کا دعوا کرے گا۔

چوں کہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں رہتا تھا جس طرح نواب شجاع الدولہ رہتے تھے، اور اس کے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ کہیں کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام میں اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو نہیں تیار ہو جاتے تھے، اس لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلا دست کاروں،

صنّاعوں، اور طالب علموں نے وطنوں کو خیر باد کہہ کے، فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا اور یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد لاہور، پشاور، کابل، کشمیر، اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا، جو علما کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے اور اُس چشمۂ علم سے، جو فیض آباد میں جاری تھا، سیراب ہو ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ کاش نوّاب وزیر اور دس بارہ برس جی جاتے، تو گھاگرا کنارے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا۔ اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی۔

یہ نوّاب شجاع الدّولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا، جس نے فیض آباد کو ایسا بنا دیا۔ اور ان نو سال میں بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر میں رونق افروز رہتے، باقی زمانہ اپنی قلمرو کے دورے اور سیر و شکار میں صرف ہوتا تھا۔ شجاع الدّولہ کا طبعی میلان مہ جبین عورتوں اور رقص و سرود کی طرف تھا، جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اِس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا۔ اور نوّاب کے انعام و اکرام سے وہ اِس قدر خوش حال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں، جن کے ساتھ دو دو تین تین عالی شان خیمے رہا کرتے اور نوّاب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوّابی خیموں کے ساتھ ساتھ، اِن کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لد کے روانہ ہوتے اور ان کے گرد دس دس بارہ بارہ تلنگوں کا پہرا رہتا۔ اور جب حکم راں کی یہ وضع تھی تو تمام اُمرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کر لی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ اس سے بد اخلاقی اور بے شرعی کو ترقی ہو گئی، لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن شاہدانِ بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقینی سے، شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد، دُلھن بن گیا تھا۔

۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علمِ اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوہ پہنچے، جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے میں، اُسے اُن سے چھین کے، اپنے قبضے میں کیا۔ اور احمد خاں بنگش کی قلمرو میں داخل ہو کے، کوڑیا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے انھوں نے حافظ رحمت خاں فرماں روائے بریلی کو لکھا: ”گذشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے، مہاجی سیندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے، جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیانِ دوآب ہے، آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے، میں نے آپ کا وہ علاقہ اس کے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کر دیا۔ لہٰذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی، فوراً ادا کیجیے۔“

حافظ رحمت خاں نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کر کے کہا: ”شجاع الدولہ لڑائی کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہے ہیں، مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔ بیس لاکھ میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور باقی تیس لاکھ تم جمع کر دو۔“

ناعاقبت اندیش پٹھان سرداروں نے جواب دیا: ”شجاع الدولہ کے آدمی دیکھے ہی کے ہیں، وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کریں گے؟ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے تو اُن کی توپوں پر جس وقت ہم تلواریں سُوت سُوت کے جا پڑیں گے، سب کے حواس جاتے رہیں گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔“ حافظ رحمت خاں نے یہ سن کے کہا: ”تمھیں اختیار ہے، مگر میں ابھی سے کہے رکھتا ہوں کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو میں میدان سے زندہ نہ آؤں گا، اور اس کا جو انجام ہوگا، وہ تمھیں کو بھگتنا پڑے گا۔“

بہ ہر تقدیر شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا، فوج لے کے چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت خاں کی زبان سے پہلے ہی سنوا دیا تھا۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر یہ

فتح شجاع الدولہ بہادر کو بھی سزاوار نہ ہوئی۔ ۱۳ صفر سنہ ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی تھی ۱۱ شعبان کو شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کر کے لکھنؤ آئے۔ ماہِ مبارکِ رمضان لکھنؤ میں بسر کیا۔ ۸ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کر کے ۱۴ کو فیض آباد میں داخل ہوئے۔ اور فتح کو ۹ مہینے دس ہی دن ہوئے تھے اور گھر میں پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) کو رہ گرائے عالمِ جاودان ہوئے۔ اور افسوس، ان کی وفات ہی کے ساتھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہو گیا۔

اُس وقت حکومتِ اودھ میں سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی بی بی، بہو بیگم صاحبہ کا تھا، جو نہایت ہی دولت مند بھی سمجھی جاتی تھیں۔ اُن کی منظوری سے نواب آصف الدولہ مسند نشینِ حکومت ہوئے۔ مگر ان کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی اور مصاحبوں کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹوں کو الگ رکھیں۔ چند روز تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد، نواب آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا اور یہیں بیٹھے بیٹھے ماں کو ستایا کرتے اور بار بار اُن سے روپیا طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی نواب آصف الدولہ کی نالائقیوں نے بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا، مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک، وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعثِ رونق ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہو گئی اور لکھنؤ کا دور شروع ہوا جس کا حال ہم آیندہ لکھیں گے۔

(۲)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہِ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے

۹ سنہ محمدی (سنہ ۱۵۹ء) میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبۂ اودھ کے صوبے دار یا والی کا مستقر، بادی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ اُن دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ بہ تلاشِ معاش دہلی پہنچے۔ وہاں امرائے دربار میں رسوخ پیدا کر کے بارگاہِ شہنشاہی میں باریاب ہوئے۔ آخر منصب دارانِ شاہی میں شامل ہو کے، لکھنؤ میں جاگیر پائی اور چند روز بعد، بڑے تزک و احتشام اور کرّ و فر سے اپنی جاگیر میں آ کے مقیم ہوئے یہاں خاص لچھمن ٹیلے یا شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر مقیم ہو کے، انھوں نے اپنا پنج محلا بنوایا، شیخن دروازہ تعمیر کرایا اور لکھنؤ ہی میں پیوندِ زمین ہوئے۔ اُن کا مقبرہ نادان محل کے نام سے آج تک مشہور ہے، جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پسند کر کے، اپنی زیرِ حمایت لے لیا ہے۔

اُسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے لچھمن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب و جوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا اور گرد و نواح کے لوگوں پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شیخ عبدالرحیم کو دربارِ شاہی سے عَلمِ ماہی مراتب عطا ہوا تھا، یا اس لیے کہ اُس قلعے کے ایک مکان میں چھبیس[۲۶] محرابیں تھیں، اور ہر محراب پر معمار نے دو دو مچھلیاں بنا کے، باوَن مچھلیاں بنا دی تھیں، اُس قلعے کا نام "مچھی بھون" مشہور ہو گیا۔ بھون کا لفظ، یا تو قلعے کے معنوں میں ہے، یا "باون" سے بگڑ کے بن گیا ہے۔ جس معمار نے اس قلعے کو تعمیر کیا، وہ لکھنا نام کا ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اسی کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہو گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پوری بگڑ کے، لکھنؤ بن گیا ہے۔ ان میں سے جو بات ہو، مگر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد پایا۔

چند روز بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخ زادوں کے علاوہ، یہاں

پٹھانوں کا ایک گروہ آگیا، جو جنوب کی طرف بسے اور "رام نگر" کے پٹھان مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ واقع ہے۔ کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھیے تو شیخ زادوں کی زمین شروع ہوتی تھی، اُن پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف بس گیا جو شیوخِ نہرہ کہلاتے ہیں۔ اِن لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب ریزیڈنسی کے کھنڈر پڑے ہیں۔

یہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں پر متصرف اور اپنے حلقوں کے حاکم تھے لیکن شیخ زادوں کا اثر سب پر غالب تھا، اور قرب و جوار پر اُن کا دباو پڑتا تھا جس کا قوی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربارِ دہلی میں رسوخ رکھتے تھے۔ اُن میں سے کئی شخص پورے ملکِ اودھ کے صوبے دار مقرّر ہو گئے تھے۔ اور اُن کے قلعۂ مچھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا: "جس کا مچھی بھون، اُس کا لکھنؤ"۔

اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا۔ اور اس کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ صوبہ دارِ اودھ، اُنھی شیخ زادوں میں سے منتخب ہوئے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معزّزینِ دہلی مقرّر ہوتے، جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے، فقط تحصیل وصول کے زمانے میں ایک دورہ سا کرتے، اور اُن کے نائب یہاں رہا کرتے۔ لہٰذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی اُمّید نہ کی جا سکتی تھی۔ ہاں یہاں کے دو ایک شیخ زادے جو صوبے دار مقرّر ہو گئے، تو اُن کے تقرّر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہنچا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجّہ تھی چنانچہ اس نے یہاں کے برہمنوں کو، باجپئی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپے مرحمت فرمائے تھے، اور اسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوئے۔ اسی سے پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلّے جو اکبر کے وقت میں موجود تھے: باجپئی ٹولہ، کٹاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ، بنجاری ٹولہ،

اور اہیری ٹولے ہیں۔ اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نور الدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے، باپ کی زندگی اور اپنے ایام ولی عہدی میں، مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو چھچھی بھون سے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبے دار، جواہر خاں تھے۔ وہ تو دہلی میں رہتے نگران کے نائب، قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں، اس سے ملے ہوئے، داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے۔ اور اُن کے اور چوک کے درمیان میں، بادشاہ کے نام سے، اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہد اکبری میں جب کہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ محلّے آباد ہو رہے تھے، لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی تاجر نے، جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا، یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور دربار شہنشاہی سے، لکھنؤ کے قیام کے لیے سند مستامنی حاصل کر کے، یہاں اپنا اصطبل قائم کیا۔ اور پہلے ہی سال میں اس قدر پھیلا پھولا کہ چوک کے متّصل، چار عالی شان مکان تعمیر کر لیے۔ سال ختم ہونے پر جب اُس نے پروانۂ مستامنی کی تجدید چاہی، تو اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اور اس پر بھی اس نے زبردستی ٹھہرنے کا ارادہ کیا، تو حسب الحکم شہنشاہی حکّام شہر نے اُس کے مکانات ضبط کر کے، نزول سرکار کر لیے اور اُسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدّت تک سرکار کے قبضے میں رہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد

ع ۵ مستامن کے معنی طالب امن ہیں۔ یورپ والوں کو چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے لیے خطرہ نظر آیا کرتا تھا، اس لیے جہاں قیام کرنا چاہتے، وہاں کے لیے دربار دہلی سے مستامنی کی سند حاصل کر لیا کرتے، تاکہ حکام وعمال اور نیز رعایا انھیں نہ ستائے۔ اس سند سے چونکہ سلطنت پر ذمے داریاں عائد ہو جاتی تھیں اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

میں، جب ملا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادوں سے عاجز آکے، لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا، تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان انھیں دے دیے گئے، اور انھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آکے اُن مکانوں میں سکونت اختیار کی، جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک 'فرنگی محل' کہلاتے ہیں۔ ملا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ، علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم کا مرجع و ماوا بن گیا۔ اور اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم، جو 'سلسلۂ نظامیہ' کہلاتا ہے، مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں، سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اُس میں ولیانہ برکتیں بھی مضمر تصور کی جاتی ہیں۔ اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں کہاں کہاں اور کتنی کتنی دور سے طلبۂ علوم لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے۔

یورپین سیاح لیکٹ، جو ۱۰۴۱ھ محمدی (۱۶۳۱ء) یعنی شاہ جہاں بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں ہندوستان کی سیر کر رہا تھا، لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان منڈی ہے"۔ عہد شاہ جہانی میں یہاں کے صوبے دار، سلطان علی شاہ قلی خاں تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے: مرزا فاضل اور مرزا منصور۔ انھی دونوں کے نام سے انھوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے، دو نئے محلّے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کیے۔

اُس زمانے میں یہاں اشرف علی خاں نام ایک رسالدار تھے، انھوں نے اسی سلسلے میں اشرف آباد بسایا۔ اور اُن کے بھائی مشرّف علی خاں نے، نالے کے دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرّف آباد نام ایک اور محلّہ قائم کیا جس کا نام، مرور ایام سے اب نوبستہ ہو گیا ہے۔ انھی دنوں پیر خاں نام ایک اور فوجی افسر تھے، جنھوں نے ان سب محلّوں سے مغرب کی طرف دور جا کے، اپنی گڑھی بنائی۔ جو مقام (کذا) آج تک پیر خاں کی گڑھی کہلاتا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔

واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا، اُس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی۔ جو خاص مچھی بھون ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلندی پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی۔ اور غالباً اسی موقع پر اس نے فرنگی محل کے مکانات، علامۂ زمان مُلّا نظام الدین کی نذر کیے ہوں گے۔

محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبے دار گردھانا نگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اُس کا چچا چھبیلے رام، دربارِ دہلی کی طرف سے الٰہ آباد کی حکومت پر مامور تھا۔ چھبیلے رام کے مرنے پر گردھانا نگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ چچا کی جگہ زبردستی الٰہ آباد کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کے اُس نے اظہارِ اطاعت و فرماں برداری کیا، اور دربار سے اُسے اودھ کی صوبے داری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اس نے یہاں کی سکونت اختیار کی۔ اور اس کی بی بی نے جو رانی کہلاتی تھی، رانی کٹرہ آباد کیا۔

مگر یہاں کا حاکم اور صوبے دار چاہے کوئی ہو، شیخ زادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی والی کو، چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سندِ حکمرانی لے کے آیا ہو، یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے حلقے میں قدم رکھے۔ مچھی بھون کو اگرچہ قصرِ امارت کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخ زادوں نے اُسے اپنی موروثی جایداد بنا لیا تھا، اور دہلی سے جو والی آتا، اس کے پاس پھٹکنے نہ پاتا۔ انھوں نے مچھی بھون کے پاس دو اور عمارتیں تعمیر کر لی تھیں، جن میں سے ایک کا نام مبارک محلا تھا۔ اور دوسری کا نام 'پنچ محلا' تھا۔ پنچ محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنچ منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پانچ محل بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے جنوب طرف ایک بڑا محراب دار پھاٹک تھا جو شیخن دروازہ کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخ زادوں کی مذکورہ عمارتوں میں جانا چاہتے، اِسی پھاٹک میں سے ہو کے گزرتے۔

اِس پھاٹک کے محراب میں بانکے شیخ زادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور

حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے، کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو، پہلے اس تلوار کو جھک کے سلام کر لے، پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے؟ یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخوں سے ملنے جاتے، تو انھیں بھی جبراً و قہراً اُس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ ۱۱۴۲ھ محمدی (۱۷۳۲ء) میں نواب سعادت خاں برہان الملک، دربارِ دہلی سے اودھ کے صوبے دار مقرر ہو کے آئے، جن سے ہندوستان کے اُس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی، جس کے عروج کو، ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دے کے، بیان کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدن کا نقشِ اولین اور اسی مشرقی دربارِ لکھنؤ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس نمبر میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس بساط کو اپنے ناظرین کے پیشِ نظر کر دیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔ آیندہ چند نمبروں میں ہم اس نیشاپوری خاندان کی تاریخِ حکومت بیان کریں گے۔ اور اس کے بعد دکھائیں گے یہ تمدن کیا اور کیسا تھا۔

(۳)

نواب سعادت خاں برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے کہ میر محمد نصیر نام، نیشاپور کے ایک سید زادے، جن کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے، ۱۱۳۵ھ محمدی (۱۷۲۳ء) عہدِ بہادر شاہ میں واردِ ہندوستان ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے۔ جنھوں نے یہاں شادی کر لی اور باپ بیٹوں نے ناظمِ بنگالہ کی زیرِ حمایت عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور رہا۔

میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد، اُن کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان میں آ گئے۔ عظیم آباد پہنچے تو سنا کہ والد نے سفرِ آخرت کیا۔ اور اب دونوں بھائی

میر محمد باقر اور محمد امین، دہلی کو روانہ ہوئے، جہاں پہنچ کے، میر محمد امین کو شاہ زادوں کی جاگیر کا ٹھیکا مل گیا۔ اس میں انھوں نے ایسی لیاقت، مستعدی اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگوں میں شہرت ہو گئی۔ اقبال برسر یاری تھا، چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امیروں اور منصب داروں میں شامل ہوئے۔ پھر صوبے دار اکبر آباد کی بیٹی سے نکاح ہو گیا اور اُس اعلا طبقۂ امرا میں شمار کیے جانے لگے جس پر سلطنت کی ذمّے داری کی خدمتوں کے لیے، انتخاب کی نظریں پڑتی تھیں۔

اُن دنوں دہلی میں ساداتِ بارہہ کا زور تھا، جن سے رعیّت تو رعیّت، خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے۔ محمد امین نے ان کو قتل کرا کے، سیّدوں کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا اور لڑائی میں ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور سات ہزار سواروں کی سرداری کے ساتھ "برہان الملک، بہادر جنگ" کا خطاب عطا ہوا، اور اُسی وقت اکبر آباد کے صوبے دار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہی خواصوں کی داروغگی عطا ہوئی جو بڑا معزز عہدہ تھا۔ اُس کے تھوڑے دنوں بعد وہ صوبۂ اودھ کے صوبے دار اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانے کے داروغہ مقرر ہوئے۔ آدمی ہوشیار اور نہایت ہی بیدار مغز اور اس کے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ شاہی توپ خانے کو اپنے ہاتھ میں لے کے انھوں نے ایسی زبردست قوّت پیدا کر لی جیسی ان دنوں سارے ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ تھی۔ اُس زمانے میں کوڑا کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سرتابی کر کے بڑا زور باندھ رکھا تھا۔ اور کئی افسر جو اس کی سرکوبی کو گئے، اس کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوئے اور یلغار کرتے ہوئے پہنچے۔ بلونت سنگھ نے چالاکی سے اُن کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پانو پھول گئے۔ مگر برہان الملک نے ایسی جواں مردی سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنوں کے نرغے میں اُن کی لمبی سفید نورانی ڈاڑھی چمکتی اور رُعب ڈالتی

رہی تھوڑی دیر میں بھگونت سنگھ اُن کے تیر کا نشانہ ہوا اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی۔ اُن دنوں مرہٹوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ انھوں نے تاج دارِ دہلی سے چوتھ مقرر کرالی تھی اور بڑے بڑے سورما اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ برہان الملک نے مرہٹوں کو زبردست فوج کے ساتھ جاکے ایسی سخت شکست دی کہ اُن کے حواس جاتے رہے، نوک دم بھاگے اور برہان الملک نے تعاقب شروع کیا۔ واقعاتِ تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر برہان الملک زبردستی نہ روک دیے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹوں کا استیصال کر دیتے اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہدِ شباب کی طرح سارے ہندوستان کی سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی۔ مگر اس بدنصیب زوال پذیر سلطنت کو مٹنا ہی تھا۔ درباریوں کی سازش اور مقربینِ دربار کے حسد نے برہان الملک کی رفتار کو رکوا دیا۔

اس بات نے برہان الملک کو یقین دلایا کہ بادشاہ میں اپنے نیک و بد کے سوچنے کی صلاحیت نہیں اور اہلِ دربار بددیانت و خود غرض ہیں، فوراً مرہٹوں سے صلح کر لی پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے میں جاکے قیام کریں اور سب سے الگ ہو کے اپنے علاقے کو مضبوط اور منتظم بنا دیں۔ غرض برہان الملک نے دل میں سمجھ لیا کہ اب سلطنت مغلیہ پنپنے والی نہیں ہے، اپنا صوبہ لے کے الگ ہو جانا ہی مناسب ہے اور دربارِ دہلی کو اس کی قسمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔

لکھنؤ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، شیخ زادوں کا زور تھا۔ انھوں نے اپنی عادت کے موافق انھیں بھی روکا، مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہو گئے اور نکسیر بھی نہ پھوٹنے پائی۔ برہان الملک کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے متعلق دو روایتیں مشہور ہیں: ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے، یہاں تک کہ اکبری دروازے پر روکے گئے۔ چونکہ وہ سابق کے تمام صوبے داروں کے خلاف تجربے کار، متین اور سنجیدہ شخص تھے، ٹھہر گئے

اور محمود نگر میں پڑاو ڈال دیا۔ دو ایک دن کے بعد شیخ زادوں کی دعوت کی۔ اُن سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے، لیکن جس وقت غافل شیخ زادے، الوانِ نعمت کا مزہ لوٹنے میں مصروف تھے، شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک میں داخل ہو رہی تھی، جو برابر بڑھتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ مچھی بھون کے پاس جا پہنچی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بنگش نے بُرہان الملک کو بتا دیا تھا کہ لکھنؤ کے شیخ زادے بڑے شورہ پشت ہیں، ان سے پیش پانا آسان نہیں۔ مگر قرب و جوار کے دوسرے شیوخ اُن کے خلاف ہیں، آپ اُن لوگوں سے مدد لیجیے اور انھی کی مدد سے لکھنؤ والوں کو زیر کیجیے چنانچہ برُہان الملک نے کاکوری میں قیام کر کے، شیوخِ کاکوری کو اپنے موافق بنالیا۔ انھی کی مدد او ر رہبری سے آگے بڑھے اور یہ سُن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے میں مقابلے کا سامان کیا گیا ہے، اصلی راستے سے کترا کے مغرب کی طرف کٹ گئے۔ گئو گھاٹ کے پاس دریا کے پار اُترے اور پار کی طرف سے آہستہ آہستہ آ کے، اچانک مچھی بھون پر آ پڑے۔ غرض جو صورت ہو، انھوں نے بغیر اس کے کہ کوئی مزاحم ہو، قلعے پر قبضہ کر لیا۔

جب مچھی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا؟ شیخ زادوں کے تمام معزز لوگوں نے حاضر ہو کے، عاجزی سے سر جھکا دیا۔ بُرہان الملک ہاتھی پر سوار ہو کے شیخن دروازے میں داخل ہوئے اور اس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادروں سے سلام لے چکی تھی۔ اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔ پھر شیخ زادوں سے کہا: "ہمارے قیام کے لیے مچھی بھون خالی کر دو" اس میں انھوں نے لیت و لعل کرنا چاہی مگر نہ چلی۔ آخر ایک ہفتے کی مہلت دی گئی اور اس مدت کے اندر شیوخ جو کچھ اسباب لے جا سکے، اُٹھا لے گئے اور جو رہ گیا، اس پر بُرہان الملک کے سپاہیوں نے قبضہ کیا۔ قلعے میں جا کے رہنے سے پہلے، اُس کے پاس، جہاں خیمے ڈال کے وہ رہے تھے، وہاں ایک نوبت خانہ تعمیر کرا دیا جس میں دربارِ اودھ کے آخر عہد تک روزانہ

چھبے وقت نوبت بجتی تھی۔

اُس کے بعد برہان الملک، اجودھیا میں گئے۔ اور دریا کنارے وہ بنگلا بنوایا جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ میں آتے اور قیام کرتے تھے، کیونکہ صوبے کا مستقر یہی شہر تھا۔ اُن کے زمانے میں یہاں کئی نئے محلے آباد ہوئے۔ مگر یہ سب محلے اُن کے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے، جہاں مستقل سکونت کے لیے لوگوں نے مکان بنانا شروع کر دیے۔ سید حسین خاں کا کٹرہ، ابو تراب خاں کا کٹرہ، خدایار خاں کا کٹرہ، بزن بیگ خاں کا کٹرہ، دیانیگ خاں کا کٹرہ، محمد علی خاں کا کٹرہ، باغ مہانرائن، سرائے معالی خاں اور اسماعیل گنج، (جو مچھی بھون کے مشرق طرف تھا، اب اکھڑ گیا) سب اُسی زمانے کے محلے یا بُرہان الملک کے سرداران فوج کی لشکر گاہیں ہیں۔

نواب برہان الملک چھبے ہی برس اودھ اور لکھنؤ میں رہنے پائے تھے کہ ۱۱۵۱ھ ہجری (۱۷۳۸ء) میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور وہ نہایت ہی تاکید کے ساتھ دہلی میں بلائے گئے۔ اُس پُرفتن زمانے میں جو کچھ واقعات گزرے، اُن کو لکھنؤ سے تعلق نہیں۔ لکھنؤ میں اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھانجے اور داماد صفدر جنگ کو چھوڑ گئے تھے۔ نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کرا چکا تھا، مگر ابھی وہیں تھا کہ نواب بُرہان الملک نے دہلی میں وفات پائی۔ ان کے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش اٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبے داری انھیں دی جائے۔ لیکن راجہ لچھمی نرائن نے جو بُرہان الملک کے معتمد عہدے داروں میں تھا، نادر شاہ کی خدمت میں اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کر دی کہ "نواب برہان الملک، شیر جنگ سے خوش نہ تھے۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنی بیٹی اُن کو چھوڑ کے صفدر جنگ کو دی جو ان کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی اُن کی طرف سے وہاں موجود ہیں۔ بُرہان الملک کے مال و اسباب کی مالک سرکار ہے جسے چاہے عطا کرے، اس لیے کہ کوئی ورثہ نہیں

ہے۔ یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ بُردبار، خدا ترس، لائق اور وعدے کے سچے ہیں، اور سپاہ ان سے خوش ہے۔ قطعِ نظر اس کے، حضور کے لیے بُرہان الملک نے دو کرور روپے کی رقم کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے ادا کرنے کا انتظام نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے۔ جس وقت حکم ہو، حاضر کیے جائیں۔ ان وجوہ سے امید ہے کہ حضور انھی کی سفارش فرمائیں گے۔"
یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ نے صفدر جنگ کے لیے محمد شاہ سے خود ہی خلعتِ صوبہ داری لے لیا، اور اپنے ایک مصاحب اور دو سو سواروں کے ساتھ اودھ میں صفدر جنگ کے پاس بھیجا۔ یوں خلعتِ صوبہ داری پہن کے صفدر جنگ نے وہ دو کرور کا نذرانہ نادر کے پاس بھجوا دیا اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے۔

صفدر جنگ کا پورا نام، مرزا مقیم ابوالمنصور خاں صفدر جنگ تھا۔ گو ان میں بُرہان الملک کی سی سچی بہادری، سادگی، راست بازی اور جفاکشی نہ تھی، مگر نہایت فیاض، بلند حوصلہ، رحم دل، رعایا پرور اور منتظم تھے۔ شہر سے تین میل کی مسافت پر انھوں نے قلعۂ جلال آباد تعمیر کرایا۔ اور مچھی بھون کے اندر پنج محلے کی جو قدیم عمارت تھی، اُسے بھی شیخ زادوں سے لے لیا، اور اس کے عوض میں، دو گانواں ہیں ایکڑ زمین شیخ زادوں کو رہنے اور بسنے کے لیے عطا کی۔ جس سے اگرچہ شیخ زادوں پر ظلم ہوا، مگر لکھنؤ کی آبادی کو وُسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ مچھی بھون کو صفدر جنگ نے از سرِ نو تعمیر کرایا اور اُسے بہت درست کیا۔

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبے میں رہنے پائے تھے کہ دہلی میں ان کی طلبی ہوئی اور راجہ نول رائے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ میں چھوڑ کے، وہ دہلی چلے گئے۔ نول رائے علم دوست، وقت کا پابند، جفاکش، بہادر اور بہت بڑا منتظم تھا، اور اس کے ساتھ اُسے خدا نے اپنے آقا کی سی اولوالعزمی اور فیاضی بھی دی تھی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پُل تعمیر کرے۔ پایوں کی بنیاد ڈالنے کے لیے گہرے کنویں

کھدوائے۔ لیکن پایے بننا شروع نہیں ہوئے تھے کہ اپنے آقا کی طلب پر اُسے احمد خاں بنگش کے مقابلے کے لیے جانا پڑا۔ اس مہم میں وہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا، مگر ہار گیا، اور پُل کا کام جو چھیڑا تھا، ناتمام پڑا رہ گیا۔

احمد خاں بنگش اُس زمانے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اس کے مقابلے کے لیے برہان الملک کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اس کے حریف مقابل نہ ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خاں کی اور اُن کے ساتھ افاغنہ کی قوت ترقی کرتی گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پانو مارے، خود شہنشاہ دہلی تک کو اُس کے مقابلے پر لاکے کھڑا کر دیا، مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اور اس کے اشارے سے حافظ رحمت خاں نے اودھ کے شہروں اور قصبوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ خیر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور خود احمد خاں بنگش کا بیٹا محمود خاں، فوج لے کے چلا کہ لکھنؤ پر قبضہ کر لے۔

۱۱۷۹ محمدی (۱۷۵۰ء) میں پٹھانوں نے ملیح آباد میں اپنا تھانا قائم کیا۔ اور ۱۱۸۰ محمدی (۱۷۵۱ء) میں محمود خاں کا کوئی عزیز بیس ہزار فوج لے کے لکھنؤ کی طرف چلا۔ شہر کے باہر پڑاو ڈالا۔ اور اپنا ایک کوتوال مقرر کر کے شہر میں بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیوں سے شہر خالی تھا۔ جو چند تھے بھی، پٹھانوں کے آنے کی خبر سن کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور پٹھانوں کے کوتوال نے شہر میں آ کے بے اعتدالیاں شروع کر دیں۔

اُن دنوں شیخ زادگانِ لکھنؤ میں سب سے زیادہ سر برآوردہ شیخ معز الدین تھے۔ وہ افاغنہ کے سردار سے شہر کے باہر جا کر ملے۔ اُسی وقت کسی نے اُس سے جا کے شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کوتوال کی تحقیر و توہین کرتے ہیں اور کوئی اس کا حکم نہیں مانتا۔ شیخ معز الدین بولے: "کیا مجال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے۔ میں جاتا ہوں، مفسدوں کو سزا دوں گا۔" یہ کہہ کے واپس آئے اور تمام بھائی بندوں کو بلا کے کہا: "پٹھانوں کے قول و فعل کا اعتبار نہیں، بہتر یہ ہے کہ ہم نواب صفدر جنگ کا ساتھ دیں اور مقابلہ

کر کے پٹھانوں کو یہاں سے نکال دیں۔ اِس کے بعد شیخ معزالدین نے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی اور سارے شیخ زادوں کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو درباری لباس پہنا کے اپنے مکان میں بٹھا دیا اور منادی کرادی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے اس مغل کو کوتوال بنا کے بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ ہی علیؑ کے نام کا ایک سبز جھنڈا کھڑا کیا۔ اور لوگ اُس کے نیچے آآ کے جمع ہونے لگے۔

یہ حالات سن کے پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شیخ زادوں نے جان توڑ کے مقابلہ کیا۔ اور اپنی پرانی شجاعت دکھا دی۔ پٹھان مقابلے کی تاب نہ لا سکے، پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بھاگے۔ اور موقع پاکے شیخ زادوں نے پٹھانوں کو سارے ملکِ اودھ سے نکال باہر کیا۔

دو سال بعد جب احمد خاں بنگش سے صلح ہو گئی تو سنہ ۱۱۸۲ محمدی (۱۷۵۳ء) میں نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے اور مہدی گھاٹ پر آکے ٹھہرے۔ ایک خاص مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور سجایا اور سپاہ کی درستی میں مصروف ہوئے لیکن اس کی مہلت نہ ملی۔ اُسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ میں پڑاو تھا کہ انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہڈیاں دہلی میں لے جا کے دفن کی گئیں۔ جن پر نہایت ہی عالی شان مقبرہ موجود ہے۔ اور سیاحانِ ارض اسے آج تک عبرت و عزّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(۴)

صفدر جنگ منصور علی خاں کے انتقال کے بعد سنہ ۱۱۸۲ محمدی (۱۷۵۳ء) میں اُن کے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے، جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصے میں بیان ہو چکے ہیں۔ وہ ایک مضطرب اور بے قرار طبیعت کے اولوالعزم فرماں روا تھے لیکن بدقسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنوں اور یادگارِ زمانہ انقلابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قوموں اور قوتوں کی قسمت کا فیصلہ انھی کی آنکھوں کے سامنے

ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی جس میں احمد شاہ دُرّانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خوانینِ روہیل کھنڈ کی تمام زبردست فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹوں کا ٹیری دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے سنہ ۱۱۹۰ محمدی (سنہ ۱۷۶۱ء) میں ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے مسلمانوں کا رہے یا نہ رہے۔ مگر مرہٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ اُس کے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان گرم ہوا جس میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکرِ کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگِ پانی پت کے چار سال بعد، سنہ ۱۱۹۳ محمدی (سنہ ۱۷۶۴ء) میں چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا تصفیہ کر دیا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں، انگریزوں کا ہے۔

ان لڑائیوں سے پہلے، شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی میں رہے، مگر بڑی بڑی مہموں، پولیٹکل مشغولیتوں اور فوجی اصلاحوں سے انھیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی و آرائش کی طرف توجہ کریں۔ اُنھوں نے قلعے بنوائے، گڑھیاں قائم کیں، فوجی سامان اور آلاتِ جنگ کو فراہم کیا۔ اس کی فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کو درست اور اپنے شہر کو آراستہ کریں۔ بکسر کی لڑائی کے بعد، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، وہ فیض آباد میں جا کے اقامت گزین ہو گئے۔ اس لیے لکھنؤ ان کی برکتوں سے محروم رہ گیا۔ سنہ ۱۲۰۴ محمدی (سنہ ۱۷۷۵ء) میں انھوں نے سفرِ آخرت کیا، اور نوّاب آصف الدولہ اُن کے جانشین ہوئے۔

آصف الدولہ نے مسندِ حکومت پر قدم رکھتے ہی، ماں سے ناراض ہو کے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربارِ اودھ کی قوّتِ فرماں روائی گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربارِ اودھ میں دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے جن کی بنا پر یہاں فوجی ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومتِ اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اُس کی فوجیں دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکیں۔

تاہم، شجاع الدولہ جب تک فیض آباد میں زندہ رہے، فوجی اصلاح ہی میں مصروف رہے۔ اور رات دن اسی بات کی دھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائیں چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں اُسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ "جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی بندوقوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔"

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتیں تشریف لے گئیں۔ انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کیا اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح کی طرف سے بے پروا ہو کے، دوسرے مشاغل میں جی بہلائیں۔ آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ انھیں لٹانے اور مزے اڑانے کے لیے روپے کی ضرورت تھی، جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے تھوڑی سی فوج رکھ لی، باقی سب کو معزول کر دیا اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے، جو اُن کے اشاروں پر چلتے اور اُن کے مشوروں کے آگے کسی کی نہ سنتے۔

اس خلوصِ عقیدت کے صلے میں، انگریزوں نے روہیل کھنڈ پران کا قبضہ کرا دیا۔ اپنی ماں، بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور لوٹنے کے لیے جب انھوں نے انگریزوں سے مدد مانگی، تو نہایت فیاضی کے ساتھ انھیں اخلاقی مدد دی گئی۔ اور ان کی طرف داری کی گئی۔ اس پر بھی ان کے زمانے تک انھیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے۔ جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے، انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ تھا کہ ظاہری صورت میں اُن دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان و شوکت پیدا ہوگئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سامانِ عیش جمع ہوگیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا۔ اُن دنوں شہرِ لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں، شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہوگا۔ شجاع الدولہ جو روپیا فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے، اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرایش و خوش حالی میں صرف کرنا شروع کر دیا اور چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی۔ اُن کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظامِ حیدرآباد ہوں یا ٹیپو سلطان کسی دربار کا کرّوفر اور کسی کی شوکت و حشمت، میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خاں کی شادی میں انھوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخِ ارض کے تمام تکلّفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولھا جو شاہی خلعت پہنے تھا، اُس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفلِ طرب کے لیے دو عظیم الشان اور پُر تکلف خیمے بنوائے گئے۔ جن میں ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا ۱۲۰۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ بلند تھا۔ اور ایسا عمدہ، نفیس اور قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے۔

اُنھوں نے دریا کنارے مچھی بھون کے مغرب طرف دولت خانہ، رومی دروازہ اور اپنا یکتائے روزگار امام باڑا تعمیر کرایا۔ ۱۲۱۳ محمدی (۱۷۸۴ء) میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اُس نازک موقع پر رعایا کی دست گیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے میں اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے، اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا۔ اور غریب و فاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آ کے مزدوروں میں شریک

ہو جاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوصِ عقیدت اور جوشِ دین داری سے بنوایا تھا، ویسے ہی خالص اور سچے دلی جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہو گئی، جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادرِ روزگار ہے۔ اُس کا نقشہ بنانے کے لیے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بلائے گئے اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشہ، دوسروں کے مجوزہ نقشے سے بڑھ جائے مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثلِ زمانہ معمار کا نقشہ پسند کیا گیا اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہو گئی۔ جو ۱۶۲ فٹ لمبی، ۵۲ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلا درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہانِ مغلیہ کی سنگین عمارتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ بیان اُس کثرت سے سنگِ مرمر دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتوں کو دیکھیے تو ایک نئی خوش نمائی اور نرالی عظمت و شان رکھتی ہیں۔ امام باڑے کی لداؤ کی چھت، جو کڑا دے کے بنائی گئی ہے، اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداؤ کی چھت، ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی اعجوبۂ روزگار کاری گریوں میں شمار کی جاتی ہے۔

آصف الدولہ کی عمارتوں پر، یورپ کی عمارتوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی نوعیت میں خالص ایشیائی ہیں جن میں نمایشی نہیں، اصلی و حقیقی شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے بعد یہ عمارتیں کس مپرسی میں پڑی رہیں۔ غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر قبضہ کر کے، گرد و پیش کے مکانوں کو منہدم کر دیا۔ اور سوا اُس جانب کے جدھر دریا ہے، باقی تینوں طرف میدان کر کے، امام باڑے کو قلعہ، اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنا لیا۔ اُس زمانے میں اس امام باڑے میں گورے رہتے تھے اس کے بڑے ہال میں سلح خانہ تھا اور اُس کے فرش پر بڑی بڑی توپیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ مگر نہ کبھی زمین کھُدی نہ

در و دیوار کی کوئی چیپ اُکھڑی۔ اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اُس کی مسجد میں ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور امام باڑے میں تعزیہ داری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدّولہ کی عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھیں تعمیر ہوئے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ کی مدت گزر گئی، مگر آج تک اُسی عظمت و شکوہ اور اسی مضبوطی و پائے داری سے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ نہ کوئی اینٹ اپنے مقام سے ہٹتی ہے اور نہ کسی جگہ چونے نے اینٹوں کو چھوڑا ہے۔ بہ خلاف اُن کے، دیگر شاہانِ اودھ نے کروڑوں روپے صرف کر کے جو عمارتیں بعد کو بنوائیں، وہ قومی و ملکی وضع داری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کم زور ہیں۔ اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتیں۔

آصف الدّولہ، امام باڑے اور مچھی بھون کے متصل اپنے محل "دولت خانے" میں رہتے تھے۔ شہر کے باہر اور دریا پار، ہجومِ خلائق سے دور اور دُنیوی جھگڑوں سے الگ رہ کے مصروفِ عیش ہونے کے لیے بیبیاپور کا محل بنوایا۔ اکثر جب وہ سیر و شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان میں قیام کرتے۔ اسی طرح چنہٹ میں ایک پُر فضا و نزہت بخش مکان، اور چارباغ اور عیش باغ میں کوٹھیں بنوائیں۔ اور اُسی زمانے میں تحسین گنج میں اور اس کے متصل اصطبل بنے۔ پھر محلہ وزیر گنج قائم ہوا جو آصف الدّولہ کے بیٹے وزیر علی خاں کی قیام گاہ ہونے کے باعث، انھیں کی طرف منسوب اور انھیں کی یادگار ہے۔

اب لکھنؤ میں حاکم اور فرماں روا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے کی وجہ سے، عام خلقت کا رخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا۔ جو لوگ شجاع الدّولہ کے زمانے میں فیض آباد میں بس گئے تھے، انھوں نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آ آ کے بسنا شروع کیا۔ دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے سیدھے لکھنؤ

میں آتے تھے اور پھر جانا نصیب ہوتا تھا۔ خلقت کے اس ہجوم نے نئے محلّے آباد کرنا شروع کر دیے اس لیے کہ باہر کے آنے والوں میں سے جسے جہاں جگہ مل جاتی، آباد ہو جاتا، اور سیکڑوں نئے محلّے آباد ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ امانی گنج، فتح گنج، رکاب گنج، نخّاس، دولت گنج، بیگم گنج، نواب گنج، خانساماں کا احاطہ، (جسے نوّاب آصف الدّولہ کے ایک خانگی داروغہ نے آباد کیا۔ اور افتتاح کی تقریب میں خود انھیں بلایا) ٹکیٹ گنج، ٹکیٹ رلے کا بازار (جو وزیراعظم سہاراجا ٹکیٹ رلے کی جانب منسوب ہیں) ترسی گنج، ہلکڑی یا ٹکلی، حسین الدین خاں کی چھاؤنی، حسن گنج، باولی، بھوانی گنج، بالک گنج، کشمیری محلّہ، صورت سنگھ کا احاطہ، نواز گنج، تحسین گنج، خدا گنج، تکریا (جس کی نوّاب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم صاحبہ نے اسی دن بنیاد ڈالی، جس دن دریا پار خود انھوں نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) عنبر گنج، محبوب گنج توپ دروازہ، خیالی گنج، جھاؤ لال کا پل (ان دونوں محلّوں کے بانی راجہ جھاؤ لال، سلطنتِ اودھ کے وزیرِ خزانہ تھے)، یہ سب وہ محلّے ہیں جو عہدِ آصفی میں بسے اور تعمیر ہوئے۔ اور انھیں دنوں دریا کے پار حسن رضا خاں نے حسن گنج بسایا۔

نوّاب آصف الدّولہ کی فیاضیوں کی خاص و عام میں شہرت تھی اور دُور دُور کے شہروں میں اُن کی داد و دہش کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھتے بیٹھتے عزّت و محبّت کے ساتھ اُن کا نام لیتے۔ اور اُن کے تمام ذاتی عیوب، فیّاضی کے دامن میں چھپ کے، نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ اور عوام کو، نوّاب کی صورت میں ایک عیش پرست فرماں روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا۔ ہندو دکان دار آج تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی جوشِ عقیدت سے کہتے ہیں "یا آصف الدّولہ ولی!"

اُسی زمانے میں جنرل کلاڈ مارٹن نام ایک بہت بڑا دولت مند فرانسیسی تاجر لکھنؤ میں آ کے رہ پڑا تھا۔ اس نے ایک نہایت ہی عالی شان کوٹھی کا نقشا بنا کے، نوّاب

آصف الدّولہ کے ملاحظے میں پیش کیا۔ نوّاب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اس کی قیمت میں دس لاکھ اشرفیاں دینے کو تیار ہو گئے۔ بیع کا معاہدہ تکمیل کو نہیں پہنچنے پایا تھا کہ نوّاب آصف الدّولہ نے سفرِ آخرت کیا۔ اور عمارت ہنوز تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے چوں کہ دولتِ بے پایاں چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا، اس لیے مرتے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اسے حکمرانانِ اودھ ضبط نہ کر سکیں۔ اس عمارت کا نام انھوں نے کانسٹین شیا (قسطنطنیہ) قرار دیا تھا مگر عوام میں وہ آج کل "مارکین (مارٹین؟) صاحب کی کوٹھی" مشہور ہے اور دیکھنے کے قابل ہے، مرنے کے بعد وہ اسی کوٹھی میں دفن ہوئے۔ وہ مدرسہ آج تک جاری ہے۔ جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے۔ مگر سنتے ہیں کہ مارٹن صاحب نے اس اسکول اور اُس کے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا، بلکہ وصیت کی تھی کہ عیسائی، ہندو، مسلمان سب ہی یکساں طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں لیکن اب یہ مدرسہ صرف یوریشین بچّوں کے لیے مخصوص ہے کسی ہندوستانی کو وظیفہ ملنا درکنار، اس کی تعلیم میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے میں جاہل و پُرجوش بلوائیوں نے قبر کھود کے مسٹر مارٹن کی ہڈیاں نکال لیں اور انھیں اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ انگریزوں کو بعدِ تسلّط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی، جو پھر اُسی خاک میں دبا دی گئی۔ لیکن اُن بلوائیوں کے فعل کے ذمّے دار، عام ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔

۱۲۲۲ھ ہجری (۱۷۹۷ء) میں نوّاب آصف الدولہ نے سفرِ آخرت کیا اور ان کی جگہ نوّاب وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے، جن کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بتا چکے ہیں مگر چار ہی مہینے میں ان سے ایسے بے ہودہ اور قابلِ نفرت حرکات ظاہر ہوئے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے۔ خود بہو بیگم صاحبہ ان کے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے، یمین الدّولہ نوّاب سعادت علی خاں کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ اِدھر اس خبر کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خاں،

آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بہتوں کا خیال تھا کہ پیدائشی عنین تھے۔

نواب سعادت علی خاں، آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث، اُن کے زمانے میں مدتوں قلمرو سے باہر اور دور رہتے تھے۔ مدتوں کلکتے میں رہے اور ایک زمانۂ دراز تک بنارس میں قیام رہا۔ وزیر علی خاں کی نسبت یہ خیال قائم ہونے کے بعد، قرعۂ انتخاب سعادت علی خاں پر پڑا۔ وہ بنارس سے لائے گئے اور بیبیاپور کی کوٹھی میں خود گورنر جنرل بہادر نے دربار فرما کے، وزیر علی خاں کی معزولی اور نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی کا فیصلہ کیا۔ وزیر علی خاں فوراً گرفتار کر کے بنارس بھیج دیے گئے۔ جہاں انھوں نے طیش میں آ کے، مسٹر چری کو مار ڈالا اور اس کی سزا میں گرفتار کر کے چنار گڑھ بھیجے گئے۔ اور وہیں مرے۔ ان کی مصیبتوں اور سرگردانیوں کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

(۵)

نواب سعادت علی خاں نے ۱۲۲۷ محری (۱۷۹۸ء) میں تخت پر بیٹھتے ہی آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دیا مشہور ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و نا امید بنارس میں پڑے ہوئے تھے کہ خبر پہنچی، نواب آصف الدولہ بہادر نے سفر آخرت کیا اور مسندِ حکومت پر وزیر علی خاں بیٹھ گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔
اس قطعی یاس کے عالم میں تھے کہ بنارس کے کسی یورپین حاکم نے آ کے پوچھا:
”نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا دیجیے گا؟“ جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو، انسان کے دل میں اس کی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے؟ بے اختیار زبان سے نکلا: ”آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دوں گا۔“ یہ وعدہ سن کے، اس انگریز حاکم نے کہا: ”تو آپ خوش ہوں اور میں آپ کو خوش خبری سناتا ہوں کہ آپ ہی فرماں روائے

لکھنؤ منتخب ہوئے ہیں"۔ سعادت علی خاں یہ مژدۂ غیر مترقبہ سن کے خوش تو ضرور ہوئے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سناٹے میں آ گئے۔ اور آخر تخت نشینی کے بعد اُس وعدے کے ایفا میں انھیں اپنی آدھی قلمرو بانٹ دینا پڑی، جس کا کانٹا زندگی بھر اُن کے دل میں کھٹکتا رہا۔

انگریزی تاریخوں میں اُن سے وعدہ لیے جانے کا تو ذکر نہیں ہے، مگر اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں کو چوں کہ انگریزوں نے تخت پر بٹھایا تھا، اس لیے انھوں نے اپنا آدھا ملک شکریے کے طور پر انگریزوں کی نذر کر دیا۔ بہر تقدیر، جو کچھ ہو، سعادت علی خاں کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت آدھی رہ گئی۔ لکھنؤ کے پرانے لوگوں میں مشہور ہے کہ اسی کو فت میں سعادت علی خاں نے نہایت ہی کفایت شعاری سے کام لے کے، اور تحصیل وصول میں بے انتہا مستعدی و بیدار مغزی ظاہر کر کے، بائیس تیئیس کروڑ روپیا جمع کیا۔ اور انگلستان میں برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکا بہ عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے، اُن کو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی تکمیل ہونے ہی کو تھی کہ اُن کے سالے نے کسی سازش میں شریک ہو کے، زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ ع آن قدح بشکست و آن ساقی نہ ماند۔

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات مشہور ہیں جن کا ثبوت سوائے افواہی روایتوں کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سعادت علی خاں اس قدر جز رس اور منتظم واقع ہوئے تھے کہ اُن کے سے حاکم نے قلمرو کا کوئی جز آسانی سے نہ دیا ہوگا۔ دوسرے اُن کے طرز عمل اور ان کی پالیسی میں ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پُراسرار بے قراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتا نہ چلے، مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے، اور ان کے تیور بہت ہی پُرمعنی تھے۔

ملک کو بانٹ دینے کی وجہ سے انھیں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ

سلطنت کی نصف آمدنی گھٹ گئی۔ اور آصف الدّولہ مرحوم نے مصارف حد سے زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ انھیں دربار کے مصارف گھٹانا پڑے، جو نہایت ہی مشکل چیز تھی۔ اس کوشش میں انھوں نے حسابات کی جانچ کی۔ ادنا ادنا رقموں پر نظر ڈالی، معافیوں اور جاگیروں کی نہایت سختی کے ساتھ چھان بنان کی، دربار کے مصارف میں جہاں تک بنا، کمی کی، غرض جس طرح ہوسکا، بدنامیاں اٹھا کے اور لوگوں پر سخت بے رحمیاں کر کے انھوں نے سلطنت کی آمدنی بڑھائی اور خرچ گھٹایا۔

یہ کارروائیاں دیکھ کے ذی ہوش اور منصف مزاج لوگ تو سعادت علی خاں کی لیاقت اور خوش تدبیری کے قائل ہو گئے، مگر عوام میں بے انتہا ناراضی پھیلی۔ ایک طرف اُن معافی داروں اور جاگیرداروں کا گروہ شاکی تھا جن کی جایدادیں ضبط ہوئی تھیں۔ دوسری طرف وہ فضول اور از کار رفتہ ملازمین روتے پھرتے تھے جن کی جگہیں تخفیف میں آگئی تھیں۔ اسی قدر نہیں، ملک میں ایک بڑا بھاری گروہ ان لوگوں کا بھی تھا، جو وزیر علی خاں کے طرف دار تھے، ان کو جائز اور سچا حق دارِ سلطنت خیال کر کے، نوّاب سعادت علی خاں کو غاصب بتاتے تھے۔ غرض ملک میں ہزاروں دشمن تھے، جن سے خطرہ تھا کہ نوّاب کی جان پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ رعایا کے علاوہ فوج بھی نئے نوّاب سے نہایت ہی ناراض تھی۔ بے شمار فوج کا ٹیری دَل جو نوّاب شجاع الدّولہ کے عہد میں تھا، اُس میں آصف الدولہ ہی کے زمانے سے سرکار انگریز بہادر کے مشورے سے تخفیف شروع ہو گئی تھی۔ مگر آصف الدّولہ کی فیاضیوں اور فضول خرچیوں نے بہلائے رکھا اور شکایت کی آواز زیادہ نہیں بلند ہونے پائی۔ سعادت علی خاں نے جب زیادہ تخفیف کی اور اس کے ساتھ جزرسی بھی اختیار کی، تو ہر طرف ہائے ہائے پڑ گئی۔ اور جو تھا، اُن کی جان کو رو رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جان کی حفاظت کے لیے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی کہ انگریزی باضابطہ فوجی گارڈ خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیوں کہ شہر کے مفسدوں

اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے اور نیز امن و امان قایم رکھنے کی غرض سے، ایک بیرونی زبردست قوت کا ہر وقت شہر میں رہنا بہت ہی ضروری تھا جس کی نسبت سنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے اس کو نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔

فرماں روایانِ اودھ نے اس سے پیش تر اپنے رہنے سہنے کے متعلق نہایت ہی سادگی ظاہر کی تھی۔ پہلے تین حکم رانوں یعنی نواب برہان الملک، نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ نے جن سادے مکانوں میں زندگی بسر کی، وہ بھی ان کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ کرایے پر تھے۔ انھوں نے اپنا اصلی مکان یا تو میدانِ جنگ کو خیال کیا یا ساری مملکت کو، جس میں دورہ کرتے رہتے اور ساری مملوکہ زمین کے ہر حصے کو اپنا مسکن و مکان تصور کرتے۔ نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی مسرف تھے، عیاشی و فضول خرچی میں بدنام تھے، مگر ان کے لیے بھی صرف ایک سادہ پرانی قطع کا مکان یعنی پنچ محلا کافی تھا۔ حالانکہ انھیں عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بیس لاکھ روپے ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر میں صرف کر دیے اور اس سے زیادہ ہی رقم چوک، مختلف بازاروں، منڈیوں، پلوں اور سراؤں وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کی۔ غرض پہلے تین فرماں رواؤں کا شوقِ تعمیر اگر قلعوں، گڑھیوں کی تعمیر اور فوجی سامان کے فراہم کرنے میں پورا ہوتا تھا، تو آصف الدولہ کا شوق دین داری کی عمارتوں یا نفع رسانیِ خلق اللہ کے کاموں میں۔ اس کے ساتھ، عمارت کا قدیم مذاق بھی اب تک نبھتا چلا جاتا تھا۔ آصف الدولہ کے امام باڑے تک کی عمارتیں قدیم مذاقِ تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہیں۔ دہلی و آگرے میں شاہ جہاں بادشاہ کو اعلا درجے کا سنگِ رخام اور سنگِ سرخ، قریب کی کانوں میں مل گیا تھا جس نے وہاں کی عمارتوں میں خاص قسم کی نفاست اور اعلا درجے کی شان پیدا کر دی۔ لکھنؤ میں پتھر کا ملنا غیر ممکن تھا، اور آگرے اور جے پور سے لانا اس قدر دشوار تھا کہ کسی کو منگوانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ آصف الدولہ نے اینٹ اور چونے سے وہی کام لیا اور ویسی ہی شان دار

دکھادی۔

نواب سعادت علی خاں کو باوجود کفایت شعاری، جزرسی اور روپیا جمع کرنے کی ہوس کے، مکانوں اور عمارتوں کا شوق تھا مگر افسوس، اُن کا یہ شوق کلکتے وغیرہ میں رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتوں کے دیکھنے کی وجہ سے، ایسا غارت ہو گیا تھا کہ اُن کے عہد کی عمارتوں سے وہ پُرانی خصوصیتیں جُدا ہو گئیں۔ اور اُس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا۔

لکھنؤ میں اس انقلابِ تعمیر کا اصلی باعث، کچھ تو تخت نشینی سے پہلے نواب سعادت علی خاں کی غریب الوطنی، خانہ بدوشی اور اقوامِ یورپ سے ملنا جلنا تھا، اور زیادہ تر یہ چیز تھی کہ جنرل مارٹن نے اپنے مذاق کی دو ایک کوٹھیاں یہاں بنوا کے، ایک نئی وضعِ عمارت فرماں رواؤں کے سامنے پیش کر دی، جو بہ لحاظ مضبوطی کے ناقص اور بہ اعتبار ضروریاتِ زندگی کے نہایت ہی دل فریب تھی۔ ان عمارتوں کی حالت بالکل اُن کھلونوں کی سی تھی جو بچوں کے ہاتھ میں دے دیے جاتے ہیں اور روز ٹوٹتے اور نئے خریدے جاتے ہیں ناقدینِ یورپ تنقید کرتے وقت بڑے زور شور سے اعتراض کرتے ہیں کہ آصف الدولہ کے بعد والے فرماں روایانِ لکھنؤ کا مذاقِ عمارت بالکل بگڑ گیا تھا۔ اور ان کی تمام عمارتیں، لڑکوں کے کھلونے یا لڑکیوں کے گھروندے ہیں۔ مگر ادھر توجہ نہیں کرتے کہ یہ مذاق بگاڑا کس نے؟ کہا جاتا ہے کہ یہاں کا قومی مذاق اس لیے بگڑ گیا کہ یہاں در اصل کوئی قوم ہی نہیں تھی، اور اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ یہاں کی قومیت کو بگاڑا کس نے؟ اور کس کی کرشمہ سازیوں نے لوگوں سے اُن کی پُرانی وضع چھُڑادی؟ سچ یہ ہے کہ ع

ای بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست

سعادت علی خاں نے پہلے کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپے پر جنرل مارٹن سے مول لی۔ اسی میں رہنا شروع کیا اور اُس کے متصل اور کئی مکان بنوائے۔ پھر دلہا

قریب ہی، صاحب ریزیڈنٹ کی سکونت کے لیے بیڑھی کوٹھی تعمیر کی جس کے کھنڈر، رزیڈنسی کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے دربار کے لیے انھوں نے لال بارہ دری تعمیر کرائی جس میں اب کتب خانہ ہے اور اُن دنوں قصر السلطان کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے علاوہ، دریا پار انھوں نے دل آرام نام ایک نئی کوٹھی تعمیر کی اور اسی سلسلے میں ایک بلند ٹیکرے پر جو اب صدر یعنی لشکر گاہ لکھنؤ کے علاقے میں واقع ہوا ہے، اور جہاں سارے شہر، گرد کے میدانوں اور دریا کا دل کش منظر نظر کے سامنے ہو جاتا ہے، ایک خوب صورت کوٹھی تعمیر کی اور دل کشا اس کا نام رکھا۔ اسی طرح ایک اور کوٹھی تعمیر کی جس کا نام حیات بخش قرار دیا۔ مگر وہ کوٹھی، نواب سعادت علی خاں کے بعد کے فرماں روایانِ اودھ کے استعمال میں نہیں رہی۔ اس میں غدر سے پہلے میجر بینک رہتے تھے اور غدر کے بعد یہ معمول تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے جو معزز یورپین، اودھ کے چیف کمشنر مقرر ہو کے آتے، اسی کوٹھی میں قیام کرتے۔

مذکورۂ بالا کوٹھیوں کے علاوہ نواب ممدوح نے مشہور عمارتیں، منوّر بخش اور خورشید منزل بھی تعمیر کرائیں اور چوپڑ کا اصطبل بھی انھی کی یادگار ہے۔ مگر ان سب عمارتوں کی تعمیر میں پرانی وطنی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی۔ اور یورپ سے آئی ہوئی نئی جدتیں اختیار کی گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس بارۂ خاص میں، لکھنؤ کا کوئی قدیم مکان اُن نئی عالی شان عمارتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو خود دولتِ برطانیہ کے اثر اور اہتمام سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعمیر ہو چکی ہیں، یا روز بہ روز تعمیر ہوتی جاتی ہیں۔ غرض یہی زمانہ ہے جب سے لکھنؤ میں ان قدیم مذاق کی عمارتوں کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخی وقعت رکھتی ہوں اور کسی خاص خوبی کے لحاظ سے سیّاحوں کو اپنی طرف بلاتی ہوں۔

نوّاب سعادت علی خاں نے لکھنؤ کے مغربی حصّے میں ایک بڑا گنج بنوایا اور

اُس کی آبادی اور رونق کے لیے اس قدر اہتمام کیا کہ اُس کے واسطے خاص قوانین وضع کیے گئے اور تاجروں اور دکانداروں کو خاص قسم کے حقوق عطا کیے گئے، اس نے بڑی رونق پائی اور آج تک باوجود ے کہ شہر کی آبادی سے فاصلے پر اور بالکل الگ واقع ہوا ہے، مختلف چیزوں کی سب سے بڑی منڈی ہے اور عالم نگر کا اسٹیشن صرف اِسی کی وجہ سے روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے۔

سعادت گنج کے علاوہ دوسرے بڑے بازار جو نوابِ ممدوح کے عہد میں قائم اور آباد ہوئے، حسبِ ذیل ہیں: رکاب گنج (جو آج لوہے کی سب سے بڑی اور غلّے وغیرہ کی ایک ممتاز منڈی ہے) جنگلی گنج، مقبول گنج، مولوی گنج، گولا گنج اور رستوگی محلہ۔ موتی محل میں جو اصلی اور پرانی عمارت ہے، وہ بھی نوّاب سعادت علی خاں ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ عمارت، موجودہ احاطۂ موتی محل میں شمال کی طرف واقع ہے۔ اس میں نہایت ہی سفید گنبد تھا جس میں کاریگر نے موتی کی سی آب و تاب پیدا کر دی تھی۔

سعادت علی خاں، اودھ کے تمام فرماں رواؤں سے زیادہ بیدار مغز و مدبّر اور اس کے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار، جزرس بلکہ بخیل خیال کیے جاتے ہیں۔ ملک کا انتظام انھوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شائستگی سے کیا اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر ان کو آخر عہد تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا، تو تمام گذشتہ بدنظمیاں اور خرابیاں دور ہو جاتیں اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر لے جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کا دل تاج و تخت اور فرماں روائی و جہاں بانی سے کھٹّا ہو گیا تھا۔ انھی باتوں سے عاجز آکے، انھوں نے آدھے سے زیادہ ملک سرکارِ عظمت مدارِ برطانیہ کے سپرد کر دیا اور سمجھے کہ اب میں اپنے مقبوضہ علاقے میں بے خرخشہ و بے تردّد حکومت کر سکوں گا۔ مگر افسوس کہ اب بھی اُن کو اطمینان اور چین نصیب نہ ہوا۔ جو ملک اُن کے قبضے میں چھوڑا گیا تھا، اُس میں بھی جا بہ جا انگریزی فوج

کے کیمپ قایم کیے گئے اور بڑی مقدار، خاص لکھنؤ اور اس کے حوالی میں مقیم ہوئی جس کی سنبھال دشوار تھی۔ اور اس کی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بار پڑ گیا تھا۔ اس کے مقابل، انھیں اپنی بہت سی فوج گھٹا دینی پڑی۔

مگر باوجود ان افکار و تردّدات کے، انھوں نے جو اصلاحیں کیں، بہت کچھ قابلِ تعریف ہیں۔ مگر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بازاروں کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ، اُن کے دربار میں باکمالوں اور قابلِ قدر لوگوں کا اتنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُس وقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبانِ کمال نہ نظر آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اُسی جگہ جمع ہوا کرتے ہیں جہاں کے رئیس معمول سے زیادہ فیّاضی ظاہر کرتے ہوں۔ سعادت علی خاں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، جُزرس اور بخیل تھے مگر اس بخل و کفایت شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُن کی ذاتی قابلیّت، دوسرے باکمالوں کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی اور اسی بات نے اُن کے ہاتھوں سے لائق لوگوں کی بڑی بڑی قدریں کرائیں اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہلِ کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابل آدمی جہاں ہوتا سعادت علی خاں کی قدردانی کی شہرت سنتے ہی اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے، لکھنؤ کا رُخ کرتا اور یہاں آ کے، ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا۔

۱۲۲۹ھ ہجری (۱۸۱۴ء) میں نوّاب سعادت علی خاں نے سفرِ آخرت کیا اور اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر مسندِ حکومت پر رونق افروز ہوئے۔ قیصر باغ کی مربّع عمارت کے اندر نوّاب سعادت علی خاں اور اُن کی بی بی، مرشد زادی کے مقبرے ہیں۔ ان دونوں مقبروں کی جگہ ایک مکان تھا جس میں نوّاب غازی الدین حیدر ایّامِ ولی عہدی میں رہا کرتے تھے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی جب وہ ایوانِ شہریاری میں گئے تو کہا: "میں نے والد کا گھر لیا تو ضرور ہے کہ اپنا مکان اُنھیں رہنے کو دے دوں۔" اس خیال کے مطابق مرحوم کو اپنے گھر میں دفن کرایا اور پُرانا مکان منہدم کرا کے، یہ مقبرے تعمیر کرا دیے۔

اب غازی الدین حیدر کے عہد میں نہ باپ کی سی بیدار مغزی اور دولت کی قدر

تھی اور نہ اگلے فرماں رواؤں کی سی فوجی سرگرمی۔ ہاں آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی۔ مگر اس میں یہ فرق آگیا تھا کہ آصف الدولہ کا اسراف بھی ملک و ملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی۔

غازی الدین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کروڑوں روپے کا نقد خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق کے پورا ہونے میں نہایت ہی دریا دلی سے اڑنے لگا۔ موتی محل میں، ہم کہہ آئے ہیں کہ شمالی جانب سعادت علی خاں نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی، غازی الدین حیدر نے اُس احاطے میں دو اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں، جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیے گئے۔ شاہ منزل کے پاس ہی کشتیوں کا ایک پل تھا اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف ہٹی ہوئی تھی۔ شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمنا تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا اور اس میں میلوں تک نزہت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا۔ اس میں اکثر مست ہاتھی، گینڈے، اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ، اس پادشاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہو کے، ان کی لڑائی کا تماشا ملاحظہ فرماتے۔ شیروں کی لڑائی بھی وہیں ہوتی جس کے لیے مضبوط کٹہرے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا۔ مگر جو چھوٹے غیر آزار رساں جانور لڑائے جاتے، اُن کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطے میں اسی پار ہوتی۔

یہ درندوں اور وحشی جانوروں کے لڑانے کا شوق، ہندوستان میں یہاں سے پہلے اور کہیں نہیں سنا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رزیڈنٹوں اور دربار رس اہل یورپ سے رومیوں کے ایمفی تھیٹر کے حالات سن کے، جہاں پناہ کے دل میں شوق پیدا ہوا۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے توجہ دلانے سے ہمیں معلوم ہوا کہ درندوں کی لڑائی کا رواج، دولتِ مغلیہ کے عہد سے ہے۔

غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یورپین بی بی کے لیے ولایتی محل بنوایا اور اس کا نام ولایتی باغ قرار دیا۔ وہاں سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تیار کرائی۔ غازی الدین حیدر

کی آرزو کے موافق، دربارِ انگریزی سے انھیں بادشاہی کا لقب عطا کیا گیا۔ اس سے پیش تر فرماں روایانِ اودھ، وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے اور سوا نواب کے، اور کسی اعزازی لقب سے نہیں یاد کیے جاتے تھے۔ اس زمانے تک ہندوستان میں شہنشاہیِ مغلیہ کی اتنی آن باقی تھی کہ اگرچہ ملک، خود مختار و خود سر حکم رانوں میں بٹ گیا تھا اور شہنشاہِ دہلی کے قبضے میں صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی، لیکن اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ و جہاں پناہ وہی تھے۔ نہ سریر آرایانِ دہلی کے سوا ہندوستان میں کسی کو "بادشاہ" کہلانے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا۔ اُن کے اس غرور کو توڑنے کے لیے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو، جنھوں نے باپ کے اندوختے میں سے بہت سا روپیا انگریزوں کو قرض دے دیا تھا، شاہی کا خطاب دیا اور دربارِ اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ اُس وقت سے حکم رانانِ اودھ، جو ریزیڈنٹوں کے ہاتھوں کے کھلونے تھے، بادشاہ بن گئے اور آخری فرماں روا واجد علی شاہ کے مرنے تک اُن کا سرمایۂ ناز رہے۔

غازی الدین حیدر نے اِسی خطابِ شاہی کی یادگار میں، دریا پار چھتّی بھون کے سامنے ایک نیا بازار بسایا اور اس کا نام بادشاہ گنج رکھا۔ اسی زمانے میں حکیم مہدی نے مہدی گنج آباد کیا۔ اور نائب السلطنت آغا میر کی شاہانہ عمارت کے دور تک پھیل جانے کی وجہ سے، عین وسطِ شہر میں محلہ آغا میر کی ڈیوڑھی قائم ہوا۔ اور اسی عہد میں آغا میر کی سرائے تعمیر ہوئی۔

بادشاہ کو اور اُن سے زیادہ بادشاہ بیگم کو مذہبی معاملات میں بہت زیادہ انہماک تھا۔ صفویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ مگر ہندوستان کے عام مسلمان سُنّی تھے۔ نواب برہان الملک چوں کہ ولایت سے نئے آئے تھے، اس لیے اُن کا اور اُن کے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا۔ باوجود اس کے، زمانے

تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغازِ سلطنتِ اسلام سے دیگر بلادِ ہند اور سارے ملک کا تھا۔ مگر اس وقت سے بادشاہ اور اُن کے خاص محل کے انہماکِ مذہبی کی وجہ سے شیعیت، حکومتِ لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی۔ فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکم رانوں کی توجہ ہٹ گئی اور خاندانِ اجتہاد عروج پاکے، سلطنت کا اصلی مقنن قرار پایا۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں، بلکہ لکھنؤ کی شیعیت، ساری دنیا کی شیعیت سے نئی، نرالی اور عجیب ہوگئی۔

سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امام ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جائے، تو مضائقہ نہ تھا مگر نہیں، یہاں ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچاخانہ مرتب کیا جاتا۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوب صورت لڑکیاں لے کے، ائمۂ اثنا عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں، جن کا نام "اچھوتیاں" رکھا گیا۔ اور جب وہ اماموں کی بیبیاں تھیں، تو پھر اُن کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی اور بارھوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کرّوفر کے ساتھ منائی جانے لگیں۔

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضب ناک اور آشفتہ مزاج بادشاہ تھے اور رعب داب اس بلا کا تھا کہ اُن کے زمانے میں انگریزوں سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا، دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولی عہدِ سلطنت تک اُس کے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غازی الدین حیدر اُسے گھونسوں اور لاتوں سے

مارتے۔ جس نار کو وہ خوشی سے کھالیتا۔ مگر اُس کا بدلا دیگر معززینِ دربار اور اعزائے شاہی تک سے لے لیا کرتا۔

اِس سے پہلے بادشاہِ اودھ نے مذہبی ارادت وعقیدت سے، دریا کنارے اور موتی محل کے متصل، نجفِ اشرف یعنی روضۂ مطہرۂ حضرت علیؑ کی نقل لکھنؤ میں بنوائی اور اس کی روشنی وخدمت کے لیے بہت سا روپیا سرکارِ انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ یا رونق اور خوب آباد ہے۔ اور ۱۲۴۳ھ محمدی (۱۸۲۷ء) میں جب اُن کا انتقال ہوا تو اُسی میں دفن ہوئے۔

(۶)

۱۲۴۳ھ محمدی (۱۸۲۷ء) میں غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، فرماں روایانِ اودھ، نواب نہیں، بادشاہ تھے۔ اِس دولت کا آغاز وزارتِ دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست وذی وقعت فرماں روا سب نواب وزیر کہلاتے تھے لیکن اب جب کہ اصلی حکومت وسطوت رُخصت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پالٹکس میں اُن لوگوں کا بالکل اثر نہیں باقی رہا تھا، یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جاسکتا ہے کہ انگریزوں نے حکم رانانِ اودھ کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے اُن کی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی اور انھیں نام ہی کا بادشاہ نہیں، بلکہ حقیقۃً بادشاہ بنا کے دکھا دیا ہوگا لیکن نہیں، ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس عہد میں اودھ کے باہر اِن لوگوں کا اثر تو بالکل تھا ہی نہیں۔ خود اپنی قلم رو میں بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ اُن کے ماسبق بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزوں کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلم رو میں جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیڈنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہ ہو سکتا تھا۔ سریرِ شہریاری

ایک اسٹیج تھا جس پر جو کچھ ہوتا بہ ظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہیں، مگر اصل میں وہ افعال کسی اور شخص کے قبضۂ قدرت میں تھے جو پردے کی آڑ میں تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکم رانانِ اودھ کی اور ان کے ساتھ قریب قریب سارے وابستگانِ دامنِ دولت کی حس مفقود ہو گئی تھی، جس کی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بنتے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے اور نصیر الدین حیدر کو تو تختِ شاہی ورثے میں ملا تھا۔ نواب سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا روپیا عیش پرستی میں دونوں کا ممد و معاون ہوا۔ کچھ انگریزوں کو قرض دیا گیا۔ کچھ اُن بتدعہ مذہبی رسموں کی بجا آوری میں صرف ہوا جنھیں بادشاہ اور ان کی ملکاؤں نے اپنے مذاق کے موافق ذوق و شوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی، فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجفِ اشرف کی نقل بنوا کے اپنی قبر کا ٹھکانا کر لیا۔ اور بغیر اس کے کہ اپنے وَرَثہ پر بھروسا کریں کچھ روپیا انگریزوں کے حوالے کیا کہ اس کے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ نجف کی داشت کیا کریں۔ چنانچہ آج تک اُن کی قبر پر چراغ روشن ہوتا ہے، مجلسیں ہوتی ہیں، قرآن خوانی ہوتی ہے، اور محرم میں خوب روشنی ہوتی ہے، جس کے طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔ مگر نصیر الدین حیدر کو ہجومِ عیش میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلہ ارادت نگر میں انھوں نے ایک کربلا بنوائی جو خود اُن کا مرقد قرار پانے والی تھی مگر اس کی خدمت و داشت کی ذرا بھی فکر نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ڈالی گنج کے اسٹیشن کے پاس اُجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں۔ اُن کے زمانے میں نئے محلے گنیش گنج اور چاند گنج وہیں دریا پار آباد ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی، جس نے علم ہیأت کی طرف توجہ دلائی۔ اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر میں ایک اعلا درجے کی رصد گاہ قائم کریں۔ چنانچہ اِسی

غرض کے لیے ایک کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان میں تعمیر کرائی، جو رصدگاہ ہونے کے باعث لکھنؤ میں تارے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بڑی بڑی دوربینیں اور اعلا درجے کے آلاتِ رصد جمع کیے گئے ان کے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور ان کا انتظام و اہتمام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیأت داں تھے مگر لکھنؤ کی یہ رصدگاہ گویا کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی کا ایک مجہول الحال واقعہ تھی۔ کیونکہ ۱۲۵۶ھ محمدی سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا جس کے چار پانچ سال بعد غالباً یہ رصدگاہ قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُس وقت سے ۱۲۷۲ھ محمدی (۱۸۴۷ء) تک جب کہ آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، یہ رصدگاہ انھی کے اہتمام میں رہی۔ سنہ مذکور میں کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور اُن کی جگہ کوئی ہیأت داں اس خدمت پر مقرر نہیں کیا گیا۔ واجد علی شاہ نے اس کی طرف سے بے پروائی کی۔ لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونا خیال کر کے، حیدری طوائف کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزیٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصدگاہ، انتزاعِ سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ غدر میں غالباً بلوائیوں نے اُسے تباہ کر دیا۔ کیونکہ احمد اللہ شاہ نے (جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے اور انگریزی فوج سے بڑی مستعدی و گرم جوشی کے ساتھ لڑے تھے) تارے والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی، اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا اور باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اُسی زمانے میں روشن الدولہ نے، جو وزیر سلطنت تھے، اپنی خوبصورت اور شان دار کوٹھی تعمیر کرائی۔ جس میں فی الحال ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس کرتے ہیں۔ اس لیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو، قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا۔ اور جب ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا ہے، یہ کوٹھی ایک سرکاری جایداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ، سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظامِ مملکت کی خرابی تھی۔ بادشاہ کو عیش و عشرت اور ایجاد کردہ دین داری کی رسموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا انتظامِ سلطنت وزیر پر چھوڑا جاتا تھا اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے۔ حکیم مہدی بلائے گئے۔ وہ منتظم تو اعلا درجے کے تھے، مگر چاہتے تھے کہ سلطنت کو اپنی ہی میراث بنالیں۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے۔ اُن میں نہ مادّہ تھا نہ طبیعت داری، اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیوں کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا سارا روپیا پانی کی طرح اُڑ گیا اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ بادشاہ اور اُن کی ماں، غازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ وہ منّا جان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھیں اور بادشاہ اس کو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتوں نے ملک کی ایسی حالت کردی تھی کہ معلوم ہوتا حکمرانوں میں حکومت کرنے اور ملک کے سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

صاحب رزیڈنٹ اور گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا، ڈرایا، دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا اور برابر کان کھولتے رہے۔ مگر یہاں کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ نصیر الدین حیدر میں، عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہوگئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کردی کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بیبیاں (اچھوتیاں) اور اُن کی ولادت کی تقریبیں، جو اُن کی ماں نے قائم کی تھیں، اُن کو اور زیادہ ترقی دی یہاں تک کہ ولادتِ ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچا خانے میں بیٹھتے، چہرے اور حرکات سے وضعِ حمل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچّہ جنتے جس کے لیے

ولادت، چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھی سے فرصت نہ ملتی۔ سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربارِ اودھ اور سرکارِ انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور ریزیڈنٹوں کی نظرِ عنایت نہ ہوتی اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نگراں تھا، کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا، تو انتزاعِ سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہوگئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی۔ انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کرکے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ظالم بھی تھے۔ لیکن چوں کہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوتی تھی، اس لیے اُن کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں۔ بیسیوں عورتوں کو ادنا قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چُنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا، فوراً عورت کی چھاتیاں اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیوں کے بعد جب کہ اندر باہر کے تمام اہلِ دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے، بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار بنے اور کسی نے زہر دے کے ۱۲۶۶ محمدی (۱۸۳۷ء) میں قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین حیدر لاولد مرے تھے۔ منّا جان کو غازی الدین حیدر کی بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارثِ سلطنت بنا کے پیش کیا۔ مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے اُن کے نسلِ شاہی ہونے سے انکار کیا تھا۔ اِسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نوّاب سعادت علی خاں مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خاں کی تخت نشینی کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ منّا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ میں آگئیں۔ ریزیڈنٹ نے ہزار

روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سُنی اور زبردستی منا جان کو تخت پر بٹھا دیا جنھوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی، نذریں لیں، اور اپنے دشمنوں سے فوراً بدلا لینا بھی شروع کر دیا بہتوں کے گھر لٹوائے بعض کو گرفتار کر لیا بعض قتل ہوئے، اور شہر میں ایک بڑا ہونگ مچ گیا۔

صاحب رزیڈنٹ اور اور ان کے اسسٹنٹ فوراً دربار میں پہنچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ منا جان وارثِ سلطنت نہیں ہو سکتے اور اس میں آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا: بہتر یہی ہے کہ منا جان تخت کو خالی کر دیں اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آجائے مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے منڈیاؤں سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بلوالی تھی اور اُس نے تخت گاہ کے سامنے توپیں لگا دی تھیں اور سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحبِ عالی شان نے گھڑی ہاتھ میں لی اور کہا: دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہے، اس زمانے کے اندر اگر منا جان تخت سے نہ اتر گئے تو جبریہ کارروائی کی جائے گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا۔ حالاں کہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہیں، اب دو ہی منٹ رہ گئے، اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہیں۔

ان تنبیہوں کا کسی نے خیال نہ کیا اور یکایک توپوں نے گرابیں مارنا شروع کیں آناً فاناً میں تیس چالیس آدمی گر گئے۔ درباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جھاڑ فانوس جڑا کر رہا تھا، اس میں سے بھی کئی آدمی زخمی ہوئے شیشہ آلات جھنا جھن ٹوٹ کے گرنے لگے جب کئی وفادار بہادر جو سینہ سپر تھے، مارے جا چکے تو منا جان نے بھی تخت سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا، مگر پکڑ لیے گئے۔ غرض بیگم صاحب اور انھیں، دونوں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہِ اودھ قرار پائے۔ اور منا جان اور ان کی دادی

سخت حراست میں لکھنؤ سے کان پور اور کان پور سے قلعہ چنار گڑھ میں بھیج دیے گئے۔ اور دو ہزار چار سو روپے ماہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ترسٹھ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربے کار تھے۔ زمانے کے سرد گرم اور دربار کی طفلانہ مزاجیاں دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خاں کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شعاری کے اصول جاری کیے اور جہاں تک بنا انتظام کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ آ چکی تھی اور قوا جواب دیتے جاتے تھے تخت پر بیٹھتے ہی انھوں نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلوا کے خلعتِ وزارت دیا مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے۔ تب ظہیر الدولہ کو خلعتِ وزارت ہوا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے اور منور الدولہ وزیر قرار پائے۔ جنھوں نے دو چار مہینے کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلائے معلّا چلے گئے۔ پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خاں وزیر قرار پائے جو اوروں کے دیکھتے، ذی ہوش اور متین تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹِ انگریزی اور سلطنتِ اودھ میں ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے، سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی اس میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمروِ اودھ یا اس کے جس علاقے میں بدنظمی دیکھے، اُسے جب تک چاہے، اپنے زیرِ انتظام رکھے، بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کیے اور جہاں تک بنا، ملک کی اصلاح کرنے لگے۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس انھوں نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اُس کے قریب ایک عالی شان مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق اور وسعت میں بڑھ جائے۔

اُن دنوں لکھنؤ کی آبادی و رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے آدمی اُس کے سواد میں آباد تھے کہ اسے ہندوستان کا بابل کہنا بے جا نہ تھا۔ واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا۔

اِس مشابہت کو شاید انگریزوں یا کسی اور درباری سے سُن کے، محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دیں اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دیں جو اُن کے نام کو تمام شاہانِ اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔ انھوں نے بابل کے بینار یا وہاں کے ہوائی باغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد سے قریب اور موجودہ گھنٹا گھر کے پاس تعمیر کرانا شروع کی، جس میں محرابوں کے مدّور حلقے پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقے پر تیسرا حلقہ، غرض یوں ہی تلے اوپر قائم ہوتے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ یوں ہی سات منزلوں تک اُسے بلند کر کے، ایک اتنا بڑا اور اونچا بُرج بنا دیا جائے جو دنیا بھر میں لاجواب ہو اور اس کے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اس کے گرد کی فضا نظر آئے۔ یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لاجواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا نام "ست کھنڈا" قرار دیا گیا تھا اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر پانچ ہی منزلیں بننے پائی تھیں کہ محمد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ محمدی (۱۸۴۲ء) میں سفرِ آخرت کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے میں بغیر اس کے کہ اندرونی جھگڑے پیدا ہوں، یا ملک میں بدنظمی کی فریاد بلند ہو، لکھنؤ کو نہایت ہی خوب صورت شہر بنا دیا۔ حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کے کنارے کنارے ایک سڑک نکالی جو چوک کہلاتی تھی۔ اس سڑک پر بانی موجود دو طرفہ عالی شان مکانوں کے، ایک طرف رومی دروازہ، آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف ست کھنڈا اور حسین آباد کا پھاٹک تھا۔ اِس نئے امام باڑے کی مختلف سر بہ فلک عمارتیں تھیں اور ان کے پہلو میں جامع مسجد واقع تھی۔ اِن سب عمارتوں نے مل کے دونوں جانب ایک ایسا خوش نما اور نظر فریب منظر

پیدا کردیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان میں باشندگانِ شہر کے جتنے مکانات واقع تھے، سب کھد گئے، مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصور کیا جاتا ہے۔

(۷)

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اریکہ آرائے سریرِ شہریاری ہوئے۔ محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولی عہدِ سلطنت کی تعلیم اعلا درجے کی ہو۔ چنانچہ انھیں علما و فضلا کی صحبت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بہ جائے اس کے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں ترقی کریں، اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ تھا، یہ تھا کہ وہ اور ان کے ساتھ ساری رعایا، جنابِ قبلہ و کعبہ کی حلقہ بگوشِ ارادت بن جائے لیکن ظاہر ہے کہ علمائے دین و مقتدایانِ ملّت کو پالٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ مدبّرِ سلطنت ہو سکتے ہیں نہ اسٹیٹسمین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی تھی، یہ تھی کہ سیّدوں کی خدمت گزاری کی جائے اور سلطنت کا روپیا، مومنین کی اعانت و دست گیری میں صرف ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کیش اور محتاط پرہیزگار فرماں روا اور امجد علی شاہ کی نظر میں اُسی وقت قابلِ اطمینان ہو سکتا تھا جب خود مجتہدُ العصر کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے۔ چنانچہ ملک کی آمدنی میں سے لاکھوں روپیا زکوٰۃ کے نام سے ان کی نذر کیا جاتا اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقمیں انھی کے ہاتھ میں جاتیں۔

امجد علی شاہ کے لیے تقوے طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھیں اپنے خیال کی پابندیِ شرع سے اِتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسقِ مملکت کی طرف توجہ کریں۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے، سب درہم و برہم ہو گئے، اور یہ حالت ہو گئی کہ قاضی محمد صادق خاں اختر کے

بیان کے مطابق: "تمام عمّال بدکار و بدباطن اور خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا۔ ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی اور جو فتنے پیدا ہوتے، کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے۔"

لیکن اس اتقا کی خاموشی اور تمدّنی غفلت و بے پروائی پر بھی انھوں نے محلہ حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ میں تمام محلّوں سے زیادہ صاف ستھرا، خوب آباد، نہایت خوب صورت، دولت مند تاجروں کا اعلاترین بازار ہے اور سول لائن کا سب سے زیادہ بارونق حصہ ہے۔ انھوں نے لکھنؤ سے کان پور تک براہِ راست ایک پختہ سڑک بنوائی۔ اُن کے عہد میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ لوہے کے پُل کی عمارت بن کے تیار ہوگئی۔ اس پُل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے اجزا اور پُرزے، غازی الدین حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے مگر وہ پُرزے جب تک لکھنؤ میں پہنچیں، بادشاہ رہ گرائے عالمِ جاوداں ہو چکے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب وہ پُرزے ولایت سے آئے تو اُنھوں نے اپنے دربار کے انجنیر، مسٹر سنکلیر کو اُن پرزوں کے جوڑنے اور پُل کو بنا کے کھڑا کر دینے کا ٹھیکا دیا۔ اور حکم دیا کہ وہ پرزے، رزیڈنسی کے سامنے پار دریا کے کنارے ڈال دیے جائیں۔ جس مقام پر پُل کے یہ آہنی پُرزے ڈالے گئے تھے، اس جگہ کا پتا دینے کے لیے آج وہیں ایک گھاٹ اور شوالا قائم ہے۔ مسٹر سنکلیر نے دریا کے اندر ستون قائم کرنے کے لیے گہرے کنویں کھدوائے اور ستونوں کی جُڑائی بھی کرلائے مگر اس کے بعد اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پُل کی تکمیل میں ناکامی ہوئی۔ محمد علی شاہ کے زمانے میں یہ پُل ناتمام پڑا رہا۔ مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد میں اس کی جانب توجہ کی اور پُل بن کے تیار ہوگیا۔ لیکن جو لوہے کا پُل آج کل قائم ہے، وہ امجد علی شاہ کے زمانے کا پل نہیں ہے، وہ ایک ہینگنگ بریج یعنی لٹکنے والا پل تھا جس کا سارا بار چار بلند اور زبردست آہنی کھمبوں پر لٹک رہا تھا۔ انگریزی زمانے میں جب اس کے پرزے زنگ آلود ہو کے کم زور ہوتے اور اُس پر

عام آمد و رفت میں خطرہ نظر آیا تو اُسے منہدم کرا کے اس کی جگہ دوسرا آہنی پل قائم کیا گیا اور وہی پل اِس وقت موجود ہے۔

امجد علی شاہ ہی کے زمانے میں اُن کے وزیر، امین الدولہ نے امین آباد آباد کیا جس کی آبادی و رونق آج کل روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ امجد علی شاہ نے اپنے زمانے میں اگرچہ کچھ نہیں کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت بنوائی جو آج کل اُن کی یادگار ہو، مگر شاید اپنے اتقاو پرہیز گاری کے صلے میں انھیں یہ قدرتی نام وری حاصل ہو گئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے دو سب سے زیادہ مشہور، سب سے زیادہ آباد، سب سے زیادہ بارونق اور سب سے زیادہ دولت مند محلے: امین آباد اور حضرت گنج، انھیں کے عہد کی یادگار ہیں۔

آخر زمانے نے اُن کے دور کا ورق بھی الٹا اور ۱۲۶۳ھ محمدی (۱۸۴۷ء) میں جب کہ عمر اڑتالیس برس سے کچھ ہی دن زیادہ تھی، مرضِ سرطان میں مبتلا ہو کے دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے آباد کیے ہوئے محلے حضرت گنج میں بینڈو خاں رسال دار کی چھاونی کے اندر دفن ہوئے۔ ان کا امام باڑہ جس میں وہ مدفون ہیں حضرت گنج کے مغربی حصے میں لبِ سڑک موجود ہے، جس کی عمارت اُن کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیا صرف کر کے بنوائی تھی، یہ امام باڑہ حسین آباد کی ایک ناقص نقل ہے۔ اور اگر حسین آباد کی طرح اس میں بھی روشنی ہوتی تو محرم میں لکھنؤ کا مشرقی حصہ بھی عالمِ نور بن جایا کرتا۔ اگرچہ اس کے لیے کوئی وثیقہ نہیں معین ہے، لیکن اس کی آمدنی بھی کم نہیں۔ احاطے کی عمارت کے بیرونی رخ کی دکانوں میں، بہت سے اچھے اچھے تاجروں کی دکانیں ہیں اور اندرونی عمارتوں میں بہت سے یوریشین وغیرہ رہتے ہیں، جن سے کرایے کی معتدبہ رقم وصول ہوتی ہے۔ مگر کرایہ وصول کرنے والوں کا یہ بھی احسان ہے جو محرم میں خاص قبر اور امام باڑے میں چند چراغ روشن کر دیا کرتے ہیں۔

اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے، واجد علی شاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز

ہوئے۔ اُن کا زمانہ اِس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیۂ پاستان کا آخری بند ہے۔ چوں کہ انتزاعِ سلطنت انھی کے عہد میں ہوا، اس لیے تمام اہل الرّائے کے ہدفِ سہام اور نشانۂ ملامت وہی بن گئے۔ اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوالِ سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں اُن کی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے، اُن دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں اور بُری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اُلٹا؟ جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں۔ دہلی میں مغل شہنشاہی کا اور بنگالہ میں نواب ناظمِ بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا؟ حالاں کہ ان میں اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اریکہ آرائے سلطنت میں بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واجد علی شاہ نہ تھا۔ حالاں کہ ان کی تباہی، لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔

اصل یہ ہے کہ اُس عہد میں اِدھر اہلِ ہند کی غفلت اور جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہنچ گیا تھا اور اُدھر دولتِ برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی، قابلیت، جفاکشی، اپنی کوششوں اور اپنی اعلا تہذیب و شائستگی کا ثمرہ پانے کی روز بہ روز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ دانایانِ فرنگ کی ذہانت و طبّاعی، خوش تدبیری و باضابطگی، ہندوستان کی جہالت و خود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ نہ دے گا، مٹ جائے گا۔ زمانے کے اس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی اور سب مٹ گئے۔ انھی مٹنے والوں میں، اودھ کی سلطنت بھی تھی، جس کے زوال کا بارِ غریب واجد علی شاہ پر ڈال دینا محققانہ مذاق کے خلاف ہے۔

پابندِ شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علما کی صحبت میں رکھ کے اپنا سا بنانا

چاہا تھا، اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی، جو اقتضائے عمر کے ساتھ زیادہ کھلتا گیا مگر امجد علی شاہ کا اس میں کچھ زور نہ چلا کہ وارثِ سلطنت فرزند کا فطری رجحان عیّاشی اور فنونِ طرب ونشاط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ کی تاکید سے پڑھنے لکھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی، لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا۔ ولی عہدی ہی میں اپنے ذاتی شوق سے اُنھوں نے باپ کے منشا کے خلاف، گویّوں اور ڈھاریوں کو اپنی صحبت میں رکھا۔ گانا بجانا سیکھا۔ آوارہ عورتوں اور ڈوم ڈھاریوں سے ربط وضبط بڑھایا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جو لطف انھیں حسین عورتوں اور گویّوں کی صحبت میں آتا، علمی مذاق کی مہذب صحبتوں میں نہ آتا۔ باپ کے خلاف، انھیں عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اور ولی عہدی ہی میں انھوں نے خاص اپنی محفلِ طرب اور عیش کے لیے ایک پرفضا باغ اور اس میں دو ایک مختصر خوب صورت اور پُرتکلف مکان بنوا لیے۔ علی نقی خاں، جنھیں تخت پر بیٹھتے ہی خلعتِ وزارت عطا کیا، ان سے زمانۂ ولی عہدی میں ایک رنڈی کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ اُن کی جوانانہ شوخ مزاجی نے، مزاج میں درخور پیدا کیا اور جب مذکورۂ بالا باغ اور عمارت اُن کے اہتمام میں تعمیر ہو کے پسند آئے تو سمجھ لیا گیا کہ وزارت اور انتظامِ مملکت کے لیے اُن سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہیں ہے۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان بانکے بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاحِ فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری میں آگے آگے دو نقرئی صندوق چلتے، جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی، عرضی لکھ کے ان میں ڈال دیتا، کُنجی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل میں پہنچ کے حضور اُن عرضیوں کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اس طرح کئی نئے رسالے اور کئی پلٹنیں بھرتی ہوئیں رسالوں کے نام بادشاہ نے اپنی منشیانہ طبّاعی سے بانکا، ترچھا، گھنگھور، رکھے۔ اور پلٹنوں کے نام اختری، نادری رکھے گئے۔ خود بہ دولت بنفسِ نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور

گھنٹوں دھوپ میں کھڑے ہوکے۔ اُن کی قواعد اور فنونِ جنگ میں ان کی مشّاقی دیکھتے اور خوش ہو ہوکے، باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرّر کیے "راست رو، پس بیا، دستِ چپ بگرد"۔ چند بانکی جوان حسین عورتوں کی ایک چھوٹی سی زنانی فوج مرتّب کی گئی اور اُن کو بھی اُنھی اصطلاحوں میں قواعد سکھائی گئی۔

مگر جدید عہد کا یہ نقشِ اوّلین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ طبیعت اِن چیزوں سے اکتا گئی۔ زمانۂ ولی عہدی کا وہی پرانا مذاق پھر عود کر آیا۔ حسین اور آوارہ عورتوں سے صحبت بڑھی، اربابِ نشاط کا بازار گرم ہوا اور تھوڑے ہی دنوں میں ڈوم ڈھاری ہی ارکانِ دولت اور معززینِ سلطنت تھے۔ بادشاہ کے دل میں اب اگر کوئی علمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی۔ کیوں کہ خود شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔

لکھنؤ میں اُن دنوں شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ میں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو اُن کی تعداد لکھنو کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی۔ میر اور سودا کی پرانی شاعری، تقویمِ پارینہ ہو چکی تھی۔ اب ناسخ کی زبان اور آتش کے خیالات دماغوں میں بسے ہوئے تھے، جن میں رند و صبا کے رندانہ کلام اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے شہوت پرستیوں کی روح پھونک دی تھی۔ اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔

اسلامی شاعری کا رنگ، خلافتِ اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اس کا نام لے لے کے اُس کے حسن کی خوبیوں اور اس کی اداؤں کی دل فریبیوں کو بیان کرتے، اور اس کی طرف خطاب کر کر کے، اپنی بے تابیوں اور بے قراریوں کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھُپ چھُپ کے اس

سے ملتے مگر تہذیب وعفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی میں معشوق گم نام ہوگیا۔ اور عموماً شعرا کا معشوق، ان کے خیال کا ایک پُتلا بن گیا جسے رند مشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خوب رُو لڑکا بتاتے مگر صوفی تھوڑی سی معنوی تاویل کرکے، اسے اپنا حسینِ مطلق یعنی خلاقِ عالم بتادیتے۔ یہی سمویا ہوا چھپا ڈھکا مذاقِ رندی فارسی شاعری میں رہا۔ اور یہی مذاق اس وقت تک اردو شاعری کا بھی تھا، مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتوں پر عاشق ہوکے، ان کے خراب کرنے کا آلہ بنایا۔ اور قیامت یہ تھی کہ اُن کی مثنویوں کی زبان ایسی خوب صورت، بے تکلف اور شستہ ورفتہ تھی اور اُن میں عاشقانہ جذبات اس کثرت سے بھر دیے گئے تھے کہ مہذب وشائستہ لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لیے نہ رہا جاتا۔

واجد علی شاہ نے بھی ان مثنویوں کو دیکھا اور چوں کہ ماشاءاللہ خود شاعر تھے اس رنگ کو اختیار کرکے، اپنے بہت سے عشقوں اور اپنی عنفوانِ شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزوں کرکے، ملک میں پھیلا دیا اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ تو بادشاہ، وزرا و امرا میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے گزرے ہوں گے جنھوں نے عنفوانِ شباب میں اپنی شہوت پرستی کی ہوسوں کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو۔ مگر واجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ واجد علی شاہ زور میں آئے تو چاہے شاعری میں نہ بڑھ سکیں، مگر اپنے جذبات وخیالات اور اپنے کارناموں کو عالم آشکارا کرنے میں، نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انھیں مبتذل، بازاری مذاق اور فحش الفاظ کے استعمال میں بھی تامل نہیں ہوتا۔

وہ کہاریوں، رنڈیوں، خواصوں، محل میں آنے جانے والی عورتوں، غرض صدہا عورتوں پر عاشق ہوئے۔ اور چوں کہ ولی عہدِ سلطنت تھے، اپنے عشق میں خوب

کام یاب ہوئے۔ جن کی شرم ناک داستانیں، اُن کی نظموں، تحریروں اور تصنیفوں میں، خود ان کی زبان سے سُن لی جا سکتی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخ میں اُن کا کیرکٹر سب سے زیادہ ناپاک اور تاریک نظر آتا ہے۔

چوں کہ عمارت کا بے حد شوق تھا، اس لیے تخت نشین ہوتے ہی، قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کر دی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عمارتوں کی طرح مضبوط نہ ہو، مگر خوب صورتی اور شان داری میں لاجواب ہے۔ اس میں بہت سی خوش نما اور با شان و شوکت دو منزلی عمارتوں کا ایک مربع مستطیل رقبہ دور تک چلا گیا تھا۔ جس کا ایک رخ جو دریا کی جانب تھا، غدر کے بعد کھود ڈالا گیا۔ اور تین ضلعے اب تک قائم ہیں، جن کو مختلف قطعات پر بانٹ کے، گورنمنٹ نے تعلقدارانِ اودھ کے حوالے کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اُن میں رہیں اور ان کو اُسی وضع میں قائم و برقرار رکھیں۔

قیصر باغ کا اندرونی صحن جس میں چمن بندی تھی، جلو خانہ کہلاتا تھا۔ درمیان میں بارہ دری تھی، جو آج کل لکھنؤ کا ٹاؤن ہال ہے۔ اس میں اور کئی عمارتیں بھی تھیں جو اب نہیں باقی ہیں۔ اس کے باہر یہاں سے متصل ہی بہت سی شاہی عمارتیں تھیں جنھوں نے اس قطعۂ زمین کو اعجوبۂ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتیں، قیصر باغ کے مشرقی پھاٹک کے باہر تھیں۔ لوگوں کو اس پھاٹک سے نکلتے ہی، دونوں جانب چوبی اسکرینیں ملتی تھیں، جن میں سے گزر کے وہ چینی باغ میں پہنچتے۔ وہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف مڑ کر، آپ جل پریوں کے ایک عالی شان پھاٹک پر پہنچتے جس پر مدارالمہام سلطنت نواب علی نقی خاں کا قیام رہتا تھا، تاکہ ہر وقت جہاں پناہ سے قریب رہیں اور بہ وقتِ ضرورت فوراً بلا لیے جا سکیں۔ اس پھاٹک کے اُس طرف حضرت باغ تھا۔ اور ذرا اندر ہی داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چونے کی عمارت تھی۔ مگر چھت میں چاندی کے پتر جڑے ہونے کی وجہ سے، چاندی والی بارہ دری کہلاتی۔ اسی سے ملحق ٹکوٹھی خاص مقام

تھی جس میں خود جہاں پناہ سلامت رہتے۔ اور وہیں نوّاب سعادت علی خاں کی بنائی ہوئی پُرانی کوٹھی، بادشاہ منزل تھی۔

پھر ان چوبی اسکرینوں کے گلیارے سے نکل کے دوسری طرف مُڑیے تو پیچیدہ عمارتوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا تھا، جو چولکھی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان عمارتوں کا بانی، حضوری نائی، عظیم اللہ تھا جنھیں بادشاہ نے چار لاکھ روپے دے کے مول لیا تھا۔ نوّاب خاص محل اور معزّز محلاتِ عالیات اس میں رہتی تھیں۔ اسی کے اندر غدر کے زمانے میں حضرت محل کا قیام رہا۔ اور یہیں اُن کا دربار ہوا کرتا تھا۔

یہاں سے ایک سڑک قیصر باغ کی طرف آئی تھی جس کے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا۔ اس کے نیچے گرداگرد سنگِ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر قیصر باغ کے میلوں کے زمانے میں، جہاں پناہ جوگی بن کے گیروے کپڑے پہن کے آتے اور دھونی رما کے بیٹھتے۔ اس چبوترے سے آگے بڑھ کے ایک عالی شان پھاٹک تھا جو لکھی پھاٹک کہلاتا، اس لیے کہ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ اور اس سے بڑھ کے آپ پھر قیصر باغ میں آجاتے۔ قیصر باغ کی عمارت میں سلطنت کے اسّی لاکھ صرف ہوئے تھے۔ اور اُس کے چاروں طرف کی عمارتوں میں جہاں پناہ کی بیگمیں اور پری جمال و ماہ طلعت خاتونیں رہتیں۔ جن کی جگہ اب عجیب غریب صورتوں کو دیکھ کے، بعض پُرانے زمانے والے کہا اٹھا کرتے ہیں:

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بہ سوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کے باہر، روشن الدّولہ کی کوٹھی تھی۔ اسے واجد علی شاہ نے ضبط کر کے، اس کا نام قیصر پسند رکھ دیا تھا۔ اور اُن کی ایک محبوبہ، نوّاب معشوق محل اس میں رہتی تھیں۔ اب اس میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی عدالت ہے۔ اس کے سامنے

اور قیصر باغ کے اس مغربی پہلو پر بھی ایک دوسرا جلو خانہ تھا۔

سال میں ایک مرتبہ قیصر باغ میں ایک عظیم الشان میلا ہوتا تھا جس میں پبلک کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس، جو ہندوؤں میں مروج ہے، دیکھا تھا۔ اور سری کرشن جی کی معشوقانہ روشِ عاشقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اس رہس سے، ڈراما کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا۔ جس میں خود کنھیا بنتے۔ مخدراتِ عصمت آیات گوپیاں بنتیں اور ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں۔ کبھی جوشِ جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیوں کو جلا کے بھبھوت بنائی جاتی۔ جس کی بدولت فقیری میں بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ میلے کے زمانے میں اِن صحبتوں میں شریک ہونے کی عام اہلِ شہر کو اجازت ہو جاتی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ گیروے کپڑے پہن کے آئیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسی اسی برس کے بڈھے بھی سنگرفی کپڑے پہن کے چھیلا بن جاتے اور بادشاہ کی جوانی کے بادۂ طرب سے اپنے بڑھاپے کا جام بھر لیتے۔

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنؤ میں کمال بے فکری کے ساتھ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کو رزیڈنٹوں نے یہاں کے حالات سے آگاہ کیا۔ اور وہاں کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملکِ اودھ، قلم رو برطانیہ میں شامل کر لیا جائے۔ اِس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنؤ میں آئی اور یکایک خلافِ توقع بادشاہ کو حکم سنایا گیا کہ:

"آپ کا ملک، انگریزی ممالکِ محروسہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیا سالانہ اور آپ کے جلوسی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیا ماہوار جو آپ کی اور وابستگانِ دامن کی ضرورتوں کے لیے بہ خوبی کافی ہے، مقرر کی گئی (کذا) اور آپ کو اجازت ہے کہ شہر کے اندر آرام سے بے فکرے بن کے بیٹھیے اور رعایا کی فکروں سے آزاد ہو کے بے غل و غش

رنگ رلیاں منایئے۔"

یہ احکام سنتے ہی شہر میں سناٹا ہوگیا۔ خود بادشاہ نے رو دھو کے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ بادشاہ کی ماں اور خاص محل نے حقِ وکالت ادا کیا، مگر گورنر جنرل بہادر کے حکم میں ردّ و بدل کرنا، صاحب رزیڈنٹ کے اقتدار سے باہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت و مزاحمت کے ملکِ اودھ پر قبضہ کرلیا۔ اور بادشاہ مع اپنی والدہ، ولی عہد، خاص خاص محلات اور جاں نثار رفقا کے، کلکتے روانہ ہوئے کہ انگلستان جاکے اپیل کریں اور اپنی بے گناہی ثابت کرکے انتزاعِ سلطنت کے حکم کو منسوخ کرائیں۔

(۸)

واجد علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج وتخت سے جدا ہوتے ہی آخر ۱۲۸۵ محمدی (۱۸۵۶ء) میں لکھنؤ چھوڑ کے، کلکتے کی طرف روانہ ہوگئے۔ تاکہ اپنے معاملے میں باضابطہ پیروی کریں۔ اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کام یابی نہ ہو، تو لندن پہنچ کے مقدمے کو پارلیمنٹ اور ملکۂ انگلستان کے سامنے پیش کردیں۔ چنانچہ جب کلکتے میں کام نہ نکلا تو انگلستان کا قصد کیا مگر اطبا نے بحری سفر کو بادشاہ کے لیے مضر تصور کیا، اور مشیروں نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتے ہی میں ٹھہر گئے، مگر اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ولی عہد کو انگلستان روانہ کیا۔ اس سفر میں میرے نانا منشی قمر الدین صاحب مرحوم بھی اس خانماں برباد شاہی قافلے کے ساتھ تھے۔ بادشاہ کو سرکار انگریزی کی مجوزہ تنخواہ لینے سے انکار تھا۔ اور اڑے ہوئے تھے کہ ہم تو اپنا تاج و تخت ہی لیں گے، جو بے قصور چھینا گیا ہے۔

بادشاہ کلکتے میں تھے، ان کا خاندان لندن میں تھا، اور معاملہ زیرِ غور تھا کہ یکایک کارتوسوں کے جھگڑوں اور گورنمنٹ کی ضد نے، ۱۲۸۶ محمدی (۱۸۵۷ء) میں غدر پیدا کردیا اور میرٹھ سے بنگالے تک ایسی آگ لگی کہ اپنے پرائے سب کے گھر جل اٹھے۔ اور ایسا

فتنۂ عظیم پیدا ہوا کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہی متزلزل نظر آتی تھی جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کے دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا، ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی مئی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ ان کے آتے ہی یہاں کے بھی بہت سے بے فکرے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شاہی خاندانِ اودھ کا اور کوئی رُکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا اور ان کی ماں نواب حضرت محل سلطنت کی مختارِ کل بنیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہاں موجود تھی اور اس کے ساتھ یہاں کے تمام یورپین عہدہ دارانِ مملکت، جو باغیوں کے ہاتھ سے جاں بر ہو سکے، بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے، جس کے گرد، باغیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی، دُھس بنا لیے گئے تھے اور حفاظت و بسر کا کافی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ غنیمت ہوا یا یہ کہیے کہ قسمت اچھی تھی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے جا چکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ مخواہ بادشاہ بنائے جاتے اور اُن کا حشر ظفر شاہ سے بھی بدتر ہوتا۔ اور اودھ کے پریشاں بختوں کو ذرا سینے کے لیے مٹیا برج کے دربار کا جو ایک عارضی سہارا مل گیا تھا، یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔

اب لکھنؤ میں انگریزوں کی باغی فوج کے علاوہ، اودھ کے اکثر زمیندار و تعلقدار اور عہدِ شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے اور ان میں شہر کے بہت سے اوباشوں اور ہر طبقے کے لوگوں کا طوفانِ بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے انگریزوں پر ایک خدائی کا نرغہ ہے۔ مگر فرق یہ تھا کہ محاصرہ کرنے والوں میں، سوا اوباش اہلِ شہر اور بے اصول و خود سر مدعیانِ شجاعت کے، ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اصولِ جنگ سے واقف ہو اور تمام منتشر قوتوں کو یک جا کر کے ایک باضابطہ فوج بنا سکے۔ بہ خلاف اس کے، انگریز اپنی جان پر کھیل کے اپنی حفاظت کرتے۔ سر ہتھیلی پر لے کے حملہ آوروں کو روکتے تھے اور جدید اصولِ جنگ سے بہ خوبی واقف تھے۔

اب لکھنؤ میں برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا عہدہ دارانِ سلطنت مقرر ہوئے۔ ملک سے تحصیل وصول ہونے لگی۔ اور صرف تفننِ طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری تھی۔ لوگ، حضرت محل کی مستعدی و نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کر فوج کی سپہ سالاری کرتیں۔ مشیر اچھے نہ تھے، اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غرور میں تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہور ہے۔ اصلی حاکم ہم ہی ہیں۔ اور جس کے سر پر چوتار کھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے۔ احمد اللہ نام ایک شاہ صاحب، جو فیض آباد کے باغیوں کے ساتھ آئے تھے اور کئی معرکوں میں لڑ چکے تھے، وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی میں ان کا دربار الگ قائم تھا۔ اور دونوں درباروں میں پولیٹکل اختلاف کے ساتھ، شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اسی سال نومبر کے مہینے میں برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھے ہی سات مہینے ہوئے تھے کہ انگریزی فوج لکھنؤ پر تسلط حاصل کرنے کے لیے آ گئی جس کے ساتھ پنجاب کے سکھ اور بھوٹان کے پہاڑی بھی تھے اور کہا جاتا ہے کہ انھی لوگوں نے زیادہ مظالم کیے۔ دو ہی تین دن کی گولہ باری میں، نئی سلطنت کا جو نقش قائم ہوا تھا، مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ کے رہ گیا۔ ہزارہا مفرورین کے ساتھ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال کی طرف بھاگے۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑ لڑ کے اگرچہ برجیس قدر کے لیے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا، مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے شکست کھا کے بھاگے۔ باڑی اور محمدی ہوتے ہوئے پوائیں میں پہنچے۔ وہاں کسی نے گولی

مار دی۔ پوائیں کے راجا نے سرکاٹ کے انگریزوں کے پاس بھیجا اور صلے میں انعام و جاگیر پائی۔

آبادی کو باغیوں سے صاف کرنے کے لیے انگریزوں نے شہر میں سخت گولہ باری کی۔ ساری رعایا گھبرا اٹھی۔ زن و مرد گھر چھوڑ کے بھاگے۔ اور ایک ایسی قیامت بپا ہوگئی کہ جن لوگوں نے دیکھا ہے، آج تک یاد کر کے کانپ جاتے ہیں۔ محلوں کی بیٹھنے والیاں، جن کی صورت کبھی آفتاب تک نے نہ دیکھی تھی، برہنہ پا جنگلوں کی خاک چھانتی پھرتی تھیں۔ بے کسی میں ایک ایک کا دامن پکڑتی تھیں۔ اور جو ملتا تھا، دشمن ہی ملتا تھا۔ اور سعدی کا یہ مصرع پوری طرح صادق آرہا تھا کہ "یاران فراموش کردند عشق" اسی حالت میں فتحیاب فوج نے شہر کو لوٹا۔ اور بعد خرابی بصرہ (بسیار) خدا خدا کر کے لوگوں کو پھر اپنے گھروں میں آنے کی اجازت ملی۔ اب ایک تہلکے کے بعد جو امن قائم ہوا تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم اور روز بہ روز ترقی کرتا جاتا ہے۔ لیکن پرانی دولت کے وابستگانِ دامن اور اعزائے شاہی جو انقلاب سلطنت کے بعد بالکل بے کار ہوگئے، اور نئی سلطنت سے فائدہ اٹھانے کی لیاقت نہ رکھتے تھے، مٹتے ہی چلے گئے۔ چنانچہ بڑے بڑے دولت مند اور معزز گھرانوں کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا۔ محلے کے محلے اجڑتے چلے جاتے تھے اور خاندان کے بعد خاندان مٹ رہا تھا اور اکثر لوگوں کو یقین ہوگیا تھا کہ چند روز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن انجام میں سرکار انگریزی کی وہ تدبیریں جنھوں نے ساری دنیا میں انگریزوں کی نو آبادیاں قائم کرا دی ہیں، غالب آئیں اور لکھنؤ، حوادثِ زمانہ کی دست برد سے بچ کے بنیا جن کو مٹنا تھا، مٹ گئے، اور جو باقی رہے، سنبھلنے کے قابل ہوگئے۔ اور اگر مسٹر بٹلر کے ایسے چند اور حاکم لکھنؤ کو مل گئے تو امید ہے کہ آیندہ بہت ترقی کرے گا۔

ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اسی سلسلۂ واقعات میں ہم واجد علی شاہ کی باقی ماندہ زندگی اور ان کے قیام کلکتہ کے حالات بھی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔ کیوں کہ بغیر اس کے اس تاریخ کا تکملہ نہیں ہو سکتا۔ کلکتے میں خود ہمارا بچپن بادشاہ کے ظلِ حمایت میں بسر

ہوا ہے۔ اور گذشتہ واقعات کے حالات اگر ہم نے لوگوں سے سن کے اور اوراقِ تاریخ میں پڑھ کے بیان کیے ہیں، تو آیندہ اکثر چشم دید حالات بیان کریں گے۔

کلکتے سے تین چار میل کی مسافت پر جنوب کی طرف، دریاے بھاگارتی (ہوگلی) کے کنارے، "گارڈن ریچ" نام ایک خاموش محلّہ ہے۔ اور چوں کہ وہاں ایک مٹّی کا تودہ سا تھا، اس لیے عام لوگ اُسے مٹیا برج کہتے تھے۔ یہاں کئی عالی شان کوٹھیاں تھیں، جن کی زمین دریا کے کنارے کنارے تقریباً دو ڈھائی میل تک چلی گئی ہے۔ جب واجد علی شاہ کلکتے میں پہنچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیاں انھیں دے دیں۔ دو خاص بادشاہ کے لیے، ایک، نوّاب خاص محل کے واسطے۔ اور ایک، علی نقی خاں کی سکونت کے لیے، جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض میں دریا کنارے سے تقریباً میل ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اُس کا حلقہ چھے سات میل سے کم نہ ہوگا، بادشاہ کو اپنے اور اپنے ملازمین کے قیام کے لیے دیا گیا۔ میونسپلٹی کی سڑک اِس رقبے کو طولاً قطع کرتی تھی۔ وہ دو کوٹھیاں جو بادشاہ کو دی گئی تھیں، اُن کے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور اسد منزل قرار دیے اور نوّاب خاص محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اُس کا نام مُرصّع منزل رکھّا۔ اور علی نقی خاں کی کوٹھی آخر تک انھی کے قبضے میں رہی۔ اور اُن کے بعد اُن کی اولاد خصوصاً نوّاب اختر محل کے قبضے میں رہی، جو علی نقی خاں کی بیٹی اور بادشاہ کی ممتاز بی بی، بلکہ اُن کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش بخت بہادر کی ماں تھیں۔

غدر کے زمانے میں انگریزی فوج کے باغی افسروں نے ارادہ کیا کہ اگر بادشاہ اُن کے حکمراں بنیں، تو وہ کلکتے میں بھی غدر کر دیں۔ مگر بادشاہ نے گورنمنٹ آف انڈیا کے معاملے میں یہ روش نہ تخت و تاج سے جدا ہوتے وقت اختیار کی تھی۔ اور نہ اب پسند کی۔ بلکہ لاٹ صاحب کو اُن لوگوں کے ارادے کی اطلاع کر دی، جس پر اُن کا شکریہ ادا کیا گیا۔ مگر وہی چار روز بعد مناسب سمجھا گیا کہ بادشاہ کو قلعۂ فورٹ ولیم میں رکھّا جائے تاکہ پھر کبھی باغیوں کی اُن تک رسائی

نہ ہو سکے۔ لندن میں اُن کی جانب سے جو مقدّمہ پیش تھا، وہ اِس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لیے یہ دعوا ہے، وہ اب ہمارے قبضے ہی میں نہیں۔ جب اُس پر پھر دولتِ برطانیہ کا قبضہ ہو لے گا، تب دیکھا جائے گا۔

بادشاہ اِس حراست ہی میں تھے کہ لکھنؤ کا غدر فرو ہو گیا اور مسیح الدین خاں نے، جو لندن میں بادشاہ کے مختارِ عام تھے، پھر اپنا دعوا پیش کیا۔ اُنھیں بادی النظر میں کامیابی اور استردادِ سلطنت کی پوری اُمید تھی۔ مگر بدقسمتی سے اُن لوگوں میں جو قلعے میں بادشاہ کے مشیر اور مصاحب تھے، خواہ کسی بیرونی تحریک سے، یا خود اپنے نفع کے خیال سے، ایک سازش ہوئی۔ اِن لوگوں نے خیال کیا کہ اگر مسیح الدین خاں مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور وہی وہ رہ جائیں گے۔ لہٰذا سب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ "جہاں پناہ! بھلا کسی نے ملک لے کے دیا ہے؟ مسیح الدین خاں نے حضور کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہونا ہوانا کچھ نہیں ہے اور جہاں پناہ مفت میں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال سے تنخواہ نہیں لی ہے۔ ہر بات کی تنگی ہے اور ہم ملازمانِ دولت بھی پیسے پیسے کو محتاج ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ حضور، گورنمنٹ انگریزی کی تجویزوں کو قبول کر لیں اور تنخواہ وصول کر کے، اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلّاتِ عالیات اور آستاں بوسانِ دولت کے ساتھ بسر فرمائیں۔"

بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی اور بادشاہ سے زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے۔ مصاحبوں نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو بلا تکلف حضور وائسرائے کی خدمت میں لکھ بھیجا: "مجھے سرکار انگریزی کی مجوزہ ماہوار لینا منظور ہے۔ لہٰذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے اور مقدمہ جو لندن میں دائر ہے، خارج کیا جائے۔" جواب ملا: "اب آپ کو اوّل تو گزشتہ ایّام کی ماہوار نہ دی جائے گی۔ صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہو گی۔ دوسرے، فقط بارہ لاکھ روپے سالانہ دیے جائیں گے۔ اور جو تین لاکھ روپے سالانہ آپ کے ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے، اب اُن کے دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔"

---- بہ ظنِ غالب، بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے۔ مگر مصاحبوں نے اِس پر بھی راضی کر دیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان میں اطلاع دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا، لہٰذا اُن کا مقدمہ خارج کیا جائے۔ یہ واقعات میں نے خود اپنے نانا منشی قمر الدین صاحب کی زبان سے سُنے ہیں، جو جنابِ عالیہ کے ہمراہی دفتر کے میر منشی اور مولوی مسیح الدین خاں کے نائبِ خاص تھے۔ اور کُل کارروائیاں اُنھی کے ہاتھ سے عمل میں آئی تھیں۔ بادشاہ کے ماہ وار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن میں پہنچی مسیح الدین خاں کے حواس جاتے رہے۔ بادشاہ کی ماں، اُن کے بھائی اور ولی عہد نے سر پیٹ لیا اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ افسوس، اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک میں ملا جاتا ہے۔ آخر مسیح الدین خاں نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی اور پارلیمنٹ میں یہ قانونی عذر پیش کیا کہ "بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست میں ہیں اور ایسی حالت میں اُن کی کوئی تحریر پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچ سکتی۔"

عذر معقول تھا تسلیم کیا گیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذر داری سے مطلع کیا گیا۔ ساتھ ہی مسیح الدین خاں اور تمام ارکانِ خاندانِ شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ "یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ ہمیں مُلکِ اودھ کے واپس ملنے کی پوری امید ہے۔" اب غدر فرو ہو چکا تھا، گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا اور وہ خوشی خوشی قلعے سے نکل کر مٹیا برج میں آئے۔ اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبوں نے عرض کیا: "حضور! مسیح الدین خاں لندن میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے۔" یہ سنتے ہی بادشاہ نے برافروختہ ہو کے اُسی وقت لکھ بھیجا کہ: "ہم نے آزادی سے بہ رضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کیا ہے اور مسیح الدین خاں کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید میں ہونے یا کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے منظوری دی ہے۔ لہٰذا ہم آیندہ کے لیے اس مختار نامے ہی کو منسوخ کیے

دیتے ہیں جس کی رو سے وہ ہمارے مختارِ عام بنائے گئے ہیں ۔"

اب کیا تھا، ساری کارروائی ختم ہوگئی۔ بادشاہ مٹیا برج میں رنگ رلیاں منانے لگے۔ مصاحبوں کے گھروں میں ہُن برسنے لگا اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ جو انگلستان میں پڑا ہوا تھا، قریب قریب وہیں تباہ ہوگیا۔ اکثر ہم راہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی ماں، جنابِ عالیہ اس صدمے سے بیمار ہوگئیں۔ اور اُسی بیماری میں چلیں کہ ملکِ فرانس سے ہوتی ہوئی مقاماتِ متبرکہ میں جائیں اور اُن کی زیارت سے شرف یاب ہوکے کلکتے پہنچیں مگر موت نے پیرس سے آگے قدم نہ بڑھانے دیا، وہیں انتقال کیا۔ اور عثمانی سفارت خانۂ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے، اُسی میں دفن ہوئیں۔ مرزا سکندر حشمت کو ماں کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ ماں کے مرتے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے۔ اور ماں کے چودہ پندرہ روز بعد وہ بھی ماں کے برابر یومِ جزا کا انتظار کرنے کے لیے لٹا دیے گئے۔ اکیلے مرزا ولی عہد بہادر کلکتے واپس آکے ماں باپ سے ملے۔

کہتے ہیں کہ ابتداءً مٹیا برج میں بھی بادشاہ کی زندگی نہایت ہی بیدار مغزی اور ہوشیاری کی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے گرد وپیش کے لوگوں نے چند آلاتِ موسیقی فراہم کر دیے۔ فوراً سرودِ مستان یاد دہانیدن کا پورا پورا مضمون صادق آگیا اور اربابِ نشاط کا گروہ وہاں بھی جمع ہونے لگا۔ ہندوستان کے اچھے اچھے گویّے آکے ملازم ہوئے اور مٹیا برج میں موسیقی دانوں کا ایسا مجمع ہوگیا تھا کہ اور کسی جگہ نہ تھا۔

خوب صورت عورتوں کے جمع کرنے اور حسن وعشق کے کرشموں میں پھنسے رہنے کا وہاں بھی ویسا ہی شوق تھا، جیسا کہ لکھنؤ میں سنا جاتا ہے۔ مگر مٹیا برج میں اس شوق میں مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہا۔ بادشاہ شیعہ تھے اور شیعوں کی شرع میں متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کے، بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے۔ اور قاعدہ تھا کہ غیر ممتوعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔ یہ احتیاط

اِس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک جوان بھشتن جو بادشاہ کے سامنے زنانے میں پانی لاتی، اُن سے بھی متعہ کرکے، اُسے نواب آب رساں بیگم کا خطاب دے دیا۔ ایک جوان خاک روبن جس کی حضوری میں آمد و رفت رہتی، وہ بھی ممتوعات میں داخل ہو کے، نواب مُصفّا بیگم کے خطاب سے سرفراز ہوئی۔ اسی طرح موسیقی کا شوق بھی ممتوعات ہی تک محدود رہتا۔ شاید شاذونادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہوگا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا مجرا دیکھا ہو۔ خود ممتوعات کی مختلف پارٹیاں بنادی گئی تھیں جن کو مختلف طرز پر رقص و سرود کی تعلیمیں دی جاتیں۔ ایک رادھا منزل والیاں ایک جھومر والیاں۔ ایک لٹکن والیاں۔ ایک سار دھا منزل والیاں۔ ایک نتھ والیاں ایک گھونگھٹ والیاں۔ ایک رہس والیاں۔ ایک نقل والیاں۔ اور اسی طرح کے بیسیوں گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلا تعلیم دی گئی تھی اور انھی کے ناچ گانے میں اُن کا دل بہلتا۔ اِن سب سے متعہ ہو گیا تھا، بیگمیں کہلاتی تھیں۔ اور دو ایک گروہوں میں اگرچہ کم سن لڑکیاں غیر ممتوعہ تھیں، تو اس لیے تھیں کہ بعدِ بلوغ داخلِ ممتوعات کرلی جائیں گی۔ ان میں سے اکثر خود بادشاہ کے قریب خاص سلطان خانے میں رہتیں، اور بعض کو دوسری کوٹھیوں میں جُدا محل سرائیں ملی تھیں۔ اِن ممتوعات میں سے جو صاحبِ اولاد ہو جاتیں، اُن کو محل کا خطاب دیا جاتا۔ رہنے کو جُداگانہ محل سرا ملتی۔ اور ان کی تنخواہ اور عزت بڑھ جاتی۔

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتوں سے بادشاہ بڑے متقی و پرہیزگار اور پابندِ شرع تھے۔ نماز کبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ تیسوں روزے رکھتے تھے۔ افیون، شراب، فلک سیر یا اور کسی قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز رہا اور محرم کی عزاداری نہایت ہی خلوصِ عقیدت سے بجا لاتے تھے۔

تیسرا شوق انھیں عمارت کا تھا۔ سلطان خانے کے گرد بیسیوں محل سرائیں تعمیر ہوگئیں۔ اور بہت سی نئی کوٹھیاں اور اُن میں محل سرائیں بنیں۔ گورنمنٹ سے صرف

سلطان خانہ، اسد منزل اور مرصع منزل ملی تھیں۔ مگر بادشاہ کے شوق نے چند ہی روز میں بیسیوں کوٹھیاں تعمیر کرا دیں، جن کے گرد نہایت ہی پُر فضا باغ اور فرحت بخش چمن تھے جس وقت میں نے دیکھا ہے، بادشاہ کے قبضے میں مندرجۂ ذیل عالی شان کوٹھیاں تھیں جو جنوب سے شمال تک ترتیب وار چلی گئی تھیں: سلطان خانہ، قصر البیضا، گوشۂ سلطانی شہنشاہ منزل، مرصع منزل، اسد منزل، شاہ منزل، نور منزل، تفریح بخش، بادامی، آسمانی، تہنیت منزل، حدِ سلطانی، سدِ سلطانی، عدالت منزل۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کوٹھیاں تھیں، جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔

اِن کے ماسوا باغوں کے اندر تالابوں کے کنارے بہت سے کمرے، بنگلے اور چھوٹی چھوٹی کوشکیں تھیں۔ ان تمام کوٹھیوں متفرق کمروں، بنگلوں اور کوشکوں میں صاف ستھرا پُر تکلف فرش بچھا رہتا۔ چاندی کے پلنگ بچھونوں اور تکیوں سے مکمل لگے رہتے۔ تصویریں اور طرح طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا۔ اور محض پرورش کے خیال سے ضرورت سے زیادہ مکان دار مقرر تھے جو روز جھاڑتے اور ہر چیز کو صفائی اور قرینے سے آراستہ رکھتے۔ غرض ہر کوٹھی بہ جائے خود اس قدر آراستہ و پیراستہ نظر آتی کہ انسان اَش اَش کر جاتا۔ کوٹھیوں کے گرد کے باغ اور چمن ایسی ہندسی ترتیبوں اور اقلیدس کی شکلوں کے مطابق بنائے گئے تھے کہ دیکھنے والوں کو بادشاہ کی مناسبت طبعی پر تعجب ہوتا۔

لکھنؤ میں تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اس کے پاس کی چند عمارتیں، یا اپنے والدِ مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا۔ مگر مٹیا برج میں نفیس اور اعلا عمارتوں کا ایک خوب صورت شہر بسا دیا تھا۔ دریا کے اُس پار، مٹیا برج کے عین مقابل کلکتے کا مشہور بوٹینکل گارڈن ہے، مگر وہ مٹیا برج کی دنیوی جنت اور اس کے دل کش عجائبات کے سامنے مٹ گیا تھا۔ ان تمام عمارتوں، چمنوں، کنجوں، اور وسیع و نزہت بخش مرغزاروں کے گرد، بلند دیواروں کا احاطہ تھا۔ مگر میونسپلٹی کی شاہ راہِ عام کے کنارے

کنارے تقریباً ایک میل تک شان دار دکانیں تھیں اور اُن میں وہی ادنا درجے کے ملازمین رہنے پاتے تھے جن کو اپنے فرائض کے لحاظ سے وہاں رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر اندر جانے کا راستہ سوا پھاٹکوں کے، جن پر پہرہ رہتا کسی دکان میں سے نہیں رکھا گیا تھا خاص سلطان خانے کے پھاٹک پر نہایت عالی شان نوبت خانہ تھا نقارچی نوبت بجاتے، اور پرانے پہروں اور گھڑیوں ہی کے حساب سے شب و روز گھڑیاں بجا کرتا۔

دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گزرے ہیں مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاج دار نے اتنی عمارتیں اور اتنے باغ نہ بنوائے ہوں گے جتنے کہ واجد علی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برائے نام شاہی کے مختصر زمانے میں بنائے۔ شاہ جہاں کے بعد اس بارۂ خاص میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ اسی ستم زدہ شاہِ اودھ کا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی خاص عمارت سیکڑوں ہزاروں سال تک باقی رہی اور کسی کی صدہا عمارتیں زمانے نے چند ہی روز میں مٹا کے رکھ دیں۔

عمارت کے علاوہ بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی انھوں نے اس درجے تک پہنچا دیا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور شاید کوئی شخصی کوشش آج تک اُس کے نصف درجے کو بھی نہ پہنچ سکی ہوگی۔

نور منزل کے سامنے خوش نما آہنی کٹہرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنا بنایا گیا تھا جس میں صدہا چیتل، ہرن، اور وحشی چوپائے چھوٹے پھرتے تھے۔ اسی کے درمیان سنگِ مرمر کا ایک پختہ تالاب تھا جو ہر وقت لبالب رہتا اور اُس میں شتر مرغ، کشوری، فیل مرغ، سارس، قازیں، بگلے، قرقرے، ہنس، مور، چکور اور صدہا قسم کے طیور اور کچھوے چھوڑ دیے گئے تھے۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا جو کہیں بیٹ یا کسی جانور کا پر بھی نظر آجائے۔ ایک طرف تالاب کے کنارے کٹہروں میں شیر تھے اور اس رمنے کے پاس ہی سے لکڑی کے سلاخوں دار بڑے بڑے خانوں کا ایک سلسلہ

شروع ہوگیا تھا جس میں بیسیوں طرح کے اور خدا جانے کہاں کہاں کے بندر لاکے جمع کیے گئے تھے، جو عجیب عجیب حرکتیں کرتے اور انسان کو بغیر اپنا تماشا دکھائے آگے نہ بڑھنے دیتے۔

مختلف جگہ حوضوں میں مچھلیاں پالی گئی تھیں جو اشارے پر جمع ہو جاتیں اور کوئی کھانے کی چیز ڈالیے تو اپنی اُچھل کود سے خوب بہار دکھاتیں۔ سب پر طرّہ یہ کہ شہنشاہ منزل کے سامنے ایک بڑا سا لمبا اور گہرا حوض قایم کرکے، اور اُس کے کناروں کو چاروں طرف سے خوب چکنا کرکے اور آگے کی طرف جُھکا کے، اُس کے بیچ میں ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑوں نالیاں دوڑائی گئی تھیں اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے، پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ میں ہزاروں بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے لمبے سانپ چھوڑ دیے گئے تھے جو برابر دوڑتے اور رینگتے پھرتے۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے اور پھر نیچے اُتر آتے۔ مینڈکیں چھوڑی جاتیں، اُنھیں دوڑ دوڑ کے پکڑتے۔ پہاڑ کے گرداگرد نہر کی شان سے ایک نالی تھی۔ اس میں سانپ لہرا لہرا کے دوڑتے اور مینڈکوں کا تعاقب کرتے اور لوگ بلاکسی خوف کے پاس کھڑے سیر دیکھا کرتے۔ اس پہاڑ کے نیچے بھی دو کٹہرے تھے، جن میں دو بڑی بڑی چیتیں رکھی گئی تھیں۔ یوں تو خاموش پڑی رہتیں، لیکن جس وقت مرغ لاکے چھوڑا جاتا، اُسے جھپٹ کے پکڑتیں اور مسلّم نگل جاتیں۔ سانپوں کے رکھنے کا انتظام اس سے پہلے شاید کہیں نہ کیا گیا ہوگا۔ اور یہ خاص واجد علی شاہ کی ایجاد تھی جس کو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے اور اُس کی تصویریں اور مشرّح کیفیت قلم بند کرلے جاتے تھے۔

مذکورہ جانوروں کے علاوہ، ہزارہا طیور کے چمکتے ہوئے برنجی پنجرے خاص سلطان خانے کے اندر رہتے تھے۔ بیسیوں بڑے بڑے ہال تھے جو لوہے کے جال سے محفوظ کر دیے گئے تھے اور گنج کہلاتے تھے۔ اُن میں قسم قسم کے طیور کثرت سے لاکے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور اُن کے

رہنے اور نشوونما پانے کا پورا سامان فراہم کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ چرند پرند میں سے جتنی قسم کے جانور دست یاب ہو سکیں، سب جمع کر لیے جائیں۔ اور واقعی ایسا مکمل زندہ عجائب خانہ شاید روئے زمین پر کہیں موجود نہ ہوگا۔ ان جانوروں کی فراہمی میں بے روک روپیا صرف کیا جاتا اور کوئی شخص نیا جانور لائے تو منہ مانگے دام پاتا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا چوبیس ہزار روپے کو اور سفید مور کا جوڑا گیارہ ہزار روپے کو لیا تھا۔ زرافہ جو افریقہ کا بہت بڑا اور نہایت عجیب جانور ہے اس کا بھی ایک جوڑا موجود تھا۔ دو کوہان کے بغدادی اونٹ ہندوستان میں کہیں نظر نہیں آتے اور بادشاہ کے وہاں تھے۔ کلکتے میں ہاتھی مطلق نہیں ہیں مگر بادشاہ کے اس زندہ نیچرل ہسٹری میوزیم میں ایک ہاتھی بھی تھا محض اس خیال سے کہ کوئی جانور رہ نہ جائے، دو گدھے بھی رمنے میں لاکے چھوڑ دیے گئے تھے۔ درندوں میں سے شیر ببر، دیسی شیر، چیتے، تیندوے، ریچھ، سیاہ گوش، چرغ، بھیڑیے سب کٹہروں میں بند تھے۔ اور بڑی خاطر داشت سے رکھے جاتے۔

کبوتروں کا انتظام دیگر جانوروں سے الگ تھا۔ بادشاہ کی مختلف کوٹھیوں میں سب ملا کے چوبیس پچیس ہزار کبوتر تھے جن کے اڑانے میں کبوتر بازوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔

جانوروں پر جو صرف ہو رہا تھا، اس کا ناقص اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ سو سے زیادہ جانور باز تھے تین سو کے قریب کبوتر باز تھے۔ اتنی کے قریب ماہی پرور تھے۔ اور تیس چالیس مار پرور تھے جن کو دس روپے ماہوار سے لے کے چھ روپے ماہوار تک تنخواہیں ملتی تھیں۔ افسروں کی تنخواہیں تیس سے بیس روپے تک تھیں اور کبوتروں، سانپوں اور مچھلیوں کے علاوہ دیگر جانوروں کی خوراک میں کچھ کم نو ہزار روپے ماہوار صرف ہوتے تھے۔

عمارت کا کام زیادہ تر مونس الدولہ اور ریحان الدولہ کے سپرد رہا۔ جن کو عمارت کی مد میں تقریباً پچیس ہزار ماہوار ملا کرتے تھے۔

ہزار کے قریب پہرے کے سپاہی تھے جن کی تنخواہیں عموماً چھ روپے ماہوار تھیں۔ بعض

بعض آٹھ یا دس روپے بھی پاتے یہی تنخواہ مکان داروں کی تھی جن کا شمار پانچسو سے زیادہ تھا۔ مالیوں کی بھی یہی تنخواہ تھی، اور اُن کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا۔ تقریباً اسّی اہلِ قلم یعنی محرر تھے جو تیس سے دس روپے ماہ وار تک تنخواہ پاتے تھے۔ معزز مصاحبوں اور اعلا عہدے داروں کا شمار چالیس پچاس سے کم نہ ہوگا جو اٹھاسّی روپے ماہ وار پاتے تھے۔ سَو سے زیادہ کہار تھے۔

اِن کے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے محکمے تھے: باورچی خانہ، آب دار خانہ، بھنڈی خانہ، خس خانہ، اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ پھر ایک مد لواحق بیگمات یعنی ممنوعات کے رشتے داروں اور بھائی بندوں کی تھی، جنھیں حسبِ حیثیت تنخواہیں ملتی تھیں۔

اِن سب لوگوں نے کوٹھیوں کے رقبے سے باہر زیادہ تر اُسی زمین پر جو بادشاہ کو دی گئی تھی اور بہتوں نے پاس کی دوسری زمینوں پر مکان بنا لیے تھے اور ایک شہر بس گیا تھا جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔ اِن سب کی زندگی بادشاہ کی تنخواہ کے ایک لاکھ روپے ماہ وار سے وابستہ تھی اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی خلقتِ عظیم اس تھوڑی سی رقم میں کیوں کر زندگی بسر کر لیتی ہے۔ بنگالے کے عوام میں یہ مشہور تھا کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے، جب ضرورت ہوتی ہے، لوہے یا تانبے کو اُس میں رگڑ کے سونا بنا لیا کرتے ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتے کے پڑوس میں ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا اور اُس کی منتخب صحبت، مٹیا برج میں چلی گئی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان دِنوں لکھنؤ، لکھنؤ نہیں رہا تھا، مٹیا برج لکھنؤ تھا۔ یہی چہل پہل تھی، یہی زبان تھی، یہی شاعری تھی، یہی صحبتیں اور بذلہ سنجیاں تھیں، یہیں کے عُلما و اتقیا تھے، یہیں کے اُمرا و رؤسا تھے اور یہیں کے عوام تھے۔ کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ہم بنگالے میں ہیں۔ یہی پتنگ بازیاں تھیں، یہی مرغ بازیاں تھیں، یہی بٹیر بازیاں تھیں، یہی افیونی تھے، یہی داستان گوئی تھی، یہی تعزیہ داری تھی، یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی، یہی امام باڑے تھے اور یہی کربلا تھی۔ بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی ضریح اٹھتی تھی، لکھنؤ میں عہدِ

شاہی میں شاید اُٹھ سکی ہو۔ غدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیہ نہیں اُٹھ سکا۔ کلکتے کی ہزارہا خلقت اور انگریز تک زیارت کو مٹیا برج میں آجاتے تھے۔

بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصّب نہ تھا۔ اُن کا پُرانا مقولہ تھا کہ "میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنّی ہے"۔ ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مار پیٹ ہوگئی۔ بادشاہ نے دونوں کی معزولی کا حکم دیا، بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمت کر دیا اور فرمایا "ایسے لوگوں کا میرے یہاں گزر نہیں ہوسکتا"۔ آخر میں بادشاہ کی ایک کتاب میں بعض ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے۔ جن پر کلکتے کے سنیوں میں بڑی شورش ہوئی۔ مگر اس سے لوگ واقف نہیں ہیں کہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہیں بلکہ دوسروں کی تاریخ یا تقریظ میں تھے۔ اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی، بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہوگئے۔ بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیرِ اعظم منصرم الدولہ بہادر سُنّی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مُقرّب اور سارے جانور خانے، کُل اہلِ قلم اور کئی اور محکموں کے افسرِ اعلا تھے، سُنّی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کل ملازموں حتّٰی کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی، سنّی تھے۔ عطارد الدولہ اور ردار و غہ معتبر علی خاں جو آخر میں سب سے بڑے عہدے دار اور کل کاروبار کے مالک تھے، دونوں سُنّی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد کا اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجالانے کا اہتمام بھی سُنّیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اِس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سُنّی ہے اور کون شیعہ ہے۔

مٹیا برج کے دکان دار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے۔ اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔ جدھر گزر جائیے، ایک عجیب رونق اور چہل پہل

نظر آتی۔ اور اُس لُطف میں لوگ اِس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور رمنے وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ حتیٰ کہ ملازمین بلکہ ساکنینِ مٹیا بُرج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغوں میں پھریے تو اُن سے زیادہ پُرفضا مقام کہیں نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائیے تو عجیب لطف نظر آتا۔ کلکتے کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گزرتے، جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے یہیں سے اپنی جھنڈیاں اُتارنا شروع کر دیتے اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہیں محلات کی ڈیوڑھیوں اور محل سراؤں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیے تو عجب لطف کی دھوم دھام میں کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آ جاتیں اور ایسی فصیح و دل کش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں آ جاتیں کہ انسان مدّتوں بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوب صورت اور دل فریب نقش تو مٹنے کے قابل نہ تھا، مگر ہائے زمانے نے مٹا ہی دیا اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ھ ہجری (۱۸۸۷ء) میں یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ سب باتیں خواب و خیال تھیں۔ ایک طلسم تھا کہ یکایک ٹوٹ گیا اور وہ خوب صورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیانِ ملک کو رہا کرتی تھی، آج ایک وحشتستانِ فنا اور عبرت کدہ ہے، جہاں کچھ بھی نہیں۔ جس نے اُس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا، اب وہاں کے سنّاٹے کو دیکھ کے، سوا اِس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے: رہے نام اللہ کا! اور کیا کر سکتا ہے۔

(۹)

اِس دربار کے فرماں رواؤں کی تاریخ میں سے اب صرف اِس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحدِ نیپال پر دم لیا۔ ہم راہِ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ اُن لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین

ہو جائیں۔ اور جب موقع ملے، نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں، شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔ مگر یہ نبھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاستِ نیپال نہ اتنے آدمیوں کو اپنے وہاں پناہ دے سکتی تھی اور نہ اُن کے لیے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اُس میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہٰذا حکومتِ نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور اُن کی ماں کو تو پناہ دے دی، مگر اُن کے ہم راہی طوفانِ بے تمیزی کو قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں ورنہ جائیں تو مار کے نکال دیے جائیں۔ نیپال کی قلمرو فوراً اُن سے خالی کرا لی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے سب وہاں سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے، بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربارِ نیپال سے اُن کے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور کہتے ہیں، اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا سب دولتِ نیپال کی نذر ہوا۔ آخر حضرت محل وہیں پیوندِ زمین ہوئیں اور اُن کے بعد ملکۂ وکٹوریا کی جُبلی کے موقع پر دولتِ برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ انھیں واپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے کلکتے پہنچے۔ یہاں واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بحیثیتِ اولادِ اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے۔ برجیس قدر نے دعوا کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ معزز و مستحق میں ہوں، از روے قانونِ پنشن، بادشاہ کی پنشن میں سے ایک ثلث گھٹا کے، باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے اور اُن کے تمام وُرثا اور وابستگانِ دامن کی خبر گیری میرے ذمّے کی جائے۔ اس کی پیروی میں وہ انگلستان میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اُن کے خاندان والوں ہی میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو قے اور دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت خراب ہو گئی اور ایک ہی دن میں وہ، اُن کی بی بی، اور ان کے کئی فرزند، سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دنیا اِس خاندان کی اُن تمام

یادگاروں سے خالی ہوگئی جنھوں نے کبھی تخت وتاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم مٹیا برج کی چہل پہل اور اس نئی بستی کی رونق وآبادی نے ایسی صورت پیدا کرلی تھی کہ اگر چشمِ زخمِ حوادث سے بچ جاتا تو مدتوں تک یاد دلاتا رہتا کہ اُس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اس کے وابستگانِ دامن کی کیا وضع قطع تھی اور اُن کا کیا مذاق تھا مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گستری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے وُرثا کی دادرسی میں یہ شانِ عدالت دکھائی کہ ساری جایداد اور سارا گھربار بیچ کے حصّہ رسدی سب میں تقسیم کردیا جائے۔ اور جو کچھ ہے نقد روپے کی صورت میں کرلیا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مٹیا برج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ لاکھوں کا سامان کوڑیوں کو بک گیا۔ اور وہی بقعہ جو چند روز میں باغِ اِرم بن گیا تھا حضیضِ ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جا کے خاک اُڑاؤ کچھ نہ نظر آئے گا۔ اگر آنکھیں اگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امرؤالقیس کو بلاؤ جو آنسو بہاتا جائے اور تمھیں بتاتا جائے کہ یہاں مرصّع منزل تھی، یہاں نور منزل تھی، یہاں سلطان خانہ تھا اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں مشاعرے ہوتے تھے، وہاں علماے باکمال کی مجلس تھی، وہاں یارانِ باصفا کی بذلہ سنجیاں تھیں، اور وہاں فُصحاے جادو بیان کی سحر طرازیاں تھیں۔ اِس مقام پر منتخب حسینانِ جہاں کا جھرمٹ تھا، اس مقام پر رقص وسرود کی محفل گرم تھی، اس مقام پر چور وَش مہ جبینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی، اور اس مقام پر جہاں پناہ نازآفریں ممنوعات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے۔ اس جگہ افیونیوں کے مجمع میں داستان ہوتی تھی اُس جگہ بٹیروں کی پالیاں ہوتی تھیں، اس جگہ کبوتر اُڑتے تھے، اور اس جگہ کنکوّے کے میدان بدے جاتے تھے۔ اِس ڈیوڑھی پر ماہ وش جادو نگاہیں پردے سے سر نکالے

مے جاہلیتِ عرب کا ایک نہایت مشہور شاعر جس نے اپنے قدیم عشرت کدے کی ویرانی اور تباہی کی تصوّر نہایت ہی سوز وگداز کے الفاظ میں دکھائی ہے۔ ۱۲

جھانکتی نظر آتی تھیں۔ اس ڈیوڑھی پر ماما، اصیلوں کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب جوش و خروش نمایاں رہتا تھا، اس ڈیوڑھی پر خاص شعرا حاضر رہتے، اس لیے کہ محل سرا والی کو فنِ شعر سے دلچسپی تھی، اور اس ڈیوڑھی پر روز رنگین عبارت لکھنے والے جوان مزاج ادیبوں کی تلاش رہتی تھی، اس لیے کہ دوسرے تیسرے یہاں سے ایک نئے رنگ کا تودۂ نامہ[1] جا کے بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوتا۔

لیکن مٹیا برج کے مٹ جانے پر بھی اُس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں باقی ہیں۔ خود شہر لکھنؤ اور اُس کی سوسائٹی اُس دربارِ دُربار کو یاد دلا رہی ہے۔ اور اودھ کی سرزمین کا چپہ چپہ اُس کی عظمت کی یادگار ہے۔ اِس لیے کہ اُس پر جا بجا سلطنتِ ماضیہ کے مار کے بنے ہوئے ہیں۔ اہلِ لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکانِ دربار کی زندہ تاریخ ہے اور اُن کی چال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے:

ای گل بتو خرسندم، تو بوی کسی داری

لہٰذا اِن دیرپا آثارِ سلف کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ میں جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی، وہ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ اور اُس نے کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان میں اُن دنوں فارسی زبان کورٹ لینگوج (درباری زبان) تھی اور اہلِ ہندوستان کی بہترین معاشرت، ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی۔ دولتِ صفویہ کے عہد میں ایرانیوں کا عام مذہب شیعۂ اثنا عشری ہو گیا تھا اور ہندوستان کا حکمراں خاندانِ مغلیہ چغتائیہ، مذہبِ اہلِ سنت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلافِ مذہب کے، جو بھی یہاں آتے، ادب کے ہاتھوں سے لیے جاتے تھے۔

---

[1] تودۂ نامہ اُن خطوط کو کہتے تھے جو بیگمات و محلاتِ عالیات، جہاں پناہ کی خدمت میں بھیجتیں جو عموماً عاشقانہ رنگ میں ہوتے۔

اِسی اخلاقی رجحان نے نور جہاں بیگم کو جہاں گیر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا۔ اُسی کی بدولت دہلی کے اکثر معزز عہدے دار آخر عہد میں شیعہ تھے۔ اور اِسی کی وجہ سے امین الدین خاں نیشاپوری یہاں پہنچتے ہی، نواب بُرہان الملک بن کے، وادیِ گنگا کے سارے وسیع علاقے کے مالک ہو گئے۔ بُرہان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا۔ اُسی قدر زیادہ وہ باکمالانِ دہلی کے مرجع و ماوا بنتے گئے۔ باوجود اس کے اُن کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی چوں کہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئی، اس وجہ سے سوائے بہادر سپہ گروں کی قدردانی کے، انھیں قومی تمدّن اور معاشرتی اُمور کی طرف متوجہ ہونے کی بہت ہی کم مہلت ملی۔ کیوں کہ ان باتوں کو بہ مقابل فوج کشی و فتح مندی کے، امن و امان کے پُرعیش زمانے سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب شجاع الدّولہ نے بکسر کی لڑائی میں ہمت ہارنے کے بعد انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا اور مجبور ہو کے فیض آباد میں خاموش بیٹھے تو سرزمینِ اودھ میں ایک نئے تمدّن کی بنیاد پڑ گئی۔ اس مضمون کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ شجاع الدّولہ کے زمانے میں کس کثرت سے باکمالانِ دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگے تھے۔ دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں کے آنے کا کیسا تانتا بندھ گیا تھا اور صرف نو سال کی مدت میں فیض آباد کیا سے کیا ہو گیا تھا؟ شجاع الدّولہ کے بعد نواب آصف الدّولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا تو فیض آباد کا جما جمایا اکھاڑ ایک بارگی فیض آباد سے اُکھڑ کے لکھنؤ میں آ گیا اور دہلی کے اعلا خاندانوں اور باکمالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی میں روک لیا گیا جو کہ عین سرِراہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر میں چند شُرفا و صاحبِ ہنر جو فیض آباد میں بیگموں کی سرکاروں میں اُلجھے رہ گئے تھے، رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آ گئے۔ اس لیے کہ آصف الدّولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا نہیں بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔

اُن دِنوں یوں تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں مگر مہذّب اور شایستہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجا خود مُعترف تھے کہ تمدّن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدّن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی اُن میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی باکمال عالم، شاعر، یا سپاہی مسلمان اُمرا سے برخاستہ خاطر ہو کے ہندو اُمرا کے علاقے میں پہنچ جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان دربار اُن دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دلّی کا دربارِ مغلیہ تھا اور اُس کی قدامت اور گذشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے باکمالوں اور مستند خاندانی شرفا کی کان دلّی بنی ہوئی تھی۔ اور اُسی سر زمین کے منتشر روڑے تھے جنھوں نے دُور و دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے جن میں سے دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نوّاب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال میں دلّی سے چلیے تو پہلے روہیل کھنڈ کے بہادر خوانین کی قلمرو تھی۔ اس کے بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اس سے آگے مرشد آباد میں نوّاب ناظمِ بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دور تھے۔ اُن کا راستہ اوّل تو جنگلوں اور پہاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ اور اُس پر بھی جراَت کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھگ اور ڈاکو جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے، راستے ہی میں اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔ ٹیپو سلطان اور نوّاب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدرآباد کی مملکت تک پہنچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اس لیے جب دلّی بگڑنا شروع ہوئی اور تاج دارانِ مغلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدر دانی کا بازار وہاں سرد پڑا، تو لوگوں نے عموماً شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ روہیل کھنڈ بہت قریب تھا۔ یہاں کے

خوانین اگر قدردانی کرتے تو اُن سے زیادہ موقع کسی کو نہیں حاصل تھا۔ مگر اُن میں دین داری تھی، شجاعت تھی اور بہت سی خوبیاں تھیں، مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینیوں سے وہ لوگ بالکل مُعرّا تھے۔ اُن کی حالت کا صحیح اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے جنھیں اپنے ہم وطنوں کے جمع کرنے اور اپنے جرگوں کی تعداد بڑھا کے اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے پن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو اُن کی حالت بالکل وحشی گنواروں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعروں، ادیبوں اور دیگر قسم کے باکمالوں کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہٰذا اُن کی سرزمین میں جو داخل ہوا، قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلیں طے کر کے لکھنؤ میں پہنچا تو دیکھا کہ رئیس سے لے کے ادنا طبقے والے تک استقبال میں آنکھیں بچھا رہے ہیں اور ہر طرح خدمت گزاری کو تیار ہیں۔ ایسی جگہ پہنچ کے پھر بھلا کون واپس آسکتا ہے؟ جو گیا وہیں کا ہو گیا۔ اور دلی کا ہر خانماں برباد یہاں آتے ہی پانو توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں باقی رہی۔ چند لوگ یہاں سے آگے بڑھ کے نوابِ ناظمِ بنگالہ تک بھی پہنچ گئے، مگر وہ وہی تھے جن کی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے۔ ورنہ دلی سے جتنے باکمال آئے، سب لکھنؤ ہی میں کھپتے چلے گئے، تھوڑے ہی زمانے کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اُس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے، سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی اور وہ عربی کا علم و فضل تھا جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات مُلّا نظام الدین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ مُلّا صاحب ممدوح اور ان کے خاندان کے قیام نے چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلاترین

یونی ورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پایا۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی میں بھی کوئی نمود کا عالم نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بہت بڑا عروج حاصل کیا مگر ان کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہیں، ان سب کی یونی ورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنوں لکھنؤ ایک گم نام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گم نام مقام کا اتنی بڑی یونی ورسٹی بن جانا کہ ہندوستان درکنار بخارا، خوارزم، اور ہرات و کابل، اُس کے آگے سر جھکا دیں، بہت ہی حیرت کے قابل ہے۔ ساری اسلامی دنیا یہیں کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور یہیں کے منتخب کیے ہوئے نصابِ تعلیم یعنی سلسلۂ نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علمائے فرنگی محل کی بدولت اِس نئے دربار کے قائم ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ، منطق و کلام، فقہ و اُصولِ فقہ اور دیگر مختلف عُلوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ لہٰذا ایک اِس چیز میں تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیر بارِ احسان نہیں ہے، باقی اور تمام ترقیاں اِس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئیں۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی چیزیں آئیں اور یہاں آ کے انھوں نے کیا رنگ پکڑا۔ سب سے مقدم اُردو زبان ہے جو دہلی کے اُن شرفا اور سردارانِ فوج کی زبان تھی جو اب برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی۔ اور اُس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آ کے اپنا دیوان پیش کیا۔ اور اپنے نغمۂ دل کش سے اہلِ زبان کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ اِس نغمے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا اور دہلی میں اُردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھوں نے استادی کی شان سے دہلی میں دادِ سخن دینا شروع کی۔ مگر اُس زمانے کو اگر اُردو زبان کی طفلی نہیں تو اُردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔

دنیائے اُردو کے اُن سابقینُ الاوّلین میں سب سے زیادہ صاحب علم وفضل اور سب سے بڑے باکمال خانِ آرزو تھے جنھیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دورِ شاعری میں رکھّا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا، میر، میرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر دردؔ شامل ہیں، سب اِن کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زباں دانی کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد انھی استادِ اوّل خانِ آرزو سے پڑی۔ نوّاب شجاع الدّولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے انھیں لکھنؤ بلوایا اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزیں رہ کے وہ شجاع الدّولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (۱۱۸۱ھ محمدی مطابق ۱۷۵۶ء) میں خاص لکھنؤ کے اندر رہ گرائے آخرت ہوئے۔ وہی پہلے استاد اردو شاعری کے تھے اور انھی سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ اُن کی ہڈیاں، سرزمینِ لکھنؤ کے دامنِ شوق سے چھین کے، خاکِ دہلی کو سونپی گئیں۔

اِس کے بعد اُسی دور کے دوسرے نامی استادِ سخن اشرف علی خاں فغاں نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے، قدردانی کی تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدّولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھّا مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں، کسی خفیف سی بات پر روٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدّولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پیوندِ زمیں ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دورِ شاعری شروع ہوا جب کہ خانِ آرزو کے شاگرد نظمِ اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اُس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبانِ کمال اُس کے سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں، اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحبِ فن آتا ہے، چاہے کہیں کا ہو، یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر

سید محمد میر سوز جو اس تیسرے دَور کے پیرانِ سخن ہیں، سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں پیوندِ زمین ہو گئے۔

اِن کے علاوہ جو باکمالانِ سخن اُس زمانے میں واردِ لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے، میرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیران، خواجہ حسن حسن، میرزا فاخر مکین، میر ضاحک، بقاء اللہ خاں بقا، میر حسن دہلوی، میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور اُنھی کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمر الدین منت۔ میر ضیاء الدین ضیا۔ اشرف علی خاں فغاں دہلی سے لکھنؤ میں آ کے ایک مدت تک رہے اور یہیں چمکے۔ مگر آخر میں بیرونی قدر دانوں کی کشش سے کلکتے اور عظیم آباد میں جا کے نذرِ اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ اُن کے وطن نگینے میں ہوا، مگر وہ بھی ایک مدت تک اِسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ایکٹر تھے۔

صرف میرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسندِ درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دَور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی سبھا وہاں سے اُکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوشِ قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دَور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میرِ مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے، یہیں رہے، یہیں عروج پایا اور یہیں مرکھپ گئے۔ اس دَور کے رکنِ رکین، جرأت، سید انشا، مصحفی، قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک

ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں، لکھنؤ کی خاک میں۔

اُس زمانے میں دہلی کے صاحبانِ مذاق جس کثرت سے لکھنؤ آرہے تھے، اس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے اُس عہد کے ایک شریف وضع دار بُڈھے اور نورا نام ایک کسبی کی گفتگو نقل کی ہے۔ وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بی نورا کہتی ہیں:

"اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے، دلّی میں آتے تھے، دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا، کہیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی نہ چلو۔ تمھیں علیؑ کی قسم، آٹھوں میں مقرر چلیو۔"

اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے، وہ اگرچہ نہایت ہی دل چسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اُسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہیں اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیاں کی ہیں، جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں شرفا و کملا درکنار، رنڈیاں تک آ آ کے لکھنؤ میں بستی جاتی تھیں۔ اور جو لوگ دہلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے، اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا دل بہلاتے تھے۔

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ کو بلا لحاظِ امتیاز وعہد، ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنابیں کھینچ کے، پانچواں دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ ناانصافی ہے۔ اصلی پانچواں دور صرف ناسخ و آتش کا تھا جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی، بہت سے پُرانے محاورات ترک ہو گئے، نئی بندشیں پیدا ہوئیں، اور اُس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی۔ اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری

کی قلمرو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکّہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دَور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر، صبا، رند، گویا، رشک نسیم دہلوی، اسیر، نواب مرزا شوق، اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبانِ مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ اور دہلی میں مومن، ذوق، غالب نغمۂ شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اِس دَور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظِ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد ساتواں دَور امیر، داغ، منیر، تسلیم، مجروح، جلال، لطافت افضل، اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دَوروں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحتِ زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑلی تھی چند ہی روز میں شعر کہنا، لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہو گی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

(۱۰)

فارسی شاعری کا اصلی اُٹھان مثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صنفِ شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے پڑی۔ پھر نظامی، سعدی، مولانائے روم، خسرو، جامی اور ہاتفی وغیرہ نے اس میں اعلاترین شہرت و نام وری حاصل کی۔ اُردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اِس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں اُن کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا جو

بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگ وار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں اُن کا نشو و نما ہوا تھا، یہیں پرورش پائی تھی، اور یہیں کی آب و ہوا کے آغوش میں اُن کی شاعری پلی تھی۔ کیوں کہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے اُن کی مثنوی بے نظیر و بدر منیر لکھوائی، وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اُسی زمانے میں مرزا محمد تقی خاں ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اور لکھنؤ میں مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق اُبھرا تو پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم، آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت اور نواب مرزا شوق نے بہارِ عشق، زہرِ عشق اور فریبِ عشق لکھیں۔ اور انھیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالم گیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنا و اعلا کی زبان پر ان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیش تر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذتِ عشق نام کی ایک مثنوی لکھی تھی، وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے، انھیں کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ اُن کی ہے اور نہ اُن کے زمانے کی ہے۔

اِن سب مثنویوں کے دیکھتے، مثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیوں سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نومشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اِس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے، اُسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی، جس میں غلطیوں سے پاک رہ کے تشبیہات، استعارات اور رعایتِ لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس، وہ مثنوی مٹ گئی۔ اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی، اس پر غالب نہ آ سکی۔ دہلی میں اُن دنوں مومن خاں نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو

بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئیں۔

مومن خاں کے مذاقِ شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات وصفات کو مشخص کرکے اپنے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خاں کے ایک شاگرد نسیم دہلوی، لکھنؤ میں آئے اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہوگئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے استاد کے رنگ کو خوب چمکایا اور اُن کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اردو مثنوی میں نظیری و عرفی و صائب کی خیال آرائیاں دکھا دیں اور نظمِ اردو میں جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لاکے کھڑے کر دیے۔ اِدھر آخر زمانے میں مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامۂ شفقیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اردو پبلک کے سامنے پیش کردی کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خاں کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنویِ میر حسن اور گلزارِ نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ وموازنہ کیا کرتے ہیں، جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گلزارِ نسیم کو نظیر اکبر آبادی کے بنجارا نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اُسے مثنویِ میر حسن کے مقابلے میں رکھنا، اُردو شاعری کی سخت تذلیل وتوہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میر حسن اور مثنوی طلسمِ الفت کا۔ اور اگر گلزارِ نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے، تو مثنوی میر حسن اور گلزارِ نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لیے کہ مثنویِ میر حسن، لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف، مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن میں اظہارِ کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کم زور پڑ گئی تھی لیکن بہ عہدِ سلاطینِ صفویہ ایران میں مذہبِ شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائبِ اہلِ بیتِ رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شعرا کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتمِ حسین میں دو ایک مرثیے بھی موزوں کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر، مرثیہ گو" پھر جب مذہبی اعتبار سے دولتِ صفویۂ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدر دانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور دراصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنھوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا اور فارسی معاشرت اُن کی امیرانہ زندگی اور اُن کے تمام کمالات کا مرکز تھی نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی، ہندوستان میں آتے ہی آنکھوں پر بٹھایا جاتا اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہو کا مذہب سُنّی ہونے کی وجہ سے، ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراساں سے آیا تھا۔ اس لیے یہاں ایرانی بالکل کُھل گئے۔ اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے، اُسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہلِ دربار نے اُن کے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا۔ اور ایرانیت جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلی ہوئی تھی، چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔ غرض سودا و میر کے زمانے میں میاں سکندر، گدا، مسکین اور افسردہ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی

چھوٹی نظمیں شہادتِ امام حسینؓ کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سنایا کرتے۔ اُن کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی اور مرثیوں کی موجودہ صنفی کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحب زادے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا۔ اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالاتِ شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہ تاب بن کے چمکے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا، اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکتِ الفاظ تھی، بلند خیالی تھی اور علم و فضل کا زور تھا۔ میر انیس میں سادگی، بے تکلف اور جذباتِ انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبدأ فیاض کی عنایت کے، سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فنِ مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا۔ اور ادبِ اُردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈنے لگی تھیں۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی بجائے معیوب ہونے کے، سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہلِ لکھنؤ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معترف و مداح ہوئے کہ سارا شہر دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دبیریا۔ اور ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقرروں اور خطیبوں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لیے خاص خاص کوششیں کی تھیں اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے، کلام کو اعضا و جوارح کے مناسب حرکات اور خط و خال کے

اشارات سے قوّت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیسؔ کے گھرانے کی ایجاد ہے جس کی ترقّی میں اب تک کوششیں جاری ہیں۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی میں اثر پیدا کرنے کے لیے اگر ان باکمالوں کی شاگردی کریں تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہوں۔

ڈراما کا فنِ سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے، اُس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اُردو میں بھی اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی۔ سنسکرت میں اعلا درجے کے ڈراما تھے، مگر اُن سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل ناآشنا ہو چکی تھی۔ رام چندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتّہ ہندوؤں میں مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اردو شاعری کو اُن سے کسی قسم کا تعلّق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اُپیرا کی طرح کھلے میدانوں میں رزمیہ نقالیوں کی شان سے دکھائے جاتے اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرایے میں مذہبی اسٹیجوں پر بعینہٖ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے، جو "رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دل چسپی پیدا ہو گئی۔ اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے اُنھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں وہ کنھیّا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی عورتیں، پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے اُنھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ پھر جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوامُ النّاس کے لیے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بہ خود ترقّی کرنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقّی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اُس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں امانت نے جو ایک مشّاق شاعر تھے، "اندر سبھا" لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جابہ جا مختلف جماعتیں اُن کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ

کرتے۔ اس اِندر سبھا میں اصولِ موسیقی کے مطابق دل کش دھنیں قائم کی گئیں اور سارا شہر اِندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میاں امانت کی اندر سبھا کی کامیابی دیکھ کے اور لوگوں کو بھی شوق ہوا اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے۔ اور سب کا نام "سبھا" قرار پاگیا۔ چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں، جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دل کش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹروں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمائشی دل فریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پرانا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروّج ہوا تھا، مٹ گیا۔ اوّل تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ اُن کا پہلا عام کھیل، امانت کی اندر سبھا تھا، اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سیبرے، ہریش چندر وغیرہ کے ایسے بیسیوں پرفارمنس ہو رہے ہیں اور اس مذاق کے ایکٹروں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو شرفا میں سے قومی مذاق اٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے۔ بہر تقدیر، اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اُردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہیں۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدّس ہوتے ہیں اور ان کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار، اُس کے بعد معشوق کا سراپا، اُس کی بے وفائیاں، پھر اُس سے رُوٹھ کے اُسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے، اُس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے معشوق کو جلانا، چھیڑنا، جلی کٹی سنانا اور

یوں اُس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا نظمِ اُردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ زمانۂ وسط کے قریب قریب تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں اور ان میں بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہیں۔ دہلی میں بھی بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت لکھے گئے، خصوصاً مومن خاں نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے، مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

اُمرا کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کر دیا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ اُن میں سب سے زیادہ مہمل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پُرلطف ریختی ہے۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ اُن کے کلام کو میں نے اوّل سے آخر تک دیکھا ہے۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گزری ہوئی بے حیائی کے، نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔ اِس کے بعد دہلی ہی کی خاک سے صاحبقراں تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آئے اور یہیں چمکے۔ اُن کا نام سید امام علی تھا اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں میں اُن کا نشو و نما ہوا۔ اُن کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دُور ہے، مگر پھر بھی اُس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا لطف ہے۔ لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دَور میں میاں مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے، کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعوں اور سُنّیوں کے متعصبانہ جذبات کا لحاظ کروں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے، کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے: ایک تولّا یعنی اہلِ بیتِ کرام اور خاندانِ نبوت کے ساتھ اظہارِ محبت۔ اور دوسرا تبرّا، یعنی اِس خاندانِ محترم کے دشمنوں سے اپنی برائت

ظاہر کرنا، جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سب و شتم کی صورت اختیار کر لی۔ اصولاً اس عقیدے میں سُنّی بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں، مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینوں جانشینانِ رسالت کو اہلِ سُنّت، افضلُ النّاسِ بعدَ انبیا، و رُسل، اور سچّے جانشینانِ رسالت مانتے ہیں۔ اور شیعہ ان کو غاصب و ظالم بتاتے ہیں، اور جب یہ بزرگ بھی ان کے عقائد میں خاندانِ رسالت کے دشمن قرار پائے تو ان سے بھی تبرّا واجب ہو گیا۔ جس کو مہذّب اور صاحبِ علم لوگوں نے اگرچہ برات کے صحیح معنوں کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق ان پر زبانِ سبّ و شتم دراز کرنے لگے اور یہی چیز سُنّی (اور) شیعوں کے باہمی تعصّب کی بنا قرار پا گئی۔

ان دونوں مذہبی چیزوں نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تولّا نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش میں لے کے جملہ اصنافِ شاعری سے بڑھا دیا، تو دشمنانِ خاندانِ نبوّت سے تبرّا کرنے کے جوش نے پرانی ہجو گوئی کو اختیار کر کے، اُسے "ہرزیہ گوئی" کے نام سے ترقّی دی۔ اس فن کے متعدد باکمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے، مگر افسوس یہ چیز بالتخصیص اہلِ سنّت کو ناگوار گزرنے والی تھی۔ عہدِ شاہی میں اس پر تلواریں نکل پڑا کرتی تھیں اور انگریزی میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریاں اور مقدمے بازیاں ہو جایا کرتی ہیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ گوئی و ہرزیہ خوانی کو مکانوں کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور مابہ النّزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گویوں نے اپنی بے ہودہ گوئیوں اور فحاشیوں میں بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میاں مشیر کو حاصل ہوئی ہجو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی، مگر مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا، بندشِ الفاظ، طرزِ ادا، اور استعمالِ تشبیہات میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی اور صحبت کو مارے ہنسی کے

لٹادینے اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لیے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا، اُس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں۔ ابتذال میں بھی لطف پیدا کر کے، اُسے شایستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دینا، اُن کا خاص جوہر تھا۔ جو اُن سے پہلے اور اُن کے بعد کسی کو نہیں نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے میں میاں چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانۂ وسطیٰ میں عاشور علی خاں نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و بامذاق رئیس تھے، اُن کے وہاں کی صحبت، اُس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین نمونہ تھی۔ انھی نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھی کی صحبت میں صاحبقراں کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر میں پیشاب پاخانے کی رعایت رکھتے اور اُن کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہوں گے۔ مگر چوں کہ اُن کو ایک قسم کی خصوصیت تھی، ہم نے ان کا ذکر کر دیا۔ ان کے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں، مگر اُن کے مذاق نے ان خوبیوں کو بھی گندہ اور پلید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دل چسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت رساں نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے، مگر اتنا نہیں جتنا ہمیں اپنی زبان میں نظر آتا ہے۔ فارسی، عربی سب زبانوں میں یہ امتیاز موجود ہے۔ مگر اردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا پُرانا مذاق تھا کہ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں اور مرد کبھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال ادا کراتے ہیں تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لیے ان کی زبان اختیار کر لیتے ہیں یہی حال انگریزی کا ہے۔ اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردوں کی زبان میں رہی، یہاں تک کہ اس میں عورتیں کہتی بھی ہیں، تو مردوں کے کہتی ہیں، مردوں ہی کی زبان اختیار کرتی ہیں اور اپنے لیے ضمیریں تک مذکر استعمال کرتی ہیں

اگر شاعر کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔

اردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانوں میں خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں ضرورت کے موقعوں پر یہ زبان موزوں کی تھی مگر وہاں تک مضائقہ نہ تھا۔ میاں رنگین نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا، جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداءً مہذب لوگوں کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلافِ تہذیب جانا، چناں چہ سید انشا کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہیں کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے، اُس میں وہ بزرگ فرماتے ہیں "اور سب سے زیادہ ایک اور سُنیے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا، انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے، اُس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اُس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اُس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا، بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیوں کر کہیے؟ سارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے، رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں:

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی ‏ ‏ کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اُس بے چارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم لیکن بچارہ برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغے کا چلانے والا تھا۔ تو ایسا قابل کہاں سے ہوا؟ اور شہدپن مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے، اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور اُن کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے:

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو ‏ ‏ یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے: کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اُس

میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اوپر والیاں، چیلیں۔ اوپر والا، چاند۔ اُجلی، دھوبن وغیرہ وغیرہ۔"

مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مر گئے، نوجوانوں کی رنگینی نے رنگین کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا اور ریختی اردو کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں اسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے میں اس زبان کو میرحسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلا درجۂ کمال کو پہنچایا، تعریف نہیں ہو سکتی۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے، یہی نہیں پتا چلتا کہ موزوں کرنے میں شاعرانہ ضرورتوں نے بولنے کی زبان پر کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہیں۔ لیکن غزل گوئی میں رنگین کی جانشینی جان صاحب نے کی، جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خاں کی خراد پر چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے، مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے غزلیں کہیں، واسوختتی کہی، اور اور بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے ایک پاک دامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابلِ ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی، اس لیے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو، مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔

(۱۱)

نثر اردو کی عمر نظم کے دیکھتے کم ہے۔ مدت تک تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ وضع رہی کہ اگرچہ بعض لوگ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، مگر عام رجحان اور میلان اردو غزل سرائی کی طرف تھا۔ اور ہندوستان میں اردو شاعروں کی تعداد فارسی شاعروں سے بہت زیادہ تھی

مگر نثر میں سارے ملک کو فارسی ہی میں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں لکھی جاتیں، دین و مذہب کی کتابیں فارسی میں تصنیف ہوتیں، یہاں تک کہ بوڑھے سے لے کے بچے تک سب فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے۔ بچّوں کو مکتب میں فارسی ہی کی انشائیں پڑھائی جاتیں اور فارسی ہی میں خط لکھنا انھیں سکھایا جاتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بول چال میں اُردو زبان چاہے کیسی ہی شیریں و فصیح ہو گئی ہو، لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور سب گونگے ہو گئے۔

پہلے پہل اردو میں میر امّن دہلوی نے انگریزوں کی حوصلہ افزائی و ہدایت سے اپنی کتاب چار درویش لکھی۔ اُسی زمانے میں میرزا علی لطف نے اپنا تذکرۂ شعرائے اردو تصنیف کیا، جو عبداللہ خاں صاحب مقیم حیدرآباد کی کوشش سے چھپ گیا ہے۔ اُسی زمانے کے قریب مولوی اسماعیل صاحب شہید نے توحید و اتباعِ سنّت پر اپنی کتاب تقویۃ الایمان تحریر فرمائی۔ یہ کتابیں اب چاہے جس نظر سے دیکھی جائیں، اُن دنوں ادبی کمال دکھانے کے لیے نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان کی تصنیف سے صرف مقصود یہ تھا کہ بے تکلف اور سیدھی سادی زبان میں مطلب ادا کر دیا جائے اور عوام فائدہ اٹھا سکیں۔ مذکورۂ بالا بزرگوں کو اگر ادبِ اُردو کا کمال دکھانا ہوتا تو اُس زمانے کی انشا پردازی کے مطابق ظہوری و نعمت خانِ عالی اور ابوالفضل و طاہر وحید کا رنگ اختیار کرتے جو اُس وقت ادبی دنیا پر حکومت کر رہا تھا اور جس کے بغیر کوئی تحریر ملک میں قابلِ داد نہ تصوّر کی جاتی۔ تحریر ہی نہیں، گفتگو میں بھی اگر زیادہ تہذیب و شایستگی ملحوظِ خاطر ہوتی تو وہی انداز اختیار کر لیا جاتا، جیسا کہ انشا نے میرزا مظہر جانِ جاناں کی تقریر کے چند الفاظ نقل کر کے بتا دیا ہے۔

سچ پوچھیے تو اردو کی نثاری لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی جب کہ پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب اور اپنی دوسری کتابوں کو شائع کیا۔ اُسی زمانے میں نورتن بھی لکھنؤ میں لکھی گئی جس کے مصنف محمد بخش مہجور شاگردِ جرأت لکھنؤ ہی کی صحبت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔

رجب علی بیگ سرور نے سچ یہ ہے کہ انشا پردازی کا اعلا کمال دکھایا ہے اور جس وقت وہ کتاب شائع ہوئی ہے، اردو صحبتوں میں حیرت کے ساتھ دیکھی گئی۔ مگر بدقسمتی سے انھوں نے دیباچے میں میر امّن پر حملہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے اُن کے تمام کمالات اہلِ دہلی کے نزدیک خاک میں مل گئے۔ یہاں تک کہ میر محمد حسین آزاد کے سے مہذب بزرگ بھی انھیں "لکھنؤ کا شہدا" فرماتے ہیں۔ اور معلوم نہیں رجب علی بیگ مرحوم سے اس گستاخی کا انتقام کب تک لیا جائے گا؟ میر امّن کا ہنر انشا پردازی انگریزوں کو ان دنوں چاہے نظر آگیا ہو مگر ہندوستان کے اہلِ زبان میں سے کسی کو نہ نظر آیا تھا اور نہ نظر آسکتا تھا، اس لیے کہ انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس وقت تک ملکی لٹریچر کا مذاق نہیں بدلا تھا اور مشرقی ادب خیالوں اور دماغوں میں بسا ہوا تھا۔

ادبی رنگ کے متعلق میں نے کئی بار لکھا ہے اور پھر لکھتا ہوں کہ وہ بالکل تعلیم اور مذاق کی پرورش سے وابستہ ہوتا ہے جس طرح غذاؤں، خوشبوؤں اور رنگوں اور دیگر تمام چیزوں کو گرد کی معاشرت پسندیدہ بنایا کرتی ہے اور مختلف قوموں اور ملکوں میں اس قدر اختلاف رہتا ہے کہ ایک کی لذیذ ترین اور محبوب ترین چیز دوسرے کے نزدیک نہایت ہی بدمزہ اور سخت قابلِ نفرت ہوتی ہے۔ ویسے ہی ادب اور لٹریری مذاق کا حال ہے کہ جو رنگ ایک قوم میں پرورش پاکے دماغوں اور زبانوں پر چڑھ جاتا ہے، دوسری قوم کے نزدیک بے ہودہ، بے لطف اور بدمزہ ہوتا ہے اور صحیح فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے۔

جاہلیتِ عرب میں فصاحت و بلاغت کا رنگ یہ تھا کہ مقفا فقرے لائے جائیں۔ عبارت میں تناسب و متداول الفاظِ مترادف آئیں۔ اور ایک ہی مطلب بار بار ادا کرکے موثر اور دل چسپ بنایا جائے۔ اسی مذاق کو قرآن نے، چوں کہ وہ لسانِ قوم میں تھا، نہایت معجزنما طرز سے تکمیل کو پہنچایا۔ پھر وہی مذاق ادبِ عربی کا عنصرِ اعظم بن گیا۔ آج کل کے معیار سے دیکھا جائے تو عربی کی فصیح ترین کتابیں مقاماتِ حریری و تاریخِ تیموری وغیرہ میں قافیہ پیمائی،

تطویلِ بے جا اور بے ضرورت الفاظ لانے کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا مدّتوں اور صدیوں تک ایک دنیا مزہ لیتی رہی ہے یہی رنگ فارسی کے ادیبوں نے اختیار کیا۔ اور جوں جوں ادبی ترقی ہوتی گئی، وہی رنگ پختہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اور اس مذاق کے دماغوں میں بسے ہونے کی وجہ سے وہی رنگ اردو کے اُدبائے اوّلین نے اختیار کیا اور دنیا سے داد پائی۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ چار درویش جن دنوں لکھی گئی ہے، اُن دنوں وہ سوا انگریزوں کو پسند ہونے کے، جو اردو کو جانتے ہی نہ تھے، ہندوستان کے اہلِ علم میں کوئی ادبی کمال تصوّر کی گئی ہوگی، بالکل بے اصل ہے۔

اب انگریزی کے اثر سے بے شک ایسا زمانہ آگیا ہے جب اردو کو پُرانے لٹریچر نے جو زیور اور لباس پہنایا تھا، اُتار لیا گیا اور نئے مغربی کپڑے پہنائے گئے چار درویش اور اس کی سی دوسری کتابیں چوں کہ پُرانے ادبی زیور و لباس سے معرّا تھیں، اس لیے لوگوں کو پسند آئیں۔ اس لیے نہیں کہ ان میں کوئی خاص خوبی تھی بلکہ اس لیے کہ اُس پُرانے مقبولِ عام قومی لٹریچر کے رنگ سے معرّا تھیں جو موجودہ لوگوں کو ناپسند ہے۔

اُسی زمانے میں لکھنؤ میں مولوی غلام امام شہید نے اپنا مشہور مولد شریف لکھا، جو اُس وقت کے ادبی مذاق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور مذہبی مقبولیت کی وجہ سے آج تک بہت پسند ہے۔

مگر موجودہ نثرِ اردو اصل میں دہلی ہی سے نکلی اور ہمیشہ دہلی کی زیرِ بارِ احسان رہے گی۔ مرزا غالب نے اردو انشا میں بے تکلفی کا رنگ اختیار کیا جو موجودہ مذاق سے بہت ہی قریب ہے۔ اگرچہ وہ بھی کبھی کبھی قافیہ بندی کی رعایت کر جاتے ہیں، لیکن اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو قافیے کا خیال بھی غور کرنے سے آتا ہے۔ موجودہ تعلیم نے لوگوں کو اِس رنگ کو قبول کرنے کے لیے خوب تیار کر دیا تھا، ہر صحبت میں واہ واہ ہونے لگی۔ اُن کے بعد سر سیّد نے اُس سادگی میں متانت پیدا کی مگر اس کوشش کے ساتھ کہ زبان دقیق نہ ہونے

پائے اور ایسی رہے کہ ہر ادنا و اعلا اسے سمجھ لے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس میں متانت کے ساتھ اور لطف پیدا کر دیا۔ جب کہ لکھنؤ کے لوگ انگریزی کے اثر سے دُور ہونے کے باعث ہنوز پُرانے ہی رنگ کے دیوانے تھے۔ یہاں واجد علی شاہ کے آخر ایّام زندگی تک رنگین اور مُقفّا عبارت لکھی جاتی تھی اور لوگوں کو اس سادگی کا مزہ نہیں ملنے پایا تھا۔

اب علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق۔ آگرے سے تیرھویں صدی اور لکھنؤ سے اودھ پنچ نکل رہے تھے، جن میں سے ہر ایک نثرِ اردو کی ایک ممتاز شان رکھتا تھا۔ تہذیب الاخلاق میں متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ قومی درد کا سوز و گداز تھا، سلجھی ہوئی صاف زبان تھی، اور نئے مغربی فلسفہ و ادب سے لیے ہوئے خیالات اور اثر ڈالنے والے مضامین و خطبات تھے۔ تیرھویں صدی میں اعلا منشیانہ قابلیت کے ساتھ قدیم ادبی مذاق کی نگہ داشت، نئی خیال آرائیوں اور جدّتوں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اور پُرانا مشرقی لٹریچر کچھ ایسی جدّت طرازیوں کے ساتھ نئے لباس میں ظاہر کیا جاتا تھا کہ نئے اور پُرانے دونوں گروہوں سے بے اختیار "واہ واہ" کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اودھ پنچ میں زبان اپنی اصلی شان میں دکھائی جاتی تھی جس میں مذاق کا پہلو غالب رہتا۔ اس میں مختلف لکھنے والے تھے اور ہر ایک کا مذاق خاص لطف اور خاص خوبیاں رکھتا تھا۔ منشی سجّاد حسین ایڈیٹر کی شوخیاں، مرزا مچھو بیگ صاحب کی کوثر کی دھوئی ہوئی زبان، منشی احمد علی کسمنڈوی کی فارسیت کی اعلا ادبی اور شاعرانہ دل چسپیاں ظاہر کرنے والا رنگ، پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی ہندی نظمیں اور اُن کی خوبیوں کو نہایت دلچسپی کے ساتھ ظاہر کرنے والے مضامین، اُردو نثر میں ایک عجیب زندگی و شگفتگی پیدا کر رہے تھے۔

اسی اثنا میں اودھ اخبار کے ساتھ پنڈت رتن ناتھ کا ناول "فسانۂ آزاد" شائع ہونا شروع ہوا، جس نے ملک پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور اردو دنیا ناول نویسی کے مذاق سے آشنا ہو کے اُس کی بے انتہا فریفتہ ہو گئی۔ فسانۂ آزاد میں جہاں مصنّف نے اپنے قلم سے

کوئی سین دکھایا ہے یا کوئی واقعہ لکھا ہے، وہی فسانۂ عجائب کا پرانا رنگ ترقیوں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اور جہاں دوسروں کی زبان سے گفتگو کرائی ہے، بہت ہی سادی اور بے تکلف زبان رکھی ہے خصوصاً عورتوں کی زبان بہت ہی پاکیزہ ہے گو کہ جابہ جا غلطیاں بھی ہوگئی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ اپنی کوشش میں وہ جس درجے تک پہنچ گئے ہیں، اُن سے پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔

یہی زمانہ ہے جب کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے گورنمنٹ کی فرمائش سے تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ایک ایسی زبان ملک کے سامنے پیش کی جو کہیں روانی اور صفائی میں بے نظیر ہے اور کہیں لغاتِ عربی سے مملو ہونے کے باعث سخت دقیق و بلیغ۔ اور اسی عہد میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد کا لٹریچر ایک بہت ہی پسندیدہ رنگ پیش کر رہا تھا خصوصاً اُنھوں نے زبانِ اُردو کی تاریخ اور تذکرۂ شعرائے اردو لکھ کے، ادبِ اردو میں خاص نام وری حاصل کی۔ اُسی زمانے میں ۱۸۸۲ء میں محشر نام ایک ہفتے وار رسالہ میں نے مولوی محمد عبدالباسط صاحب محشر کے نام سے نکالا، جس کے ذریعے سے ایڈیسن کا رنگ اُردو میں ایسے دل کش عنوان اور موزون و مناسب الفاظ و خیالات میں پیش کیا گیا کہ ملک یک بہ یک چونک سا پڑا، ساتھ ہی میرے مضامین اودھ اخبار کے کالموں میں شائع ہونا شروع ہوئے جنھوں نے ملک کے سامنے ایک بالکل نیا لٹریچر پیش کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہر طرف سے مرحبا کی صدائیں سنی جانے لگیں۔ یکایک نظر آیا کہ اکثر مضمون نگار اسی رنگ کو اختیار کر رہے ہیں اور ملک کا عام رجحان اسی طرف ہے، اسی درمیان میں میں نے اپنا ناول دلچسپ اور موثر ڈراما شہیدِ وفا ملک کے سامنے پیش کیا اور ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہونے لگی۔

آخر ملک کا اصرار و تقاضا دیکھ کے آغازِ ۱۸۸۷ء سے میں نے رسالۂ دلگداز جاری

کیا جس کا لٹریچر انگریزی دانوں اور پرانے مذاق کے لوگوں دونوں میں مقبول ہوا پھر ۱۸۸۸ء سے اس کے ساتھ تاریخی ناولوں کا سلسلہ جاری کیا گیا جن میں سب سے پہلا ناول ملک العزیز ورجنا ہے۔ ان ناولوں کو ملک نے جس شوق سے لیا اس کے بیان کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ انھی ناولوں کی وجہ سے واقعات کے معلوم کرنے اور کتابوں کے مطالعے کا شوق پڑھنے کی بنیاد پڑی انھی ناولوں کے ذریعے سے ملک میں تاریخ کے پڑھنے اور واقعات عالم سے دل چسپی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور انھی ناولوں اور دل گداز کے صفحوں نے وہ رنگ پیدا کیا جس پر موجودہ ادب اردو کی بنیاد قائم ہے۔

بہ ہر حال نثر اردو کا تعلق جہاں تک پرانے ادبی رنگ سے ہے، اس کی بنیاد لکھنؤ میں پڑی۔ ہاں جدید رنگ کا آغاز دہلی سے ہوا مگر اس کوشش میں جہاں تک ممکن ہوا، لکھنؤ نے دہلی کی رفاقت کی خصوصاً ظرافت کا مذاق تو لکھنؤ ہی سے پیدا ہوا اور لکھنؤ میں تکمیل کو پہنچا۔

(۱۲)

لیکن زبانِ اردو کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں، وہ شاعروں، ادیبوں، نثاروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں، مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعتِ زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دل چسپیاں پیدا کیں۔

ان میں سے زیادہ قابلِ توجہ داستان گوئی ہے جو دراصل فی البدیہہ تصنیف کرنے کا نام ہے۔ یہ فن اصل میں عربوں کا ہے، جہاں عہدِ جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی صحبتیں مرتب ہوا کرتی تھیں لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے اُن کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ امیر حمزہ کی داستان جو داستان گویوں

کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے، وہ دراصل فارسی میں تھی۔ اور کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اُسے تصنیف کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ملوکِ تغلق کے عہد میں داستانِ امیر حمزہ موجود تھی۔

دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے۔ یہاں انھوں نے اُن کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصرِ اعظم قرار دے لیا۔ چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اُس کو اس قدر فروغ ہوگیا کہ کوئی دولت مند نہ تھا جس کی سرکار میں کوئی داستان گو نہ مقرر ہو۔ سیکڑوں داستان گو پیدا ہوگئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گویوں کو حاصل تھا۔ دہلی میں بھی دو ایک صاحبِ کمال داستان گو آج تک پڑے ہیں، مگر لکھنؤ میں اُن کا شمار بہت زیادہ ہے۔ اور اُن کے طرزِ تقریر کا اثر عوامِ شہر کی زبانوں پر بے حد پڑ گیا ہے۔ ناولوں کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان کو داستان گویوں ہی کی زبان میں قلم بند کر لیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے باکمال داستان گو پیش کر سکا جنھوں نے ضخیم جلدیں لکھ کے اردو داں پبلک میں پھیلا دیں۔ چنانچہ جاہ اور قمر کے تصانیف ملک میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

داستان کے چار فن قرار پا گئے ہیں: رزم، بزم، حسن و عشق اور عیّاری۔ ان چاروں فنوں میں لکھنؤ کے داستان گویوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سُنے نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اور تصویروں کا نہایت گہرا دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا ان لوگوں کا خاص کمال ہے۔

سوشل تفنّن، مذاق، ظرافت اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ میں علمِ زبان کے کئی فن پیدا ہوگئے، جن میں کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِنھی

میں سے ایک فن پھبتی کہنا ہے۔ اس کو دراصل شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے تعلق ہے۔ لیکن اس میں اتنی خصوصیت ہے کہ یہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے اُس کے عیب کے نمایاں کرنے، اور برجستہ کوئی انوکھی، ہنسانے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنے والی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے۔ لکھنؤ کے ادنا ادنا لڑکے، بازاری عورتیں، جاہل دکان دار، ادنا طبقوں کے اہلِ حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیاں کہہ جاتے ہیں کہ باہر والوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب کربلائے معلّٰی کی زیارت کر کے واپس آئے اور براق کپڑے پہن کے دوستوں میں آ کے بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا: "ایں، یہ فرات کا بگلا کہاں سے آ گیا؟" ایک بوڑھے دولھا خضاب کر کے دُلھن بیاہنے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے۔ زنانے سے نکل کے وہ محفل میں آ رہے تھے۔ جوتا اُتارنے کے لیے جھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے ٹیک کے چلے۔ کسی کی زبان سے نکلا: دولھا کہاں ہیں؟ شوخ مزاج رنڈی جو کھڑی مجرا کر رہی تھی، ہنس کے بولی: لے وہ منیوں منیوں چلا تو آتا ہے۔ ایک کبڑا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا، صدا یہ تھی کہ: ابے بھئی، یہ کنکوّے کون لوٹے گا؟ کیا اس سے زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے؟ نازک ترین استعارہ وہ ہے جس میں مشبّہ اور مشبّہ بہ دونوں کا نام نہ لیا جائے، صرف مشبّہ بہ کی کوئی خصوصیت بتا کے کلام میں لطف پیدا کر دیا جائے۔ اس کی اس سے بہتر مثال کون ہو سکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا، نہ لگّی کا جس سے کنکوّے لوٹے جاتے ہیں، اور پھر اتنا کہہ کے کہ "کنکوّے کون لوٹے گا" یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگّوں کے برابر ہیں، جن سے کنکوّے لوٹے جاتے ہیں۔ اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگوں کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کی صدہا ہزارہا مثالیں ہیں جو یہاں کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت سُنی جاتی ہیں۔

دوسرا "ضلع" ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس نے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو میں آ کے خاص رنگ پیدا کر لیا ہے۔ ضلع میں کوشش کی جاتی ہے کہ

جس چیز کا تذکرہ آجائے اُس کے تمام متعلقات کسی نہ کسی پہلو سے باتوں میں لے آئے جائیں۔ آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے ضلع بولنے میں باکمال مانے جاتے تھے۔ امانت نے اپنی شاعری میں رعایت کی اِس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیوں سے قطعِ نظر کر کے رعایت ہی کو اپنا مقصد قرار دے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے ضلع بولنے کے حکم میں داخل ہو گیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتوں میں اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ امانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ ضلع بولنے میں اہلِ لکھنؤ کے عُشرِ عشیر درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اِس فن میں ایک کتاب بھی شائع ہو گئی (ہے)۔

تیسرا فن تک بندی ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ پیمائی ہے۔ بہت سے جاہل جب اِدھر توجہ کرتے ہیں تو جواب سوال میں اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک ہندو بڑھیا کے کانتے والا دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا۔ صورت دیکھتے ہی صدہا بازاری لونڈے اُسے گھیر لیتے اور وہ سرِ راہ خوانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً لونڈوں سے اُس سے تک بندی میں مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین میں گالیوں کی بوچھار ہوتی مگر شرط تھی کہ کوئی گالی تُک سے باہر نہ ہو اور کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔ ہم نے اُسے بیسیوں بار دیکھا گھنٹوں اُس سے مقابلہ رہتا مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ جواب میں عاجز رہا ہو کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈھ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔

اسی طرح مذاق اور گفتگو میں طرح طرح کی خیال آفرینیاں ہوتی تھیں۔ اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا حیرت میں رہ جاتے۔ یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا۔ شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شُد بُد ہو جاتا، طبع آزمائی شروع

کر دیتا۔ جہلا و عوام، ادنا طبقے کے لوگوں اور گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک میں شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ ان پڑھ کبڑیے شاعر تھے اور جہلا کی زبان بھی اس قدر شستہ و رفتہ، اخلاقی حفظِ مراتب کے الفاظ سے مملو اور تمدنی آداب سے لب ریز تھی کہ اکثر صاحبِ علم اُن کی گفتگو سُن کے ششدر رہ جاتے اور کسی کو ان پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں، شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت کے غوامض سے اس قدر آراستہ و پیراستہ تھیں کہ اوروں کو سمجھنا بھی دشوار تھا۔

ادنا طبقے والوں نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دل چسپیاں پیدا کر لی تھیں۔ مثلاً ایک فن خیال کا پیدا ہوگیا۔ لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کر کے دائرے پر گاتے۔ اس کا نام خیال اس لیے رکھا گیا کہ ہر شخص اپنی تخئیل کا جوہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے۔ اس فن میں یہاں بہت سے باکمال پیدا ہوئے جن کو اعلا سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبتوں سے گو کوئی تعلق نہ تھا، مگر یہ جائے خود اگر غور کیجیے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہدِ جاہلیتِ عرب میں تھی۔

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والوں کا پیدا ہوگیا۔ اُن لوگوں کی یہ شان تھی کہ ہر زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزوں کرتے۔ جو جیسا ہوتا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا صاحبِ اثر اور دولت مند ہو، اُسے ویسا ہی بڑی بے باکی سے دکھاتے اور ثابت کرتے کہ ملک و قوم کو اس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا بڑا ضرر پہنچا۔ پھر اپنی اُن نظموں کو ایک شعر خوانی کی خاص وضع میں ڈنڈے بجا بجا کے سناتے۔

عورتوں کی زبان مردوں کے مقابل ہر ملک اور ہر قوم میں زیادہ شستہ اور دل کش ہوتی ہے مگر لکھنؤ میں یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی معزز بیگموں کی زبان میں علاوہ نسائی دل فریبیوں کے، ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں پیدا

ہو گئی تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اور غور کیجیے تو صحتِ الفاظ، پیاری بندشیں اور طرزِ ادا کی نزاکتیں بتاتیں کہ زبان کی خوبیاں اس سرزمین میں کس اعلا کمال کو پہنچ گئی ہیں۔

(۱۳)

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد و قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا۔

یہاں کے علم و فضل کا آغاز علمائے فرنگی محل سے ہوا، جن کے حالات کی طرف اس مضمون کے آغاز میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ علم بے شک یہاں دہلی ہی سے آیا ہوگا لیکن پرانے زمانے میں علمائے دہلی میں سے صرف ایک شیخ عبدالحق نظر آتے ہیں جنھوں نے حدیث اور علوم دینیہ میں شہرتِ دوام حاصل کی۔ فرنگی محل کے سے کسی دارالعلوم کا وہاں کسی زمانے میں پتا نہیں لگتا۔ ہاں فرنگی محل کے مشہور ہو جانے کے بعد دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان البتہ بہت مشہور ہوا، جن کے فیض و برکت سے آج ہندوستان کے تمام شہروں میں علم حدیث کی تعلیم جاری ہوئی لیکن اگر علم حدیث کی تعلیم اس نام ور خاندانِ دہلی کی یادگار ہے، تو اس کے ساتھ ہی صرف و نحو، منطق و حکمت اور معانی و بیان اور دیگر فنونِ درسیہ کی تعلیم لکھنؤ کی نام ور یونیورسٹی فرنگی محل کی یادگار ہے۔

غائر نظر ڈالنے اور جستجو سے صاف پتا چلتا ہے کہ جیسے معقولی علما لکھنؤ اور خاص فرنگی محل میں پیدا ہوئے، کبھی کسی زمانے میں اور کسی جگہ ہندوستان میں نہیں پیدا ہو سکے تھے۔ اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ سلسلۂ درس میں جو کتابیں جاری ہیں وہ یا تو سلف کے نام ورانِ عجم کی تصنیف ہیں یا فرنگی محل والوں کی۔ یا اُن لوگوں کی جنھوں نے فرنگی محل سے فیض حاصل کیا تھا۔

مجتہدینِ شیعہ کا آغاز بھی فرنگی محل ہی سے ہوا۔ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے بھی ابتداءً کتبِ درسیہ فرنگی محل ہی میں پڑھی تھیں، پھر عراق میں جا کے علمائے کربلا و نجف کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور واپس آ کے خود فرنگی محل والوں کی تصدیق و تقریب سے مجتہد اور شیعہ فرمان روایانِ وقت کے مقتدا قرار پائے۔ انھوں نے چوں کہ عراق میں تعلیم پائی تھی، لہٰذا عربی کا نیا ادبی ذوق اپنے ساتھ لائے۔ اور ادبیت میں خاندانِ اجتہاد اور لکھنؤ کے شیعہ علما کو فرنگی محل والوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی اور آج تک حاصل ہے۔

علمائے شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلاترین مرکز بنا دیا جس نے مفتی میر عبّاس صاحب کا ایسا ادیبِ گراں پایہ پیدا کیا۔

علومِ دینیہ میں سے فقہ، اصولِ فقہ، کلام، اور عقائد میں، علومِ ادبیہ میں سے نحو و صرف اور معانی و بیان میں، علومِ عقلیہ میں سے منطق، فلسفہ، طبعیّات و الٰہیات میں، اور علومِ ریاضی میں سے اقلیدس اور ہیئت میں علمائے فرنگی محل کو خاص ناموری حاصل تھی اور سارے ہندوستان میں ان علوم کی تعلیم کا مرکزِ اصلی لکھنؤ تھا۔ ادب، شاعری اور عروضِ عربی کو علمائے شیعہ و مجتہدینِ لکھنؤ نے اپنا بنا لیا تھا۔

مناظرہ، جس سے ہماری مراد یہاں خاص کلامی مباحث اور شیعہ و سنّی کا باہمی ردّ و قدح ہے، اِس فن کا آغاز ہندوستان میں قاضی نور اللہ شوستری سے ہوا جو ایران سے اِس لیے آئے تھے کہ سُنّیوں کی تردید کریں۔ جب ہی سے یہاں شیعہ و سنّی میں جھگڑے پیدا ہو گئے! اور آخر قاضی صاحب کے ایک مدّت بعد شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی نے شیعوں کی رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی۔ مولوی دلدار علی صاحب نے اس کے بعض ابواب کی تردید میں کچھ لکھا۔ پھر مولانا حیدر علی پیدا ہوئے جو اصل میں رہنے والے تو فیض آباد کے تھے مگر ان کا نام لکھنؤ ہی سے چمکا۔ انھوں نے منتہی الکلام لکھی جو شیعوں کی تردید میں اعلاترین کتاب سمجھی جاتی تھی۔ اسی زمانے میں مولوی لطف اللہ صاحب نے جو لکھنؤ میں

تحصیلِ علم کر کے یہیں کے ہو گئے تھے، اپنی کئی کتابیں لکھیں جن میں تحقیق و تردید کے علاوہ شوخیِ بیان بھی تھی۔ میاں مشیر نے اُن کی تردید بڑے زور شور سے کی لیکن سچ یہ ہے کہ اُن کی کتاب، تردید کے درجے سے گزر کے ہزل گوئی و ہجو کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ آخر میں مولوی حامد حسین صاحب نے سنّیوں کے مذہب کی تردید میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ دیں، جن میں محدّثانہ شان سے سنّیوں کے مذہب کی تردید کی ہے۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالشکور صاحب بھی اِس فن میں اہلِ سنّت کی طرف سے نمود حاصل کر رہے ہیں۔

ہمارے مذاق میں مذہبی ردّ و قدح چاہے کسی فریق کے لوگوں کو خوش کر دے مگر بالکل بے نتیجہ چیز ہے۔ اور اس کے نفع سے مضرت بڑھی ہوئی ہے لیکن اس موقع پر ہمیں صرف یہ دکھانا ہے کہ اس فن میں بھی لکھنؤ نے جو عروج حاصل کیا ہے، اِس سے پہلے کبھی کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکا تھا۔

علوم دینیہ میں سے لکھنؤ میں تفسیر، حدیث، رجال اور تاریخ کی کمی تھی۔ ان میں سے تفسیر کا فن ایک معمولی درجے تک لکھنؤ میں موجود تھا اور جتنا تھا اُس سے زیادہ اور بھی کہیں نہ تھا۔ تاہم بعض شہروں میں بعض نامور مفسّر گزرے ہیں، مگر اُن کا تبحر و کمال اُنھی کی ذات تک محدود رہا اور اُنھی پر ختم ہو گیا۔ حدیث کو دلّی ہی کے ساتھ خصوصیت رہی۔ آخر عہد میں مولانا محمد عبدالحی مرحوم مکۂ معظمہ کے شیوخِ حدیث سے درس و روایتِ حدیث کی سند حاصل کر کے آئے اور سلسلۂ درس بھی جاری کر دیا مگر اِس فن کو یہاں اچھا نشو و نما نہیں ہونے پایا۔ رجال کا فن حدیث کے تابع ہے، حدیث میں جس قدر توغل بڑھتا ہے، اُسی قدر فنِ رجال میں انسان کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے، لہٰذا علمائے لکھنؤ جس قدر حدیث کے فن میں ناقص تھے، اسی قدر رجال کے فن میں بھی ناقص رہ گئے۔ باقی رہی تاریخ، اِس فن کو ہندوستان میں کبھی عروج نہیں حاصل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سوسائٹی کی ضرورت سے فارسی دانوں میں تاریخ کا بہت کچھ مذاق تھا مگر علمائے ہند نے اِس فن کو افسانہ خوانی سے زیادہ وقعت کبھی نہ دی

جس کی وجہ سے عموماً علما میں ایک بہت بڑا نقص رہ جاتا تھا۔ اور یہی چیز تھی جس نے ہندوستان کے بچے بچے کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ "عالموں کو زمانہ شناسی سے کیا کام؟ وہ لوگ تو سیدھے سادے جنتی ہوتے ہیں۔"

لیکن زمانے کی ضرورتیں دیکھ کے، دونوں فریق کے علما نے اپنے نصابوں میں مناسب اضافہ شروع کر دیا ہے۔ اور دوسری طرف ندوۃ العلما کا دار العلوم قائم ہے جو اُن ضروری علوم کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے، جو اِس وقت تک متروک تھے۔ لیکن ان نقصانات کے ساتھ بھی لکھنؤ میں جو کچھ ہوا، دیگر مقامات سے بہت زیادہ ہے۔

(۱۴)

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ شیعہ خاندانِ اجتہاد اور فرنگی محل کے علمائے اہلِ سنت کی برکت سے اِس آخری دربار کے عہد میں علم و فضل نے لکھنؤ میں کیسا عروج حاصل کیا اور اپنی سواد میں کیسی علمی کشش اور مرجعیت پیدا کرا دی۔ لیکن ابھی ہمیں طبِّ یونانی سے بحث کرنا باقی ہے۔

یہ شریف ترین فن، جس کو عالمِ انسانی کے محفوظ رکھنے اور نسلِ انسانی کو ترقی دینے سے واسطہ ہے، اگرچہ اِس کا ظہور ہر قدیم ملک میں خود رَو طریقے اور جزئی تجربات سے ہوا ہے، مگر قدیم الایام میں مغرب کی طرف اہلِ یونان نے اس فن میں بہت ہی نمایاں ترقی کی تھی اور مشرق میں ہندوؤں کے نام وَرانِ سلف نے اسے اعلا درجۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ مسلمانوں میں جب دربارِ خلافت قائم ہوا تو یہ فن دونوں جگہ سے آیا اور دونوں سرزمینوں کے حاذق اطبّا دربارِ بغداد کے طبیب تھے۔ ابتداءً دو ایک صدیوں تک تمام مستند اطبّائے دربارِ عبّاسی، ہندو تھے، عیسائی تھے، یہودی تھے، مگر مسلمان نہ تھے۔ مگر اُس دور کے اطبّائے باکمال چاہے کسی مذہب کے پیرو ہوں، آغوشِ اسلام کے پروردہ اور عالمِ اسلامی کے ممتاز نام ور تھے اور انھی کے ہاتھوں سے فنِ طب ایک

نئی شان اور نئے عنوان سے مدوّن و منضبط ہونا شروع ہوا جس میں تھوڑی اصلاح اور ردّ و بدل کے بعد، اصولی ترتیب تو یونانیوں کی برقرار رکھی گئی مگر تجربات ہر ملک اور ہر قوم کے یکساں طور پر لیے گئے۔

اس کے چند روز بعد مسلمان اطبا سے نامور پیدا ہونا شروع ہوئے۔ اور انھوں نے فنِ طب کو اپنے اجتہادوں اور اپنے تجربات سے اپنا بنانا شروع کیا یہاں تک کہ ابنِ سینا نے قانون کی سی بے نظیر و لاجواب کتاب لکھ کے دنیا کے ہاتھ میں دے دی، اور اُس کے آگے مشرق و مغرب کی تمام قوموں نے سر جھکا دیا۔ اُدھر دیارِ اندلس نے عملِ بالید اور تجربات میں مشرق سے بھی زیادہ ترقی کی، اور فنِ طب مسلمانوں کا خاص فن بن گیا جس کے مرجع و ماوا ہر جگہ وہی تھے۔ ہر قوم اُسے انھی سے حاصل کر رہی تھی اور اسی پر یورپ کی موجودہ ڈاکٹری کی عمارت قائم ہوئی جس کو زیادہ تعلق اندلس کے اسلامی طبّی اسکول سے تھا۔

لیکن اِدھر آخری صدیوں میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا، تو اس کا اثر سب سے پہلے اِن کے علوم و فنون میں اور سب سے زیادہ فنِ طب میں نمایاں ہوا اور اکثر ممالک میں اس کی وہی حالت ہو گئی جو عروجِ یونان کے آغاز میں تھی یعنی معمولی قابلیت کے لوگ، بغیر اس کے کہ فن کی اعلا ترین کتابوں پر اُن کی نظر پڑی ہو، اپنے جزئی تجربوں سے لوگوں کا علاج کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں مصر، عرب، شام و عراق فن جاننے والے طبیبوں سے خالی ہو گئے۔ صرف ایران اور ہندوستان میں یہ فن باقی تھا۔ لیکن اِس پچھلی صدی میں ایران بھی طبیبوں سے خالی ہو گیا۔ اور تمام ممالکِ اسلام میں اپنے اس فنِ قدیم کے متعلق ایسی جہالت تھی کہ جب یورپ کے فرانسیسی اور انگریز ڈاکٹر نمودار ہوئے تو عوام و خواص سب کو ایک نعمتِ الٰہی نظر آئے اور کسی کو اس کی حس نہ تھی کہ یہ اصلی فن ہمارا ہی تھا یا ہمارے یہاں بھی کبھی اطبا ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہونے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے، جہاں آج تک اطبائے یونانی، یورپ کی جدید اصناف طب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجودے کہ خیراتی ہسپتال گانو گانو موجود ہیں، مگر پھر بھی لوگوں کو جو اعتبار یونانی اطبا کے علاج پر ہے، ڈاکٹروں پر نہیں۔

دہلی میں اگلے دنوں اس فن کے بہت سے باکمال گزرے جن میں حکیم ارزانی، حکیم شفائی خاں، حکیم علوی خاں، حکیم محمد شریف خاں، بہت اعلا شہرت وکمال کے اطبا گزرے ہیں۔ لکھنؤ میں برہان الملک کے زمانے سے دہلی کے حاذق اطبا، سرزمینِ اودھ میں آنا شروع ہو گئے۔ خصوصاً شجاع الدولہ کے عہد میں تو دہلی کے دو ایک طبیبوں کے سوا، جتنے تھے، سب یہیں چلے آئے۔ فیض آباد کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہاں جتنی سرکاریں تھیں، ان میں سے ہر ایک سے کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا، جن کا بہت کچھ ادب اور پاس ولحاظ کیا جاتا اور ماہ وار تنخواہ کے علاوہ روزانہ انعام واکرام سے سرفراز ہوتے رہتے۔

آصف الدولہ کے زمانے سے جب لکھنؤ، کمالوں کی قدر دانی کا مرکز قرار پایا، تو دہلی کے بہت سے خاندانی اطبا نے یہیں توطّن اختیار کر لیا اور چند روز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح فنِ طب بھی خاص یہیں کا فن بن گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ، حکیم شفاءالدولہ، حکیم مرزا محمد علی، حکیم سید محمد مرتعش، حکیم مرزا کوچک، حکیم بنا، حکیم مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ دگراں قدر طبیب پیدا کیے۔ جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے اور سلف کے سارے سرمایۂ علمی پر ان کی نظریں تھیں۔ ہوتے ہوتے فنِ طب کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ لکھنؤ کا شاذ و نادر ہی کوئی محلہ ہوگا جس میں کوئی نام ور خاندانِ اطبا نہ موجود ہو۔ خاص شہر کے صدہا محلوں کے علاوہ گرد و نواح کے گانوؤں اور قصبوں میں بھی ہزاروں مطب جاری تھے۔ اور ہندوستان کے جن درباروں اور شہروں میں مشہور و نام ور

طبیب تھے، سب لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے تھے۔ چنانچہ قصبۂ موہان کے ایک طبیب کو دربار گیکواڑ بڑودا میں وہ عزت حاصل ہوئی جو بہت کم اطبا کو حاصل ہوسکی ہوگی غرض ایسے نامور طبیب، خاکِ لکھنؤ نے پیدا کیے جن کی مسیحا نفسی کے کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

دربارِ اودھ کے آخر عہد میں سیّد محمد مرتعش کے ایک شاگردِ رشید حکیم محمد یعقوب نے اپنا مطب جاری کر کے ایسی مرجعیت عامہ حاصل کی کہ اُن کی ذات سے ایک بہت بڑے نام ور طبّی خاندان کی بنیاد پڑ گئی، جو آج بلا مبالغہ دنیا بھر میں جواب نہیں رکھتا۔ اسی خاندان کے مرحوم نام وروں میں حکیم محمد ابراہیم، حکیم حافظ محمد عبد العلی، حکیم محمد اسماعیل، حکیم محمد مسیح، حکیم محمد عبد العزیز، حکیم حافظ محمد عبد الولی تھے۔ اور حکیم عبد الحفیظ صاحب، حکیم عبد الرشید صاحب، اور حکیم عبد المعید صاحب اس وقت اپنی مسیحائی کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ کاش یہ اپنے خاندانی فن کو چھوڑ کے دوسری ہوسوں میں نہ پڑتے۔

دہلی میں حکیم محمد شریف خاں کا خاندان اس وقت تک موجود ہے جس میں حکیم محمود خاں اور حکیم عبد المجید خاں کے ایسے باکمال گزر چکے اور حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب بزرگوں کے نام کو اپنے ذاتی کمالات سے آج تک ظاہر کر رہے ہیں۔ دہلی میں حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے ایک مدرسۂ طبیہ بھی جاری کر دیا ہے، اور طبّی ویدک کانفرنس قائم کر کے، اپنے فن کو بہت عروج دے رہے ہیں۔ اِن کے مقابل لکھنؤ میں حکیم عبد العزیز صاحب نے مدرسۂ تکمیل الطب قائم کیا جس سے ہر سال بیسیوں اطبا تیار ہو کے اقطارِ ارض میں پھیلتے اور لکھنؤ کی طبّی مرجعیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

بہ ہر تقدیر، مسلمانوں کا برائے نام یونانی فنِ طب آج اگر دنیا بھر میں کہیں زندہ ہے تو ہندوستان میں، اور ہندوستان میں اس کے مرکز دو ہی شہر ہیں؛ دہلی اور لکھنؤ۔ مگر

مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہونے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے، جہاں آج تک اطبائے یونانی، یورپ کی جدید اصنافِ طب کا مقابلہ کام یابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجودے کہ خیراتی ہسپتال گانو گانو موجود ہیں، مگر پھر بھی لوگوں کو جو اعتبار یونانی اطبّا کے علاج پر ہے، ڈاکٹروں پر نہیں۔

دہلی میں اگلے دنوں اس فن کے بہت سے باکمال گزرے جن میں حکیم ارزانی، حکیم شفائی خاں، حکیم علوی خاں، حکیم محمد شریف خاں، بہت اعلا شہرت وکمال کے اطبّا گزرے ہیں۔ لکھنؤ میں برہان الملک کے زمانے سے دہلی کے حاذق اطبّا، سرزمینِ اودھ میں آنا شروع ہو گئے۔ خصوصاً شجاع الدّولہ کے عہد میں تو دہلی کے دو ایک طبیبوں کے سوا، جتنے تھے، سب یہیں چلے آئے۔ فیض آباد کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہاں جتنی سرکاریں تھیں، اُن میں سے ہر ایک سے کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا، جن کا بہت کچھ ادب اور پاس ولحاظ کیا جاتا اور ماہ وار تنخواہ کے علاوہ روزانہ انعام واکرام سے سرفراز ہوتے رہتے۔

آصف الدّولہ کے زمانے سے جب لکھنؤ، کمالوں کی قدر دانی کا مرکز قرار پایا، تو دہلی کے بہت سے خاندانی اطبّا نے یہیں توطّن اختیار کر لیا اور چند روز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح فنِّ طب بھی خاص یہیں کا فن بن گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ، حکیم شفاء الدولہ، حکیم مرزا محمد علی، حکیم سیّد محمد مرتعش، حکیم مرزا کوچک، حکیم بنّا، حکیم مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ وگراں قدر طبیب پیدا کیے۔ جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے اور سلف کے سارے سرمایۂ علمی پر ان کی نظریں تھیں۔ ہوتے ہوتے فنِّ طب کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ لکھنؤ کا شاذونادر ہی کوئی محلّہ ہوگا جس میں کوئی نام ورخاندانِ اطبّا نہ موجود ہو۔ خاص شہر کے صدہا محلّوں کے علاوہ گردونواح کے گانوؤں اور قصبوں میں بھی ہزاروں مطب جاری تھے۔ اور ہندوستان کے جن درباروں اور شہروں میں مشہور ونام ور

طبیب تھے، سب لکھنؤ اور اطرافِ لکھنؤ کے تھے۔ چنانچہ قصبۂ موہان کے ایک طبیب کو دربارِ گیکواڑ بڑودا میں وہ عزّت حاصل ہوئی جو بہت کم اطبا کو حاصل ہوسکی ہوگی غرض ایسے نامور طبیب خاکِ لکھنؤ نے پیدا کیے جن کی مسیحا نفسی کے کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

دربارِ اودھ کے آخر عہد میں سیّد محمد مرتعش کے ایک شاگردِ رشید حکیم محمد یعقوب نے اپنا مطب جاری کر کے ایسی مرجعیّتِ عامہ حاصل کی کہ اُن کی ذات سے ایک بہت بڑے نامور طبّی خاندان کی بنیاد پڑ گئی، جو آج بلا مبالغہ دنیا بھر میں جواب نہیں رکھتا۔ اسی خاندان کے مرحوم نام وروں میں حکیم محمد ابراہیم، حکیم حافظ محمد عبد العلی، حکیم محمد اسماعیل، حکیم محمد مسیح، حکیم محمد عبد العزیز، حکیم حافظ محمد عبد الولی تھے اور حکیم عبد الحفیظ صاحب، حکیم عبد الرشید صاحب، اور حکیم عبد المعید صاحب اس وقت اپنی مسیحائی کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ کاش یہ اپنے خاندانی فن کو چھوڑ کے دوسری ہوسوں میں نہ پڑتے۔

دہلی میں حکیم محمد شریف خاں کا خاندان اس وقت تک موجود ہے جس میں حکیم محمود خاں اور حکیم عبد المجید خاں کے ایسے باکمال گزر چکے اور حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب بزرگوں کے نام کو اپنے ذاتی کمالات سے آج تک ظاہر کر رہے ہیں۔ دہلی میں حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے ایک مدرسۂ طبّیہ بھی جاری کر دیا ہے، اور طبّی ویدک کانفرنس قائم کر کے اپنے فن کو بہت عروج دے رہے ہیں۔ اِن کے مقابل لکھنؤ میں حکیم عبد العزیز صاحب نے مدرسۂ تکمیل الطب قائم کیا، جس سے ہر سال بیسیوں اطبّا تیار ہو کے اقطارِ ارض میں پھیلتے اور لکھنؤ کی طبّی مرجعیّت کا ثبوت دیتے ہیں۔

بہ ہر تقدیر، مسلمانوں کا برائے نام یونانی فنِّ طب آج اگر دنیا بھر میں کہیں زندہ ہے تو ہندوستان میں، اور ہندوستان میں اس کے مرکز دو ہی شہر ہیں، دہلی اور لکھنؤ۔ مگر

دہلی میں صرف ایک حکیم محمود خاں کا خاندان ہے اور لکھنؤ میں ایسے بیسیوں خاندان پڑے ہیں۔ دہلی میں بعض اور اطبّا بھی مطب کرتے نظر آتے ہیں، وہ اِسی زمانے کے جدید طبیب ہیں جنھوں نے اپنے مطب جما لیے ہیں۔ لکھنؤ میں گو کہ بہت سے نئے طبیب ہیں، لیکن ایسے بہت سے خاندان بھی ہیں جن میں صدیوں سے فنِ طب کو ترقی رہی۔

لکھنؤ اور دہلی کے اطبّا میں ایک اور فرق بھی ہے: طب کا موجودہ نصابِ تعلیم، ہمیں نہیں معلوم اطبّاے دہلی کا مرتب کیا ہوا ہے یا اطبّاے لکھنؤ کا، لیکن اِس پر پورا پورا عمل جیسا اطبّاے لکھنؤ نے کیا، اطبّاے دہلی نہیں کرتے۔ پڑھائی وہاں بھی یہی کتابیں جاتی ہیں، مگر دہلی میں طبیبوں کا مطب ایک بڑی حد تک ان کی مدوّنہ طب سے الگ ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ویدک کی دواؤں کے اختیار کر لینے میں اِسی قدر نہیں کیا کہ ان نئے اجزا کو اپنے مطب میں داخل کر لیا بلکہ یہ بے احتیاطی بھی کی کہ اُن کے داخل کرنے میں اپنے قدیم مدوّنہ و مسلّمہ اصول خصوصاً مزاج کے مباحث سے چشم پوشی کر لی اور ان اجزا کو استعمال کرا دیتے ہیں جن کے مزاج اور افعال و خواص سے وہ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ وہاں فی الحال سب سے بڑی شکایت یہ سنی جاتی ہے کہ مدرسۂ طبّیۂ دہلی کے نصاب میں تشریح کے علاوہ، ڈاکٹری کے دیگر اصول بھی اِس کثرت اور بے احتیاطی سے اختیار کر لیے گئے ہیں کہ اصلی فنِ طب بجاے ترقی کرنے کے، بالکل مٹا جاتا ہے۔ یہی بے احتیاطی انھوں نے پہلے اصولِ ویدک کے اختیار کرنے میں کی تھی اور یہی اب اصولِ ڈاکٹری کے لینے میں ہو رہی ہے۔ ایسی حالت میں دہلی میں ہمارے قدیم فنِ طب کا جو انجام ہوتا نظر آتا ہے، نہایت خطرناک ہے۔

برخلاف اِس کے، لکھنؤ کے تمام طبّی خاندانوں، خصوصاً حکیم یعقوب مرحوم کے خاندان اور تکمیل الطب میں اصلی اصولِ طبّی کے قائم رکھنے اور اُن کو انھی کے دائرے میں رکھ کے ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُن کے مطب اِس وقت تک اپنے فن اور اپنی کتابوں سے ذرا بھی جدا نہیں ہیں اور ایسی سلامت روی کے راستے پر جا رہے

ہیں جس سے امید ہو سکتی ہے کہ شاید اسلامی طب دستبردِ زمانہ سے بچ جائے، اگرچہ اصلی خدمتِ فن سے یہ لوگ بھی ہنوز بہت دور ہیں۔ طب کی روح، علمِ دواسازی ہے۔ جو ہمارے قدیم علمِ کیمیا کا ایک شعبہ ہے۔ اسی فن پر یورپ کے موجودہ معجز نما فن کیمسٹری کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ اِس فن میں مسلمان مصنفینِ سلف کی کتابیں ابھی کلیتہً نہیں مٹیں، بلکہ بہت سی باقی رہ گئی ہیں۔ اساتذۂ طب کا کام ہے کہ بار بار ان کا مطالعہ کر کے اُن کو سمجھیں، ان کو غور و خوض کر کے حل کریں اور انھیں نصابِ تعلیم میں داخل کریں۔ پھر اُن کے اصول و ضوابط میں جدید تجربات سے فائدہ اٹھا کے مجتہدانہ تصرّف کریں، اور اپنے دواسازی کے فن کو باضابطہ بنالیں جس کے بغیر طب کے تمام کمالات اکثر اوقات بے نتیجہ اور غیر سودمند ثابت ہو جاتے ہیں۔

مگر اس کمی کے ساتھ بھی لکھنؤ نے طب کو جیسی ترقی دی اور مضبوط بنایا، دہلی سے بہت زیادہ ہے اور نہ دنیا کے اور کسی حصّے میں نہیں ہے۔

(۱۵)

لیکن باوجود اس کے کہ علومِ عربیّہ کے بڑے بڑے علمائے گراں پایہ لکھنؤ کی خاک سے پیدا ہوئے، اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربی کی تعلیم مقتدایانِ اُمّت اور پیشوایانِ ملت تک محدود تھی۔ ہندوستان میں درباری زبان فارسی تھی۔ ملازمت حاصل کرنے اور مہذّب و معزز صحبتوں میں چمکنے کے لیے یہاں فارسی کی تعلیم بہ خوبی کافی خیال کی جاتی تھی۔ اودھ ہی نہیں سارے ہندوستان میں ادبی و اخلاقی ترقی کا ذریعہ صرف فارسی قرار پاگئی تھی۔ مسلمان تو مسلمان، اعلا طبقے کے ہندوؤں کا عام رجحان فارسی ادب و انشا کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ اعلادرجے کی انشائیں، ہندو مصنفوں ہی کے قلم سے مرتّب و مدوّن ہوئی تھیں۔ ٹیک چند بہار نے بہارِ عجم کی سی لاجواب کتاب تصنیف کر دی جو مصطلحاتِ زبانِ فارسی کا ایک بے عدیل و نظیر

ذخیرہ ہے، اور جس میں ہر محاورے کی سند میں اہلِ زبان کے بے شمار اشعار پیش کر دیے گئے ہیں۔ لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں مُلّا فائق کا پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک نومسلم فارسی داں تھے۔ وہ خود تو مذاقاً کہا کرتے کہ بوی کباب مرا مسلمان کرد۔ مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم، اس کے شوق، اور کمالِ فارسی دانی کی آرزو نے انھیں مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے محض اسی شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں شیراز و اصفہان اور تہران و آذربائیجان کی خاک چھانی اور ادبِ فارسی کے اس اعلا کمال کو پہنچ گئے کہ خود اہلِ زبان بھی ایسے باکمال زبان داں پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں ہے

مرزا غالب نے جا بہ جا مرزا قتیل پر حملے کیے ہیں۔ بے شک مرزا غالب کا مذاقِ فارسی نہایت اعلا درجے کا تھا۔ وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہلِ زبان کے، کسی کا کلام سند نہیں ہو سکتا۔ مگر اُن کے زمانے میں چوں کہ اودھ سے بنگالے تک لوگ قتیل کے پیرو تھے، اور بات بات پر قتیل کا نام لیا جاتا تھا، اس لیے مرزا غالب کو اکثر طیش آگیا۔ اور جب پیروانِ قتیل نے اُن کی خبر لینا شروع کی تو کہنے لگے:

فیضی از صحبتِ قتیلم نیست　　رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
مگر آنانکہ فارسی دانند　　ہم برین عہد و رای و پیمانند
کہ ز اہلِ زبان نبود قتیل　　ہرگز از اصفہان نبود قتیل
لاجرم اعتماد را نسزد　　گفتہ اش استناد را نسزد
کین زبان خاصِ اہلِ ایرانست　　مشکلِ ما و سہلِ ایران است
سخن ست آشکار و پنہان نیست　　دہلی و لکھنؤ ز ایران نیست

مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ قتیل نے فارسی دانی میں جو کوششیں کی تھیں اور اس واقفیت و کمال حاصل کرنے میں جو زندگی صرف کی تھی، وہ بالکل بے کار گئی۔ اس بات کے ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا کہ قتیل کا کوئی دعوا جب تک وہ اہلِ زبان کی

سند نہ پیش کریں، قابلِ تسلیم نہیں، اور نہ خود قتیل کے ذہن میں کبھی یہ خیال گزرا ہوگا لیکن اس کی خصوصیت قتیل ہی کے ساتھ نہیں، ہندوستان کا کوئی شخص بجائے خود سند نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا نوشہ غالب بھی کوئی فارسی کا محاورہ بغیر اہلِ عجم کے ثبوت پیش کیے نہیں استعمال کر سکتے۔ ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلامِ فارسی میں اُن کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح محلِ استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھیے تو غالب کے مقابلے میں قتیل کا پایہ بہت بلند تھا۔ غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے۔ اور اس کے ساتھ طلبِ معاش میں سرگرداں رہے۔ قتیل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا اور مدتوں خاکِ پاکِ ایران میں رہ کے گانو گانو کی ٹھوکریں کھاتے پھرے تھے۔

بہ ہر تقدیر، لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتیل سے ہوا اور ان سے کچھ پہلے ملا فائق نے جن کا خاندان آگرے سے آکے مضافاتِ لکھنؤ میں بس گیا تھا، ادب و انشائے فارسی اور فارسی نظم و نثر میں اعلا درجے کی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی گو اور فارسی داں ہندوستان میں ان سے پہلے بھی گزرے تھے، مگر فارسی دانی کے ساتھ زبانِ فرس کے اصول و ضوابط اور اس کی صرف و نحو کے مدون کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ ہی میں شروع ہوا اور وہ انھی کے قلم سے ظاہر ہوا۔ ان کی کتابیں اگر سچ پوچھیے تو بے مثال و لاجواب ہیں۔

اس کے بعد فارسی یہاں کی عام تعلیم میں داخل رہی اور نصابِ فارسی ایسا بلیغ و دقیق رکھا گیا جو سچ یہ ہے کہ خود ایران کے نصاب سے زیادہ سخت تھا۔ ایران میں، جیسا کہ ہر ملک کے لوگوں کا معمول ہے، سیدھی سادی فصیح زبان جس میں صفائی کے ساتھ خیال آفرینی کی جائے، پسند کی جاتی ہے۔ اور اسی قسم کا نصاب بھی ہے۔ ہندوستان میں عرفی و فیضی اور ظہوری و نعمت خانِ عالی کے ایسے نازک خیال

شعرا کا کلام داخلِ درس کیا گیا۔ ملّا طغرا اور مصنّفِ پنج رقعہ کے ایسے دقّت پسندوں کا کلام پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ جس سے دعوا کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان دانی اس آخر عہد میں خود ایران سے بڑھ گئی تھی اور یہیں کے لوگوں نے فارسی کی تمام درسی کتابوں پر اعلا درجے کی شرحیں لکھ ڈالی تھیں۔ اور اسی کا یہ حیرت خیز نتیجہ ہے کہ جب کہ دنیا کی تمام زبانوں کے شعرا اہلِ زبان ہی کے حلقے میں محدود رہتے ہیں اور غیر اہلِ زبان میں اگر دو چار شاعر پیدا بھی ہو جاتے ہیں تو اہلِ زبان میں اُن کا اعتبار نہیں ہوتا، فارسی کے شعرا ایران سے زیادہ نہیں تو ایران کے برابر ہی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ خصوصاً گذشتہ صدی میں جب کہ ترقی و تعلیم کی دنیا میں لکھنؤ کا ڈنکا بج رہا تھا، یہاں کا بچّہ بچّہ فارسی گو تھا۔ جاہل رنڈیوں اور بازاری مزدوروں کی زبان پر فارسی کی غزلیں تھیں، اور بھانڈ تک فارسی کی نقلیں کرتے تھے۔ قصباتِ اودھ کے تمام شرفا کا مہذّب مشغلہ اور ذریعۂ معاش فارسی پڑھانا تھا اور ایسے اعلا درجے کے دیہاتی فارسی مدّرس لکھنؤ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے کہ اُن کی زبان دانی پر خود اہلِ عجم بھی اش اش کر جاتے۔ اُن کا لب و لہجہ اہلِ زبان کا سا نہ ہو مگر فارسی کے محاوروں اور بندشوں اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق میں اُن کو وہ درجہ حاصل تھا کہ معمولی اہلِ زبان کو بھی خطرے میں نہ لاتے تھے۔

لکھنؤ میں فارسی کا مذاق جس قدر بڑھا ہوا تھا، اُس کا اندازہ لکھنؤ کی اُردو زبان سے ہو سکتا ہے۔ جہلا اور عورتوں تک کی زبان پر فارسی کی ترکیبیں، بندشیں اور اضافتیں موجود ہیں۔ اور لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرنے والوں کو اگر کوئی اعتراض اتنے دنوں میں مل سکا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس میں فارسی اعتدال سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن اُس دور کے معیارِ ترقی کے لحاظ سے یہی چیز لکھنؤ کی زبان کی خوبی اور اُس کی معاشرت کے زیادہ بلند ہو جانے کی دلیل تھی۔ خود دہلی میں زبانِ اُردو

کی ترقی کے جتنے دَور قائم کیے جائیں، اُن میں بھی اگلے پچھلے دَور کا امتیاز صرف یہی ہوسکتا ہے کہ پہلے کے بہ نسبت بعد والے میں فارسی کا اثر زیادہ ہے۔

مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فارسی میں نمود حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ امر دولتِ مغلیہ کے ابتدائی عہد سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ اُس وقت بھی بعض نام ور و مستند فارسی داں اور فارسی گو موجود تھے، مگر اودھ میں یہ مذاق انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ چناں چہ جیسے باکمال فارسی داں ہندو سوادِ لکھنؤ میں موجود تھے، کہیں نہ تھے۔ کایستھوں اور کشمیری پنڈتوں نے تعلیمِ فارسی کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا تھا۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ کشمیری پنڈتوں کی تو مادری زبان ہی اردو ہوگئی۔ اور ان کی اور مسلمانوں کی فارسی دانی میں بہت کم فرق تھا۔ کایستھ چوں کہ یہیں کے متوطن تھے، اس لیے اُن کی زبان بھاشا رہی، مگر تعلیم فارسی کی کایستھوں کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کرگئی تھی کہ نہایت ہی بے اعتدالی اور بے ربطی کے ساتھ محاوراتِ فارسی کو استعمال کرنے لگے، جو بات کہیں کے ہندوؤں میں نہ تھی۔ اُن دنوں لوگ کایستھوں کی زبان کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے، مگر سچ یہ ہے کہ بجائے مضحکہ اڑانے کے، اُن کی قدر کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اُن کی زبان، اُن کی علمی ترقی کی دلیل تھی۔ جس طرح آج کل انگریزی لفظوں کے جا و بے جا استعمال کو انگریزی داں اپنی علمی ترقی کا ثبوت خیال کرتے اور نہایت بدتمیزی سے انگریزی الفاظ اپنی زبان میں بھرتے چلے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں اُن دنوں فارسی کے صدہا نثار اور شاعر موجود تھے۔ اور اُردو کی طرح برابر فارسی مشاعروں کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ فارسی، شرفا ہی نہیں عوام النّاس تک کا شعار و دثار بن گئی تھی۔ اور اب باوجودے کہ فارسی درباری زبان نہیں باقی رہی اور حکومت کی مسند پر اُردو زبان قابض و متصرّف ہوگئی ہے، مگر مہذّب سوسائٹی پر آج تک فارسی کا سکہ جما ہوا ہے۔ اور عام خیال یہی ہے کہ فارسی مدارس و مکاتب سے نکل گئی اور تحصیلِ معاش کے لیے اُس کی ضرورت نہیں باقی رہی، مگر انسان بغیر فارسی پڑھے، مہذّب سوسائٹی میں بیٹھنے کے

قابل نہیں ہو سکتا، اور نہ صحیح معنوں میں انسان کامل بن سکتا ہے۔

انگلستان میں فرانس کی زبان کبھی درباری زبان تھی۔ اب اگرچہ مدت ہوئی کہ وہ دربار سے نکال دی گئی مگر معاشرت اور اخلاقی ترقی آج بھی وہاں بغیر فرانسیسی زبان کے سیکھے نہیں حاصل ہو سکتی۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے اور ہنسنے بولنے، غرض زندگی کے تمام اسلوبوں پر فرانسیسی کی حکومت اب تک ویسی ہی موجود ہے اور لڑکیاں بغیر فرنچ زبان حاصل کیے شایستہ بیبیاں نہیں بن سکتیں۔ یہی حال لکھنؤ کا ہے کہ فارسی دربار سے گئی، خط و کتابت سے گئی، مگر معاشرت کے تمام شعبوں پر اب تک حکومت کر رہی ہے اور بغیر فارسی کی تعلیم پائے نہ ہمارا مذاق درست ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں بات کرنے کا سلیقہ آسکتا ہے۔

مٹیا برج (کلکتہ) میں آخری محروم القسمت تاج دار اودھ کے ساتھ جو چند لوگ وہاں کے سکونت پذیر ہو گئے تھے، اُن میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا جو فارسی نہ جانتا ہو۔ دفتر کی زبان فارسی تھی اور ہندو مسلمانوں میں صدہا فارسی گو شاعر تھے۔ عورتیں تک فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ اور بچہ بچہ فارسی زبان میں اپنا مطلب ادا کر لیتا تھا۔

موجودہ لکھنؤ میں اگرچہ فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی ہے اور ہندوؤں نے تو اُسے اس قدر چھوڑ دیا کہ وہ کایستھوں کی زبان ہی خواب و خیال ہو گئی جس کا زبان دانی کی صحبتوں میں مضحکہ اڑایا جاتا تھا اور بھانڈ تک اس فارسی آمیز زبان کی نقلیں کرتے تھے، مگر پھر بھی پُرانے بزرگوں اور خصوصاً مسلمانوں میں بہت کچھ فارسی کا مذاق موجود ہے، اس لیے کہ اُن کی اُردو دانی ہی ایک حد تک ان کے لیے فارسی دانی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں میں اب تک خواجہ عزیز الدین صاحب کا ایسا محقق فارسی اگلی بزمِ سخن کے یاد دلانے کو پڑا ہوا ہے جو اپنے کمال کے لحاظ سے سارے

ہندوستان میں یکتا ہیں۔ اور پرانے سن رسیدہ ہندوؤں میں بھی متعدد فارسی کے اسکالر ملیں گے جن کا ایک نمونہ سندیلے کے راجا درگا پرشاد صاحب ہیں جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ زمانہ بدل گیا، زمین و آسمان بدل گئے، آب و ہوا بدل گئی، مگر وہ آج تک وہی ہیں۔ فارسی دانی کی داد دینے اور لینے کو موجود ہیں۔ اور اگلی تاریخ کے ایک کرم خوردہ ورق کی طرح چومنے چاٹنے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہیں۔

(۱۶)

علوم ہی سے وابستہ کتابت اور تحریر کے فن ہیں۔ مسلمانوں کا پرانا خط عربی تھا جس کو نسخ کہتے ہیں۔ خلافتِ بغداد کے ازمنۂ وسطیٰ تک ساری دنیائے اسلام میں مشرق سے مغرب تک یہی خط تھا جو ارضِ حیرہ کے پرانے خط سے، خط کوفی اور خطِ کوفی سے خطِ نسخ بن گیا تھا۔ خاندانِ طاہریہ کے زمانے سے وہ تمام علم و فن جو بغداد میں عروج پا رہے تھے، ایران و خراسان کی طرف آنے لگے۔ اور دیلمیوں اور سلجوقیوں کے زمانے میں بغداد کے اکثر کمالات ایران میں بخوبی جمع ہو گئے۔ خصوصاً دیلمیوں کے علمی ذوق اور تفنن طبع سے ایران کا مغربی صوبہ آذربائیجان جو قدرۃً عراقِ عجم و عراقِ عرب کے آغوش میں واقع تھا، ہر قسم کی خوبیوں اور ترقیوں کا گہوارہ قرار پا گیا۔

اسی علاقے میں پہلے پہل خط نے بھی نئی وضع اختیار کرنا شروع کی۔ کتابت خطاطی کی حدوں سے نکل کے نقاشی کی قلمرو میں داخل ہو گئی اور اس میں مصورانہ نزاکتیں پیدا کی جانے لگیں۔ عجمی نزاکت پسندوں کو خطِ عرب کی پرانی سادگی میں بھدا پن نظر آیا اور پرانی شان اور وضع خود بخود چھوٹنے لگی۔ نسخ میں قلم ہر حرف اور لفظ میں اول سے آخر تک یکساں رہا کرتا تھا۔ حرفوں میں غیر موزوں خمی اور

غیر متناسب ناہموار ی ہوتی تھی۔ دائرے گول نہ تھے بلکہ پیچے اور بیٹھے ہوتے اور ادھر اُدھر ان میں کونے پیدا ہو جاتے۔ اب نقاشی کی نزاکت کو خطاطی میں ملا کے تحریر میں نوک پلک پیدا کی جانے لگی۔ حرفوں کی نوکیں، گردنیں، اور دُمیں باریک بنائی جانے لگیں۔ دائرے خوب صورت اور گول لکھے جانے لگے۔ اس جدید مذاق کو پوری طرح پیشِ نظر رکھ کے سب سے پہلے میر علی تبریزی نے، جو خاص دیلم کا رہنے والا تھا، اس نئے خط کو با اصول و باقاعدہ بنا کے مشرقی بلاد میں رواج دیا اور اس کا نام نستعلیق قرار دیا۔ جو اصل میں نسخ تعلیق یعنی ضمیمۂ نسخ تھا۔

یہ نہیں معلوم کہ میر علی تبریزی کس زمانے میں تھے۔ منشی شمس الدین صاحب جو آج لکھنؤ کے مشہور و مستند خوش نویس ہیں، ان کا زمانہ تیمور سے پہلے بتاتے ہیں لیکن نستعلیق کی کتابیں اتنی پُرانی ملتی ہیں کہ تیمور درکنار، ہم سمجھتے ہیں کہ اس خط کی ایجاد محمود غزنوی سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ محمود کے حملوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں فارسی خوش نویسوں کی بھی آمد شروع ہو گئی ہو گی، جن کے اثر سے یہاں اس خط کا رواج شروع ہوا۔ اور ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر خطے میں نستعلیق کے خوش نویس کثرت سے پیدا ہو گئے۔ لہٰذا یا تو میر علی تبریزی کا زمانہ بہت قدیم ہے اور یا وہ اصلی موجدِ خط نہیں ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دہلی و لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان کی موجودہ خوش نویسی اپنا استادِ اوّل میر علی تبریزی کو بتاتی ہے۔ ان کے ایک مدتِ دراز کے بعد ایران میں نستعلیق کی استادی میں میر عماد الحسنی کا نام مشہور ہوا، جو خوشنویسوں میں بڑے ممتاز و نامور کاتب اور استاد الکل مانے جاتے ہیں۔ اُن کے بھانجے آغا عبدالرشید دیلمی، نادر شاہ کے حملوں کے زمانے میں واردِ ہند ہوئے اور لاہور میں آ کر ٹھہر گئے۔ لاہور میں ان کے صدہا شاگرد پیدا ہوئے جنہوں نے اقطاعِ ہند میں پھیل کے انھیں ہندوستان کی خوش نویسی کا آدم نہیں تو نوح

ضرور ثابت کردیا۔ انھی کے دو شاگرد جو ولایتی تھے، واردِ لکھنؤ ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں میں سے ایک حافظ نوراللہ اور دوسرے قاضی نعمت اللہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ نامی آغا عبدالرشید کے ایک تیسرے باکمال شاگرد بھی لکھنؤ میں آئے تھے۔ ان حضرات کے آنے کا زمانہ غالباً نواب آصف الدولہ بہادر کا عہد تھا، جب یہاں کوئی باکمال آ کے واپس نہ جانے پاتا تھا۔ قاضی نعمت اللہ آتے ہی اس خدمت پر مامور ہو گئے کہ شاہزادوں کو اصلاح دیا کریں اور حافظ نوراللہ کو بھی دربارِ اودھ سے تعلق ہو گیا اور ان دونوں نے یہاں ٹھہر کے لوگوں کو خوش نویسی کی تعلیم دینا شروع کی۔

ان بزرگوں کے علاوہ یہاں اور پرانے خوش نویس بھی تھے جن میں سے ایک نامور بزرگ منشی محمد علی بتائے جاتے ہیں۔ مگر آغا عبدالرشید کے شاگردوں نے اپنا ایسا سکہ جما لیا کہ خوش نویسی کے تمام شائق بلکہ سارا شہر اُن کی طرف رجوع ہو گیا۔ جسے خطاطی کا شوق ہوا، انھی کا شاگرد ہو گیا۔ اور تمام خوش نویسانِ سلف کے نام مٹ کے گم نامی کے ناپیدا کنار سمندر میں غرق ہو گئے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے کمال کے اعتبار سے اس کے مستحق بھی تھے۔

حافظ نوراللہ کی لکھنؤ میں جو قدر ہوئی اس کا اندازہ اسی سے نہیں ہو سکتا کہ وہ یہاں سرکار میں ملازم ہو گئے تھے بلکہ لکھنؤ کی قدردانی کا صحیح اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعوں کو موتیوں کے داموں مول لیتے۔ یہاں تک کہ اُن کی معمولی مشق بازار میں صرف ایک روپیہ حرف کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔

اُن دنوں اُمرا اور شوقین لوگ اپنے مکانوں کو بجائے تصویروں کے قطعات سے آراستہ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے علی العموم قطعوں کی بے انتہا مانگ تھی۔ اور

جہاں کسی اچھّے خوش نویس کے ہاتھ کا قطعہ مل جاتا، اُس پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے اور اُسے آنکھوں سے لگاتے۔ اِس سے سوسائٹی کو تو یہ فائدہ پہنچتا کہ اکثر اخلاقی اصول اور ناصحانہ فقرے یا اشعار ہمیشہ پیشِ نظر رہتے، اور ہر وقت گھر میں اخلاقی سبق ملتا رہتا اور خوش نویسی کو یہ فائدہ پہنچا کہ خوش نویسوں اور صاحبِ کمال خطّاطوں نے اپنے کمال کو قطعہ نویسی ہی تک محدود کر دیا تھا۔ جو آب دار اور عمدہ وصلیوں کو لکھ کے تیّار کرتے اور اسی میں وہ گھر بیٹھے دولت مند ہو جاتے۔ مگر افسوس اب ہندوستان سے قطعات اور کتبوں کا رواج اُٹھتا جاتا ہے اور اُن کی جگہ تصویروں نے لے لی ہے جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذّب شرعی مذاقِ آرائش کے مٹ جانے کے ساتھ خوشنویسی بھی ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ اب کاتب ہیں، خوش نویس نہیں ہیں۔ اور جو دو ایک خطّاط مشہور بھی ہیں، وہ مجبور ہیں کہ کاپی نویسی اور کتابت سے اپنا پیٹ پالیں جو چیز کہ اصل میں خوش نویسی کی دشمن ہے۔ بہ خلاف اِس کے، اُن دنوں ایک گروہ قائم ہو گیا تھا جس کا کام فقط یہ تھا کہ خوش نویسی کو اپنے اُصول پر قائم رکھے اور اُس کو وقتاً فوقتاً مناسب ترقّیاں دیتا رہے۔ چناں چہ اگلے خوش نویس، کتابت کو اپنی شان سے ادنا سمجھتے تھے اور خیال کرتے کہ جو شخص پوری پوری کتابیں لکھے گا، وہ غیر ممکن ہے کہ اوّل سے آخر تک اصول و قواعدِ خوش نویسی کو پوری طرح نباہ سکے۔ اور سچ یہ ہے کہ جتنی محنت اور مشقّت وہ لوگ ایک ایک وصلی کی درستی میں کرتے تھے، اُس کی عشرِ عشیر محنت بھی کاتب کسی پوری کتاب کے لکھنے میں نہیں کر سکتے۔

اُن کی محنت کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ سے ایک بار نواب سعادت علی خاں نے فرمایش کی کہ "مجھے گلستاں کا ایک نسخہ لکھ دیجیے۔" نواب سعادت علی خاں، گلستانِ سعدی کے بے حد شائق تھے اور کہتے ہیں کہ گلستاں ہر وقت اُن کے سرھانے موجود رہا کرتی تھی۔ اور کوئی ایسی فرمایش کرتا تو حافظ نور اللہ اپنی توہین سمجھ کے اُس

کا منہ ہی نوچ لیتے مگر فرماں روائے وقت کا کہنا تھا، منظور کر لیا، اور عرض کیا، تو مجھے اتنی گڈّی کاغذ (اُن دِنوں رِم کو گڈّی کہتے تھے) ایک سَو قلم تراش چاقو اور خدا جانے کتنے ہزار قلموں کے نیزے منگوا دیجیے" سعادت علی خاں نے حیرت سے پوچھا: "فقط اکیلی ایک گلستان کے لیے اتنا سامان درکار ہوگا؟" کہا "جی ہاں، میں اتنا ہی سامان خرچ کیا کرتا ہوں۔" نوّاب کے لیے اس سامان کا فراہم کرنا کچھ دشوار تو تھا نہیں، منگوا دیا۔ اب حافظ صاحب نے گلستاں لکھنا شروع کی مگر پوری نہیں ہونے پائی تھی، سات ہی باب لکھنے پائے تھے اور آٹھواں باب باقی تھا کہ انتقال ہو گیا۔ اُن کے بعد جب اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم دربار میں پیش ہوئے اور اُنھیں سیاہ خلعتِ تعزیت عطا ہوا تو سعادت علی خاں نے کہا: "بھئی، میں نے حافظ صاحب سے گلستاں لکھوائی تھی، خدا جانے اس کا کیا حال ہوا؟" حافظ ابراہیم نے عرض کیا: "ان کے لکھے ہوئے سات باب تیار ہیں، آٹھواں باب باقی ہے، اسے یہ حقیر لکھ دے گا۔ اور اس قدر اُن کی شان سے ملا دے گا کہ حضور امتیاز نہ کر سکیں گے لیکن ہاں اگر کسی ہمعصر خوش نویس نے دیکھا تو وہ بے شک پہچان لے گا۔" نوّاب نے اجازت دی اور اُس گلستاں کو حافظ ابراہیم نے پورا کیا۔

حافظ نور اللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز سب سے اوّل تو خود اُن کے بیٹے حافظ محمد ابراہیم تھے۔ دوسرے منشی سرب سکھ نام ایک ہندو بزرگ تھے۔ جن کو کوئی کایستھ بتاتا ہے اور کوئی کشمیری پنڈت۔ اور تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوش نویس۔ حافظ ابراہیم نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ سیکڑوں آدمیوں کو خوش نویس بنا دیا اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کر کے، اپنے والد سے جُدا ایک شان پیدا کی۔ حافظ نور اللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے، حافظ ابراہیم نے اُن میں ایک خفیف سی بیضاویت اختیار کی۔ منشی سرب سکھ کی نسبت کہا جاتا ہے

کہ اپنے استاد کی شان اِس قدر اُڑا لی تھی کہ صدہا وصلیاں حافظ نوراللہ کے نام سے پھیلا دیں اور بڑے بڑے خوش نویس بالکل تمیز نہیں کرسکتے تھے اور یہ اُن دنوں خوشنویسی کا بہت بڑا کمال تھا۔

حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردوں میں پہلے تو اُن کے فرزند حافظ سعید الدین تھے۔ اُن کے علاوہ منشی عبدالمجید جو سرکارِ شاہی میں احکامِ شاہی اور پرچہ ویسے (یعنی مراسلت فی مابینِ دولتِ انگلشیہ و دولتِ اودھ) لکھنے پر مامور تھے۔ مگر حافظ ابراہیم کے دو شاگردوں نے بہت ہی فروغ پایا جو اپنے زمانے میں سارے لکھنؤ کے استاد قرار پاگئے تھے۔ ایک تو منشی بندے... کشمیری پنڈت جو اپنے فن کے بہت بڑے کامل تھے۔ اور دوسرے منشی محمد ہادی علی جو نستعلیق کے علاوہ نسخ اور طغرا نویسی میں بھی لکھنؤ میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔

اُدھر قاضی نعمت اللہ کے شاگرد ایک تو اُن کے فرزند مولوی محمد اشرف تھے اور دوسرے مولوی قل احمد۔

غرض نستعلیق کے یہی لوگ استاد تھے جن سے لکھنؤ میں خوش نویسی کمال کو پہنچی۔ پھر مطبع جاری ہونے کے بعد کتابت و کاپی نویسی کو فروغ ہوا۔ اور دراصل یہ اسی خاندان کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان، ہزاروں کایستھ جن سے نوبستہ و اشرف آباد کے محلّے بھرے ہوئے ہیں اور سیکڑوں کشمیری پنڈت خوشنویس ہوگئے مگر افسوس، کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق میں اور خوشنویسی کی کسادبازاری دیکھ کے اس فن کو مطلقاً چھوڑ دیا۔ اور اب جتنے اچھے لکھنے والے ہیں، سب مسلمان ہیں یا کایستھ۔

آخر زمانے میں سندیلے کے ایک منشی عبدالحی بھی بڑے باکمال خوشنویس تھے جن کے شاگرد منشی امیراللہ تسلیم، اُن کے بڑے بھائی منشی محمد عبداللطیف اور منشی اشرف علی وغیرہ تھے۔ فی الحال نستعلیق میں منشی شمس الدین صاحب اور نسخ میں منشی

حامد علی صاحب کو شہرت ملی اور یہ دونوں منشی ہادی علی صاحب کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان میں خطِ نسخ جن باکمالوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، اُن میں سب سے پہلے شخص یاقوتِ مستعصمی کے لقب سے مشہور ہیں جو یاقوت اوّل کہلاتے ہیں۔ ہمیں اس نام کا کوئی باکمال کاتب مستعصم باللہ کے عہد میں نہیں نظر آتا۔ کیا عجب کہ اس سے مراد عماد کاتب جوینی الملقب بہ فخر الکتّاب، المتوفی ۵۹۶ھ ہو جس کی کتاب خریدہ مشہور ہے۔ اور جو پہلے ارضِ شام میں سلطان اتابک نور الدین زنگی کا اور اس کے بعد مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتحِ بیت المقدس کا کاتب تھا۔ اس لیے کہ نسخ کا سب سے بڑا آخری خوش نویس وہی مانا جاتا ہے اس کے بعد سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں محمد عارف نام خطِ نسخ کے ایک بڑے باکمال پیدا ہوئے جن کو یاقوت رقم ثانی کا خطاب دیا گیا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خطِ نسخ کی نئی شان ایجاد کی اور بہ مقابل سابق کے اسے زیادہ خوب صورت بنا دیا۔ یہاں تک کہ نسخ کے اساتذۂ لکھنؤ دعوا کرتے ہیں کہ ان کے کمال کا ساری دنیائے اسلام نے اعتراف کر لیا۔ میں اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یاقوت رقمِ ثانی کو ہندوستان میں چاہے جیسی فوقیت حاصل ہو گئی ہو، مگر اُن ممالک میں جہاں کا قومی خط، خطِ نسخ اور قومی مادری زبان، زبانِ عرب ہے، لوگ یاقوت رقم کا نام بھی نہیں جانتے۔ اور نہ اُن کی شان کے پیرو ہیں۔

محمد عارف یاقوت رقم کے زمانے میں عبد الباقی نام ایک شخص تھے جن کا پیشہ حدّادی یعنی لہاری تھا۔ انھیں یاقوت رقم کی مرجعیتِ عامّہ دیکھ کے شوق ہوا کہ خود بھی اس فن میں کمال پیدا کریں۔ اتفاقاً عبد اللہ طبّاخ نام نسخ کے ایک اور خوش نویس اُن دنوں مشہور تھے، حدّاد جا کے اُن کے شاگرد ہوئے۔ اور ایسی محنت کی کہ استادِ کامل مشہور ہو گئے۔ جب ان دونوں کا زمانہ گزر گیا تو یاقوت رقم کی جگہ ان کے بھتیجے قاضی عصمت اللہ نے لی اور حدّاد کی یادگار اُن کے دو فرزند علی اکبر اور علی اصغر تسلیم کیے گئے۔

اس کے بعد ہندوستان میں بڑے بڑے خوش نویس پیدا ہوئے اور برابر نسخ کی کتابت ہندوستان میں ترقی کرتی رہی۔ آخر میں شاہ غلام علی صاحب کو شہرت ہوئی جو نسخ کے باکمال خوش نویس تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں ایک طرف مولوی ہادی علی صاحب کی شہرت ہوئی، جن کا خاندان دہلی سے آیا تھا۔ اور کالپی کے ایک خوش نویس میر اکبر علی کے وہ شاگرد تھے۔ مولوی ہادی علی صاحب کو طغرا نگاری میں بڑا کمال حاصل تھا۔

منشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوش نویس میر بندہ علی مرتعش تھے۔ اُن کے استاد نواب احمد علی نام ایک پرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے باکمال استاد تھے۔ میر بندہ علی کے ہاتھ میں رعشہ تھا، مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا، معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے۔ کیا مجال کہ قابو سے باہر ہو۔ اُن کی نظر خط کے پہچاننے میں ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے۔

منشی حامد علی صاحب فرماتے ہیں ایک موقع پر منشی ہادی علی، منشی محمد یحییٰ (یہ بھی نسخ کے بڑے استاد تھے جنھوں نے طبع ہونے کے لیے لکھنؤ میں پہلا قرآن لکھا) منشی عبدالحی سندیلوی، اور میر بندہ علی مرتعش ایک صحبت میں جمع تھے۔ یہ نسخ کے تمام باکمالوں کی صحبت تھی۔ کسی نے ایک قطعۂ نسخ فروخت کے لیے لا کے پیش کیا۔ گو اُس میں کاتب کا نام نہیں لکھا تھا، مگر ان باکمالوں نے بالاتفاق پہچان لیا کہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ اور سب کو شوق ہوا کہ اسے اپنے قبضے میں کریں۔ مگر منشی ہادی علی صاحب نے کہا: "یہ ایک دن میرے پاس رہے تو مجھے غور کرنے کے بعد اطمینان ہوگا کہ دراصل یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہے یا نہیں۔" مالک نے دے دیا اور وہ اسے گھر لائے۔ دوسرے دن لے جا کے پیش کیا اور کہا: "واقعی یہ یاقوت ہی کے ہاتھ کا ہے۔ اسی کے ساتھ کا یاقوت کا ایک قطعہ میرے پاس بھی پڑا ہوا تھا، میں نے اسے لے جا کے اُس سے ملایا تو بعینہٖ وہی پایا اور مجھے یقین آگیا کہ واقعی یہ یاقوت کا ہے۔ اور دونوں قطعے سب کے سامنے رکھ دیے۔ سب نے بلا تامل تسلیم کر لیا کہ دونوں یاقوت ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر میر بندہ علی نے

منشی ہادی علی والے قطعے کو غور سے دیکھا، پھر مسکرائے اور اُس کے نیچے لکھ دیا: ع

این کار از تو آید و مردان چنین کنند

یہ تحریر دیکھ کے منشی عبدالحی صاحب بگڑے اور کہا: "کیا آپ کو اس میں کچھ شک ہے؟" میر بندہ علی نے کہا "یہ قطعہ تو یاقوت کے ہاتھ کا نہیں ہو سکتا"۔ منشی عبدالحی اور دیگر حریفانِ صحبت نے دعوا کیا کہ یہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ میر بندہ علی نے اس میں ایک واو کا سرا دکھایا اور کہا: "یہ یاقوت کا نہیں ہو سکتا"۔ اب سب لوگ گو مگو میں پڑے ہوئے تھے کہ منشی ہادی علی نے اس وصلی کا ایک کونا پھاڑ کے کاغذ کی تہ کے اندر سے نکال کے اپنا نام دکھا دیا اور سب کو یقین آگیا کہ یہ کارستانی منشی ہادی علی صاحب کی تھی۔ سب نے اُن کی بے حد تعریف کی۔ اور انھوں نے کہا: "مگر میں تو میر بندہ علی صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا"۔

خوش نویسوں کے عام مذاق کے مطابق میر بندہ علی صاحب سے بھی قطعہ نویسی کے سوا کتابت غیر ممکن تھی۔ زندگی بھر کبھی کوئی چھوٹی کتاب بھی نہ لکھی گئی۔ حاجی حرمین شریفین نے جب مطبع جاری کیا تو بہ ہزار منت و سماجت میر بندہ علی کو اس پر راضی کیا کہ انھیں ایک پنج سورہ لکھ دیں۔ میر بندہ علی نے بڑی محنت سے اور خدا جانے کتنے دنوں میں لکھا اور لے گئے مگر حاجی صاحب کے سامنے جب اُس پر آخری نظر ڈالی تو کچھ ایسا ناپسند ہوا کہ بجائے حاجی صاحب کے حوالے کرنے کے، پھاڑ ڈالا اور کہا: "بھئی مجھ سے نہیں ہو سکتا"۔

ان بزرگوں کے تذکرے سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ خوش نویسی میں لکھنؤ کو کوئی ایسا امتیاز حاصل ہو گیا تھا جو ہندوستان میں عدیم النظیر ہو۔ بہ خلاف اس کے میرا خیال ہے کہ نسخ کے جیسے جیسے باکمال دولتِ مغلیہ سے پہلے ہندوستان میں گزر چکے ہیں، اُن کے عُشرِ عشیر درجے کو بھی یہ لوگ نہیں پا سکتے بلکہ نسخ کا کمال اِن دنوں مٹ چکا تھا۔ نستعلیق کے متعلق اس قدر البتہ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ اور حافظ

ابراہیم کے ہاتھ کے قطعات جس ذوق وشوق سے سارے ہندوستان میں مقبول ہوئے اور کسی خوش نویس کے شاید نہ ہو سکے ہوں گے۔ لیکن اس پر بھی خطاطی کے فن میں لکھنؤ کا درجہ قریب قریب وہی تھا جو دیگر متمدن شہروں کا ہو سکتا ہے۔

مگر لکھنؤ کی خوش نویسی نے مطبع کی ترقی میں جو کام کیا شاید کہیں کی خوش نویسی نہ کر سکی ہوگی۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے مطبع کہاں سے جاری ہوا۔ کلکتے میں اردو لٹریچر کی ترقی اور نیز عام مشرقی علوم کی تقویت میں بہت کچھ اہتمام کیا گیا مگر وہاں ٹائپ کے سوا پتھر کے چھاپے کی پرانی کتابیں میں نے نہیں دیکھیں۔

لکھنؤ میں یہ عہد غازی الدّین حیدر (سنہ ۱۲۴۳ محمدی تا سنہ ۱۲۵۶ محمدی، مطابق سنہ ۱۸۱۴ء تا سنہ ۱۸۲۷ء) ارسل نام ایک یوروپین نے آکے لوگوں کو مطبع کا خیال دلایا۔ اور جب اہل علم مشتاق ہوئے تو اس نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا۔ اُس نے پریس اور تمام سامان یہیں تیار کرا کے چھاپنا شروع کیا۔ اور زاد المعاد، ہفت قلزم اور تاج اللغات (جو بہت سی جلدوں میں تھی) چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کیں۔ اُس سے سیکھ کے اور لوگوں نے بھی مطبع جاری کرنا شروع کیے۔ جن میں سب سے پہلا مطبع غالباً حاجی حرمین شریفین کا تھا۔ اُنھی دنوں مصطفیٰ خاں، شیشہ آلات کے ایک دولت مند تاجر کچھ چھپانے کے لیے حاجی حرمین کے پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفیٰ خاں نے گھر آ کے خود اپنا مصطفائی مطبع جاری کر دیا، جسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد علی بخش خاں نے علوی مطبع جاری کیا اور لکھنؤ میں کثرت سے چھاپے خانے کھلنے لگے۔

ابتداءً طبع کا کام یہاں تاجرانہ اصول پر نہیں بلکہ شوقینی کی شان سے جاری ہوا۔ عمدہ سے عمدہ اُروِلی کاغذ لگایا جاتا جو پتھر کے چھاپے کے لیے نہایت ہی موزوں تھا۔

بڑے بڑے خوش نویسوں کو مجبور کر کے اور بڑی بڑی تنخواہیں دے کے اُن سے کتابت کا کام لیا جاتا، اور بغیر اس کے کہ کارگزاری کی کچھ بھی شرط ہو یا اس کا ذرا بھی خیال کیا جاتا ہو کہ وہ دن بھر میں کتنا لکھتے ہیں لکھتے بھی ہیں یا نہیں، اُن کی خاطر داشت کی جاتی اسی طرح پریس مینوں سے بھی نہ پوچھا جاتا کہ دن بھر میں کتنے کاغذ چھاپے۔ روشنائی کے لیے کڑوے تیل کے ہزاروں چراغ روشن کر کے اول درجے کا کاجل تیار کیا جاتا، کھٹائی کے عوض لیموں کا عرق صرف ہوتے اور کپڑے کی جگہ اصلی اسفنج کام میں لایا جاتا۔ غرض ہر چیز اول درجے کی کام میں لائی جاتی۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی زمانے میں فارسی و عربی کی درسی و دینی کتابیں جیسی لکھنؤ میں چھپ کے تیار ہوئیں اہلِ بصیرت کے نزدیک کہیں نہ چھپ سکی ہونگی۔ اُس وقت کی چھپی ہوئی کتابیں جس کسی کے پاس موجود ہیں، ایک دولت ہے اور لوگ ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے۔

میرے والد کے حقیقی چچا مولوی احمد صاحب کو سفر اور تجارت کا بڑا شوق تھا۔ اور اُس زمانے میں جب کہ لوگ گھر سے باہر قدم نکالتے ڈرتے تھے، انھوں نے حاجیِ حرمین شریفین کے ایجنٹ کی حیثیت سے رتھوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ہو کے اور ہزاروں کتابیں ساتھ لے کے لکھنؤ سے راولپنڈی تک سفر کیا تھا۔ اُن کا بیان تھا کہ کتابیں اُن دنوں عنقا تھیں۔ یہاں کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں کھُل جاتی تھیں اور پروانہ وار گرتے تھے۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہم جس شہر یا گانو میں پہنچتے، ہم سے پہلے ہماری خبر پہنچ چکتی، اور ہمارا داخلہ عجب شان و شوکت سے ہوتا۔ ادھر ہم کسی بستی میں پہنچے ادھر خلقت نے گھیر لیا۔ بھیڑ لگ جاتی تھی، اور ہم جس کتاب کو جس قیمت پر دیتے، لوگ بے عذر لے کے آنکھوں سے لگاتے۔ ہم کریما، ماسقیمان وغیرہ کو فی جلد ہر پانچ کے حساب سے اور گلستاں، بوستاں کو فی جلد تین روپے یا چار روپے کے نرخ سے بیچتے۔ اور اُس پر یہ حال تھا کہ ہم مانگ

کو پورا نہ کر سکتے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے پہنچتے کتابوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا، اور نئے مال کے انتظار میں مہینوں ٹھہر جانا پڑتا۔ اُن دنوں مال کا پہنچنا دشوار تھا، مگر ہم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ برابر مال لکھنؤ سے آتا رہتا۔

شاہی کے آخر دَور میں مصطفائی مطبع اپنی چھپائی کے لحاظ سے دُنیا میں جواب نہ رکھتا تھا۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد منشی نول کشور نے اپنا مطبع جاری کیا۔ گو وہ چھپائی کی خوبی میں مصطفائی مطبع کا مقابلہ نہیں کر سکا مگر تجارت کے اُصول پر چل کے اُس نے فارسی و عربی کی اتنی بڑی ضخیم کتابیں چھاپ دیں کہ آج کسی مطبع کو اُن کے طبع کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ میں اگلی شوقینی نے پریس کا ایسا مکمل سامان جمع کر رکھا تھا کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے منشی نول کشور ہی کے ایسے بلند حوصلہ صاحبِ مطبع کی ضرورت تھی۔ آخر نول کشور پریس نے یہاں تک عروج پایا کہ سارے مشرقی لٹریچر کو اس نے زندہ کر دیا اور باعتبار وسعتِ طبع کے جو فوقیت لکھنؤ کو حاصل ہو گئی، اور کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکتی۔ اور اسی کی برکت تھی کہ وسطِ ایشیا میں کاشغر و بخارا تک اور افغانستان و ایران کی ساری علمی مانگ لکھنؤ ہی پوری کر رہا تھا۔ چنانچہ آج تک نول کشور پریس علمی تجارت کی کنجی ہے جس سے کام لیے بغیر کوئی شخص علمی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

مگر افسوس اب لکھنؤ میں باوجود کثرتِ مطابع کے، چھپائی کی حالت ایسی خراب ہو رہی ہے اور روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے کہ دوسرے شہر اس پر فوقیت لے گئے ہیں۔ اور ہماری نظر میں پریس مینوں کی اخلاقی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اب لکھنؤ میں اکثر شہروں کے مقابلے میں خراب چھپتا ہے۔ مگر ہمارے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ کان پور میں منشی رحمت اللہ صاحب رعد کی وجہ سے مطابع کی حالت اچھی ہے اور

کان پور درا صل لکھنؤ ہی کی ترقیوں کا ایک ضمیمہ ہے۔

مطبع ہی کے ساتھ لکھنؤ میں مصلحِ سنگی کا فن ایجاد ہوا۔ پتھر پر جو کاپی جمائی جائے، اُسے کسی حد تک چھیل کے اور قلم لگا کے درست کرنا غالباً یورپ ہی سے شروع ہوا ہوگا۔ اور وہاں اب بھی کیا عجب کہ اصلاح کا یہ عمل جاری ہو۔ مگر نسخ و نستعلیق کے حرفوں کو اس وضع سے درست کرنا کہ خوش نویس کی پوری شان باقی رہے اور کسی کو محسوس نہ ہو سکے کہ اس میں کسی اور کا بھی قلم لگا ہے، خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ جہاں ابتداءً یہ فن تو اسی حد پر محدود تھا کہ حروف اور نقش و نگار جیسے جس قدر اُڑ گئے یا پھیل کے پھیل گئے ہوں، اُن کو درست کر دیا جائے۔ مگر چند روز بعد یہاں کی جدت پسندی اس حد سے آگے بڑھی اور ایسے باکمال مصلحِ سنگ پیدا ہونے لگے جو پتھر پر پوری پوری کتابیں اُلٹی لکھ دیتے ہیں اور خط اپنی حدود پر اس قدر مکمل رہتا ہے کہ مجال کیا جو کوئی پہچان سکے کہ یہ پتھر پر اُلٹا لکھا گیا ہے۔ ابتداءً اس کے صاحبِ کمال موجد ایک پرانے بزرگ تھے جو مصطفائی مطبع کی شہرت و نام وری کے باعث ہوئے۔ اُن کے زمانے ہی میں اُن کے شاگردوں کی کثرت نے یہاں کے مطابع کو فائدہ پہنچایا۔ بہت سے لوگوں نے ترقی کی۔ اور شہر سے مصلحِ سنگ بہم پہنچانے لگا (کذا) جب مصلحِ سنگی بہت عام ہو گئی تو منشی جعفر حسین نام ایک مشہور مصلحِ سنگ کو اُن کی اعلا مشاقی نے آمادہ کیا کہ مطبع کو کاپی نویسی سے بے پروا کر دیں۔ اُنھوں نے پتھر پر اُلٹا لکھنا شروع کیا۔ یہ کام ابتداءً چھوٹے چھوٹے بازاری مطابع سے شروع ہوا اور آخر میں اعلا و ادنا سب مطبعوں میں ایک حد تک اختیار کر لیا گیا۔ اب منشی سید علی حسین صاحب نے اس حد تک ترقی کی کہ اُن کے اُلٹے لکھے ہوئے خط کو بہت سے مشہور خوش نویس بھی نہیں پا سکتے۔ چنانچہ اُن کی الٹی کتابت کا ایک معمولی نمونہ ہمارا دلگداز بھی ہے جس کی کاپیاں نہیں لکھی جاتیں

بلکہ منشی علی حسین صاحب مضامین کو پتھر پر الٹا لکھ دیا کرتے ہیں۔ ناظرین دلگداز کو پڑھ کے اور اس کے خط پر غور کر کے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مصلح سنگی کا فن لکھنؤ میں کس درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ گو کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں مصلح سنگ لکھنؤ ہی کے ہیں، لیکن اس وقت تک کسی اور شہر کے مطابع کو یہ بات نہیں نصیب ہوئی کہ کاپیاں جمانے کے عوض عبارت پتھروں پر الٹی لکھوا کے چھاپیں۔ یہ فن آج تک لکھنؤ ہی تک محدود ہے۔ مگر افسوس، پریس مینوں کی حالت خراب ہو جانے کے باعث لکھنؤ، مصلح سنگی کے اس کمال سے اُس قدر فائدہ نہیں اٹھا سکتا جس قدر کہ ہونا چاہیے۔

(۱۷)

ابھی ہمیں لکھنؤ کی بہت سی خصوصیتیں بیان کرنی ہیں، جن کو زیادہ تر تعلق اخلاقی چیزوں اور معاشرت کے امور سے ہے۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر کچھ کیفیت فنونِ جنگ کی بھی بیان کر دیں۔

سچ یہ ہے کہ یہ آخری دربارِ مشرق اس وقت قائم ہوا جب مسلمانوں اور علی العموم ہندوستانیوں کی سپہ گری کم زور پڑ چلی تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ پرانی سپہ گری کے فنون اتنے نہیں مٹے تھے جس قدر کہ پرانے فنون اور آلاتِ جنگ، نئے قواعدِ جنگ اور جدید آلاتِ حرب کے مقابلے میں بے کار ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پرانے فنونِ جنگ بجائے اس کے کہ مسلمانوں یا اہلِ ہند سے نکل کر کسی نئی ترقی یافتہ بہادر قوم میں عروج پاتے، دنیا ہی سے مٹ گئے۔ اور ایسے مٹے کہ موجودہ نسل اپنے آبا و اجداد کے شجاعانہ کارناموں اور اُن کے سپہ گرانہ کاموں سے بالکل ناآشنا ہے۔ اور آج جو اُن فنون کے تذکرے کے لیے ہم نے قلم اٹھایا ہے تو کوئی ایسا شخص بھی نہیں ملتا جس سے کچھ حالات معلوم ہوں۔

ہم شاہزادہ مرزا مسعود قدر بہادر بی ،اے۔ اور لکھنؤ کے ایک بہت قدیم بزرگ سلیمان خاں صاحب (جو حافظ رحمت خاں صاحب قدیم نام ور فرماں روائے بریلی کی نسل سے ہیں) نہایت شکر گزار ہیں کہ ان قدیم فنونِ جنگ کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں، انھی کی مدد سے لکھ رہے ہیں۔

سپہ گری کے جن فنون کا نشوونما دہلی میں اور دہلی کے بعد لکھنؤ میں ہوا، وہ دراصل تین مختلف قوموں سے نکلے تھے اور تینوں کے امتزاج سے اُن میں مناسب ترقیاں ہوئی تھیں۔ اور حیرت کی یہ بات ہے کہ باوجود میل جول کے ان میں آخر تک اصلی امتیاز باقی تھا۔ بعض فن آریا قوم کے سپہ گروں سے نکلے تھے۔ بعض کو ترک اور بہادرانِ تاتار اپنے ساتھ لائے تھے اور بعض خاص عربوں کے فن تھے جو ایران میں ہوتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ لکھنؤ میں جن فنون کا رواج تھا اور جن کے باکمال استاد موجود تھے، وہ حسبِ ذیل معلوم ہوتے ہیں:

(۱) لکڑی (۲) پٹا ہلانا (۳) بانک (۴) بنوٹ (۵) کشتی (۶) برچھا (۷) بانا (۸) تیر اندازی (۹) کٹار (۱۰) جل بانک۔

(۱) لکڑی

یہ اصلی فن جسے پھنکیتی کہتے ہیں، آریا لوگوں کا تھا جو ہندوستانی اور ایرانی دونوں ملکوں کے آریوں میں مروّج تھا۔ عربی فتوحات کے بعد ایران کی پھنکیتی پر عربی جنگ جوئی کا اثر پڑ گیا۔ اور وہاں کی پھنکیتی بہ مقابل ہندوستان کے زیادہ ترقی کر گئی۔ ہندوستان میں آخر تک یہ دونوں فن اپنی ممتاز وضعوں میں باقی رہے اور لکھنؤ میں دونوں اسکول قائم تھے۔ ایران کی عربی آمیز پھنکیتی، یہاں علی مد کے نام سے مشہور تھی اور خالص ہندی پھنکیتی، رستم خانی کے لقب سے یاد کی جاتی۔ علی مد میں

پھنکیت کا بایاں قدم ایک مقام پر جما رہتا اور صرف داہنے پاؤں کو آگے پیچھے ہٹاکے پنیترے بدلے جاتے۔ برخلاف اس کے رستم خانی میں پھنکیت، پینترے بدلتے وقت داہنے بائیں اور آگے پیچھے جس قدر چاہتا یا جگہ پاتا، ہٹتا بڑھتا اور ناگہاں حریف پر آپڑتا۔ ایک یہ امتیاز بھی تھا کہ علی مد کا فن خاص رئیسوں اور شریفوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس کے استاد کبھی کسی رذیل یا ادنا طبقے کے آدمی کو اپنا شاگرد نہ بناتے اور نہ اپنے فن سے واقف ہونے دیتے۔ بخلاف اس کے رستم خانی کا فن اجلاف اور ادنا طبقے کے لوگوں میں عام تھا۔

علی مد کے ایک زبردست استاد فیض آباد میں شجاع الدولہ بہادر اور ان کے بعد ان کی بیوہ بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے وابستہ تھے ان کا ذکر تاریخ فیض آباد میں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے سب سے پہلے استاد وہی تھے جو فیض آباد میں رہے اور پھر وارد لکھنؤ ہوئے۔ دوسرے استاد اسی فن کے محمد علی خاں تھے جو خاص ہمارے محلے کٹرہ بزن بیگ خاں میں رہتے تھے، اور علی مد کے موجد مانے جاتے۔ تیسرے استاد میر نجم الدین تھے جو شاہزادگان دہلی کے ساتھ پہلے بنارس میں گئے اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آئے۔ ان کا معمول تھا کہ صرف شریفوں کو شاگرد کرتے، اور شاگرد کرتے وقت شاہزادوں سے دولت اور شریفوں سے صرف مٹھائی لیتے اور اسے بجائے اس کے کہ اپنے کام میں لائیں، خود لے جا کے سادات بنی فاطمہؑ کی نذر کر دیتے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں تھے ایک بہت بڑے استاد میر عطا حسین تھے، جو حکیم مہدی کے مخصوصین میں تھے۔ ایک بہت بڑے استاد بیٹے باز خاں تھے جو اپنے کمال کے باعث غازی الدین حیدر کے زمانے میں علی مد کے موجد و بانی مشہور ہو گئے۔ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نومسلم تھے مگر وضع ان کی بھی یہی تھی کہ سوا شریفوں کے اپنا فن کبھی کسی ادنا طبقے کے آدمی کو نہیں بتایا۔ انھوں نے لکھنؤ میں اپنی یادگار ایک مسجد چھوڑی ہے جو دھنیا مہری کے پل سے آگے عالم نگر

کے قریب آج تک موجود ہے۔

رستم خانی عوام میں رہی۔ اور اسی وجہ سے اس کو کوئی خصوصیت ہندو یا مسلمان کے ساتھ نہیں رہی بلکہ اس کے صدہا استاد اودھ کے تمام گانوؤں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم لکھنؤ میں یحییٰ خاں بن محمد صدیق خاں نے جو کمال اور نام وری رستم خانی میں حاصل کی، کسی کو نہ نصیب ہو سکی۔ نوّاب فتح یاب خاں عالی مرتبہ رئیسوں میں ہونے کے باوجود بڑے خوش نویس بھی تھے اور انھوں نے رستم خانی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کے ایک مشہور بانکے پہلوان میر لنگر باز بھی رستم خانی کے استاد تھے۔ اور اب تک تھوڑا بہت رواج باقی ہے تو ادنا لوگوں میں۔ علی مدد کا فن شرفا کے ساتھ مخصوص تھا اور شرفا کو سپہ گری سے کوئی واسطہ نہیں رہا، لہٰذا وہ فن بھی مٹ گیا۔ رستم خانی ادنا لوگوں میں تھی، اور وہ لوگ آج بھی لڑتے بھڑتے رہتے ہیں، لہٰذا ان میں رستم خانی کا رواج آج تک موجود ہے۔

علی مدد کے دو ایک استاد ہیں نے مٹیا برج میں دیکھے تھے۔ اور سب کے آخر میں میر فضل علی تھے جو محلہ محمود نگر میں رہتے تھے۔

(۲) پٹا ہلانا

اس فن کی اصلی غرض یہ تھی کہ انسان دشمنوں کے نرغے میں پڑ جائے تو لکڑی کے ہاتھ چاروں طرف پھینکتا ہوا سب کو ہٹا کے، سب سے بچ کے اور سب کو مارتا ہوا نکل جائے۔ پٹے کو ٹیک کے اڑنا اس فن کا خاص کمال تھا اور سب سے بڑی تعریف اس بات کی تھی کہ انسان پر ایک ساتھ دس تیر بھی آ کے پڑیں تو ان کو کاٹ دے۔ یہ فن دہلی میں نہ تھا۔ لکھنؤ میں پورب سے آیا اور جُلاہوں میں زیادہ مُروّج تھا۔ اگرچہ آخر میں بہت سے شرفا نے بھی خصوصاً قصبات کے

شیخ زادوں نے اختیار کر لیا۔ غلام رسول خان کا بیٹا گوری پٹے باز لکھنؤ میں اس فن کا سب سے بڑا باکمال مانا جاتا تھا جس کے صدہا واقعات عوام میں مشہور تھے مگر افسوس اب یہ افسانے بھی موجودہ نسل کو بھولتے جاتے ہیں۔

میر رستم علی کے سیفے میں دونوں طرف باڑھ ہوتی اور اسے ہلاتے ہوئے سیکڑوں حریفوں کو چیر کے نکل جاتے۔ اسیون کے ایک شیخ زادے شیخ محمد حسین دونوں ہاتھوں سے پٹا ہلاتے۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ایک دن صاحب رزیڈنٹ بہادر اور بعض یورپین مہمانوں نے اس فن کے کسی صاحبِ کمال کا کمال دیکھنا چاہا۔ شیخ محمد حسین آموجود ہوئے۔ چوں کہ اُس وقت پٹا اُن کے پاس نہ تھا، شاہی اسلحہ خانے سے ایک پر تکلف مرصّع و مکلّل پٹا دیا گیا۔ جسے لے کے انھوں نے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ ہر طرف سے تحسین کے نعرے بلند ہوئے اور وہ اسی تحسین و مرحبا کے جوش میں پٹا ہلاتے ہوئے مجمع سے نکل کے چلے گئے اور اپنے گھر پہنچے۔ اہلِ فن میں مشہور تھا کہ جو شخص پٹا ہلانا جانتا ہے، وہ دس تلوار والوں کو بھی پاس نہ پہنچنے دے گا۔

اسی فن کے ایک صاحبِ کمال لکھنؤ میں میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ اُن کی نسبت شہرت تھی کہ حریف کے ہاتھ میں کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو، اُسے توڑ ڈالتے۔

(۳) بانک

فنونِ جنگ میں یہ بہت ہی اہم اور نہایت بکار آمد فن تھا اور اصولاً دوسرے فنون پر فوقیت رکھتا تھا اور شریف زادے خاص کوشش اور خاص شوق سے اس فن کو سیکھتے۔ اصلی غرض اس فن کی چھریوں سے حریف کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ فن قدیم الایام سے ہندوؤں میں بھی تھا اور عربوں میں بھی، مگر چھریاں دونوں کی جداگانہ ہوتی تھیں۔

ہندوؤں کی چُھری سیدھی ہوتی جس پر دونوں طرف باڑھ ہوتی۔ اور عربوں کی چُھری خم دار خنجر نُما ہوتی جس پر ایک ہی طرف باڑھ ہوتی، مگر عربوں کی آخری چُھری جنبیہ ہے جس کی نوک سے کچھ دُور تک چاروں طرف چار باڑھیں ہوتی ہیں اور اُس سے ایسا چوپھانکا زخم پڑتا ہے کہ کہتے ہیں کہ اُس میں ٹانکا لگانا مشکل ہوتا ہے۔ غرض اس حربے سے لڑنے کے فن کا نام بانک ہے۔ اِس کی تعلیم یوں ہوتی ہے کہ استاد شاگرد دونوں آمنے سامنے دو زانو بیٹھتے ہیں۔ مگر ہندوؤں والی سیدھی چُھری کی تعلیم میں قاعدہ تھا کہ دونوں مقابل دو زانو۔ بیٹھنے کے ساتھ ایک گھٹنا کھڑا رکھتے اور عربوں والی چُھری کی تعلیم میں بالکل دو زانو بیٹھتے تھے، اور چوٹوں کے ساتھ بڑے زبردست پیچ ہوتے جن کے آگے کُشتی کے پیچوں کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ یہ فرق بھی بتایا جاتا ہے کہ عربوں کے فن میں اصلی سات چوٹیں تھیں اور ہندوؤں کے فن میں نو۔ عربوں کی بانک میں پیچ پورا بندھ جاتا تو حریف کو زندہ چھوڑنا باندھنے والے کے اختیار سے باہر ہو جاتا۔ اور ہندوستان والوں کے فن میں آخر تک اختیار میں رہتا کہ جب چاہیں پیچ کھول کے حریف کو بچا دیں۔

اِس فن میں صرف چوٹیں ہی نہیں ہیں، بلکہ بڑے بڑے زبردست پیچ ہیں جن میں دونوں حریف گھنٹوں گتھے رہتے اور پے در پے پیچ کر کے ایک دوسرے کو باندھ کے زخمی کر دینے کی کوشش کرتے۔ اِس فن کے پیچ اِس قدر سچے اور حکمی اور اصول کے ساتھ تھے کہ کہا جاتا کُشتی اور لکڑی کے تمام پیچ بانک ہی سے نکلے ہیں بانک کے استادوں میں مشہور تھا کہ بانک لیٹ کے پوری ہوتی ہے، بیٹھ کے آدھی رہتی، اور کھڑے ہو کے صرف چوتھائی رہ جاتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بنکیت کا کام صرف یہ ہے کہ حریف کو چُھری سے زخمی کر دے، نہیں، اُس کا اصلی کام یہ ہے کہ حریف کو زندہ باندھ لے اور بے بس کر کے گرفتار کرلائے

ایک یہ خاص بات بھی تھی کہ بانک والا اپنے فن کو حتیّ الامکان مخفی رکھتا اُس کی وضع قطع اور طور طریق کسی بات سے نہ پہچانا جاتا کہ وہ سپہ گر ہے۔ بنکیت، عام ثقہ شریفوں کی وضع رکھتے، کفشین پہنتے، کوئی ہتھیار نہ باندھتے، حتیٰ کہ اُن میں لوہے کے قلم تراش یا سوئی تک کے پاس رکھنے کی قسم تھی۔ صرف ایک رومال رکھتے اور اُس کے ایک کونے میں ایک لوہے کا چنا بندھا رہتا۔ بس یہی حربہ ضرورت کے وقت انھیں کام دے جاتا۔ یا اس سے بھی زیادہ تہذیب برتتے تو ہاتھ میں تسبیح رکھتے اور اس میں لوہے کا بھدّا سا قبلہ نما لگا ہوتا۔ بس یہی حربہ اُن کے لیے کافی تھا۔

ہندوؤں میں قدیم الایّام سے یہ فن خاص برہمنوں میں تھا، راج پوت نہیں جانتے تھے۔ نہ برہمن انھیں سکھاتے، اور نہ وہ اپنی وضع کے خلاف تصوّر کر کے اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے۔ جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ بنکیت ہونے کے لیے ثقاہت شرط تھی، اور راج پوت کھلے سپاہی تھے۔ برہمن بنکیت، قبلہ نما یا لوہے کے چنے کے عوض ایک کنجی رکھتے جو جنیو میں بندھی رہتی اور اُس سے کام لے کے، نہایت ہی تہذیب و متانت کے ساتھ دشمن کا کام تمام کر دیتے۔ شاہ زادہ مرزا ہمایوں قدر بہادر فرماتے ہیں کہ لکھنؤ میں یہ فن شاہ عالم کے زمانے میں اُس وقت آیا جب مرزا خرّم بخت بہادر بنارس آئے اور اس فن کے دو ایک باکمال اپنے ساتھ لائے لیکن ہمیں معتبر ذریعے سے اور تاریخِ فیض آباد کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اِس فن کے باکمال منصور علی خاں بنکیت، شجاع الدّولہ ہی کے زمانے میں فیض آباد میں آ گئے تھے۔

نوّاب آصف الدّولہ کے عہد میں بانک کے استاد لکھنؤ میں شیخ نجم الدّین تھے۔ اُسی قریب زمانے میں بانک کے ایک دوسرے استاد لکھنؤ میں موجود تھے جو میر بہادر علی کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کو دعوا تھا کہ پلنگ کے نیچے جنگلی کبوتر چھوڑ دیجیے اور تماشا دیکھیے، کسی طرف سے نکل کے اُڑ جائے تو جانیے کہ میں بنکیت نہیں۔ اُنکی پر

منحصر نہیں، بانک کی یہی تعریف ہے اور ہر اُستاد اس کا دعوا کر سکتا تھا۔ لکھنؤ میں ایک تیسرے استاد ولی محمد خاں تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شیخ نجم الدین کے شاگرد کے شاگرد میر عباس کا نام مشہور تھا۔ اور ان کے چار شاگرد نام ور ہوئے۔ جن میں سے ایک نوڈا کو تھا، باقی تین مہذب شرفا تھے۔ اِس فن کے آخری استاد میر جعفر علی تھے جو لکھنؤ کی تباہی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج میں پہنچے۔ انھیں میں نے دیکھا تھا اور بچپن میں خود ان کا شاگرد ہوا تھا۔ مگر دو ایک مہینے سیکھ کے چھوڑ دیا اور جو کچھ سیکھا تھا خواب و خیال سا رہ گیا۔ اب نہیں جانتا کہ کوئی جاننے والا ابھی باقی ہے یا نہیں۔

(۴) بنوٹ

اس فن کی اصلی غرض یہ ہے کہ حریف کے ہاتھ سے تلوار، لٹھ، یا کوئی حربہ ہو اگرا دے۔ اور ایک رومال سے جس میں پیسا بندھا ہوا کرتا ہے یا اپنے ہاتھ ہی سے حریف کو ایسا صدمہ پہنچائے کہ اُس کا کام تمام ہو جائے۔ اس فن کی نسبت لکھنؤ میں ابتدا سے مشہور تھا کہ اس کے بڑے بڑے زبردست استاد حیدر آباد دکن میں ہیں۔ اور وہاں جانے اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ واقعی وہاں اب تک یہ فن ایک حد تک زندہ ہے۔ واقف کار لوگوں کا بیان ہے کہ کھڑے ہو کے مقابلہ کرنے والا صاحبِ فن اگر نہتا ہے، تو کشتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں چھری ہے تو بانک ہے۔ اور اگر کوئی دو گز کا لمبا سونٹا یا رومال اس کے ہاتھ میں ہے، تو بنوٹ ہے۔ بنوٹ والے بھی اپنے فن کو مخفی رکھتے ہیں اور باہمی عہد ہے کہ صرف شریف کو سکھائیں گے اور اس سے عہد لے لیتے ہیں کہ کبھی زبردست یا بے آزار آدمی پر حربہ نہ کریں گے۔ بنوٹ والوں کے پینترے جنھیں وہ پاولے کہتے ہیں، بہت ہی اعلا درجے کے پھرتیلے ہیں

اور بے انتہا صفائی چاہتے ہیں، جو زیادہ عمر والوں کو نہیں حاصل ہو سکتے۔ اس کے علاوہ بنوٹ والوں کو جسمِ انسانی کے تمام رگ پٹھوں کا پورا علم ہوتا ہے اور خوب واقف ہوتے ہیں کہ کس مقام پر صرف انگلی سے دبا دینا یا ایک معمولی چوٹ انسان کو بے تاب و بے دم کر دے گی۔ اگرچہ اس فن کے لیے حیدر آباد مشہور تھا مگر لکھنؤ میں بھی اس کے بہت سے باکمال موجود تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے محمد ابراہیم خاں، رام پور سے لائے تھے۔ طالب شیر خاں یہاں ایک بڑے زبردست بانکے تھے اور تلوار کے دھنی۔ اُنھوں نے جو ابراہیم خاں کا دعوا سنا تو تلوار لے کے مقابلے کو تیار ہو گئے۔ محمد ابراہیم خاں نے بھی مقابلہ منظور کر لیا۔ طالب شیر خاں نے جیسے ہی تلوار ماری، محمد ابراہیم خاں نے اپنا رومال جس کے کونے میں پیسہ بندھا ہوا تھا، کچھ ایسی خوبی سے مارا کہ طالب شیر خاں کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کے چھن سے دور جا گری۔ منہ دیکھ کے رہ گئے اور سب نے محمد ابراہیم خاں کی اُستادی کا اعتراف کیا۔

اِس کے بعد لکھنؤ میں آخر تک یہ فن رہا۔ یہاں تک کہ مٹیا برج میں بھی محمد مہدی نام ایک شخص جو نواب معشوق محل کے وہاں کے داروغہ تھے، بنوٹ کے باکمال اُستاد مانے جاتے تھے۔

کُشتی (۵)

یہ فن خاص آریوں کا تھا، ہندوستان میں بھی اور ایران میں بھی۔ عرب اور ترک اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں بھی، جو آریا لوگوں سے پہلے تھے، اس فن کا پتا نہیں چلتا۔ لکھنؤ میں پیچوں اور حریف کے زیر کرنے کے طریقوں کا بہت نشو و نما ہوا۔ مگر کُشتی کا اصلی دار و مدار جسمانی قوت پر ہے اور قوت میں، لکھنؤ والے لاکھ کوشش کریں، مشرقی ممالک، خاصتہً

پنجاب کے لوگوں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت ہی نہیں دی ہے کہ اُس کی خاک سے غلام وغیرہ کے ایسے پیل تن پہلوان پیدا ہوں۔ اس لیے لکھنؤ کا کُشتی کا فن صرف پیچ کا کمال دکھانا تھا۔ جس میں زیادہ سے زیادہ اپنے سے دونے پر غلبہ حاصل ہو جاتا۔ مگر اِس سے زیادہ طاقت والے کو زیر کرنا غیر ممکن تھا۔ لکھنؤ کے اکھاڑوں اور اگلے پہلوانوں کے قصّے بہت مشہور ہیں۔ مگر سب پیچ کے لحاظ سے، نہ زور آوری کے اعتبار سے۔ ایک بار میں نے یہاں کے ایک مشہور پہلوان سیّد کی لڑائی ایک دونے قد کے پنجابی پہلوان سے دیکھی۔ اس میں شک نہیں کہ سیّد کی لڑائی ابتدا سے نہایت خوب صورت تھی۔ اِس کی چلت پھرت اور اُس کا پھرتیلا پن قابلِ تعریف تھا مگر انجام یہ ہوا کہ گھنٹا بھر میں سیّد پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی اور دم پھول گیا تھا۔ اور پنجابی پہلوان پر، جو اُسے کھلا رہا تھا، کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ آخر سیّد خود ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا اور بے لڑے ہار مان لی۔

(۶) برچھا

جنگ جوئی کا یہ پرانا فن ہے جو آریوں، ترکوں اور عربوں، سب میں تھا۔ عربوں کا برچھا لمبا ہوتا اور اُس کا پھل تکونا۔ ترکوں کا برچھا چھوٹا ہوتا اور پھل گول نوک دار یعنی مخروطی۔ اور ہندوستان کے آریوں کا برچھا لمبا ہوتا مگر اس کا پھل پتلا، باڑھ دار، پان کی قطع کا۔ اور تعجّب یہ ہے کہ تینوں طرح کے نیزے لکھنؤ میں موجود تھے۔ بڑے برچھے پانچ گز کے لمبے ہوتے اور چھوٹے برچھے تین گز کے۔ بڑے برچھے کی تعریف یہ تھی کہ خوب لچکے، یہاں تک کہ دُہرا ہو جائے۔ اور چھوٹے کی یہ تعریف تھی کہ اُس میں نام کو بھی لچک نہ ہو۔ اور اسی مناسبت سے دونوں کے چلانے کے فن جُدا جُدا تھے۔ لکھنؤ کے مشہور اور اصلی برچھیت میر کلّو تھے۔ جن کا نام بُرہان الملک کے زمانے ہی میں چمک گیا تھا۔ اُن کے بعد میر اکبر علی برچھیت مشہور ہوئے۔ پھر بریلی اور

رام پور سے اکثر برچھیت آنا شروع ہو گئے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں بادشاہ کو ہاتھیوں کے شکار کا شوق ہوا تو برچھے کا فن جاننے والوں کی بڑی قدر ہوئی اور لڑائیوں میں بھی حربہ زیادہ کام دینے لگا۔ افسوس، یہ قدیم حربہ جس سے بڑی بڑی پُرانی قوموں نے نام وری پیدا کی تھی، لکھنؤ میں اصلی یا نقلی طور پر آج بھی کثرت سے باقی ہے، مگر صرف براتوں کے جلوس کا کام دیتا ہے۔

(۷) بانا

یہ فن بھی ادنا درجے کے لوگوں میں تھا اور کسی حد تک آج بھی باقی ہے۔ لٹھ کی لڑائی کے ہاتھ اور زدیں اسی سے نکلی ہیں۔ غرض اور غایت بانے کی بھی یہ ہے کہ بانا یا لٹھ چلاتا ہوا انسان دشمنوں کے نرغے میں سے نکل جائے۔ بانا ایک لمبی لکڑی کا نام تھا جس کے ایک طرف لٹّو ہوتا۔ اور بعض دونوں طرف لٹّو رکھتے۔ اور اس طرح ہلاتے کہ کوئی قریب نہ آسکتا۔ بعض لوگ لٹّوؤں میں کپڑا باندھ کے اور تیل میں ڈبو کے انھیں روشن کرتے، اور اس طرح ہلاتے کہ اپنے اوپر آگ کا مطلق اثر نہ ہو اور دشمن آگ کی وجہ سے دُور ہی دُور رہے۔

(۸) تیر اندازی

یہ دنیا کی تمام جنگ جو قوموں کا پُرانا حربہ اور عہدِ قدیم کی بندوق ہے جس میں بڑے بڑے کمالات دکھائے جاتے اور شریف و رذیل سب اس کی تعلیم لازمی سمجھتے۔ یہی حربہ ہے جس سے راجہ رام چندر جی اور ان کے بھائی لچھمن جی نے راون اور اُس کے ایسے کوہ پیکر حریفوں کو مار کے گرا دیا۔ اگرچہ بندوق کی ایجاد نے اُس کا زور کم کر دیا تھا، مگر پھر بھی سپہ گری کا اعلا جوہر تیر اندازی سمجھی جاتی۔ کمانیں اتنی کڑی رکھی جاتی تھیں کہ اُن کا چلّا کھینچنا ہر ایک کے لیے آسان نہ تھا۔ بلکہ جس کی کمان جتنی

زیادہ کڑی ہوتی، اُسی قدر زیادہ اُس کا تیر دُور جاتا اور کاری ہوتا۔ عربوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں تیر اندازی کے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں جو حیرت انگیز ہیں۔ اُمّ ابان نام دس پانچ ہی روز کی بیاہی ہوئی ایک عربیہ دلھن نے فتح دمشق کے موقع پر اپنے شہید دولہا کے انتقام میں ایسے زبردست تیر برسائے کہ پہلے نے دشمنوں کے علم بردار کو مار کے گرا دیا اور دوسرا دشمنوں کے بہادر سردار تامس کی آنکھ میں اس طرح پیوست ہو گیا کہ کسی کے نکالے نہ نکل سکا اور آخر کانسی کاٹ کے آنکھ ہی میں چھوڑ دی گئی۔

اودھ کے پاسی اور بھر اس فن کو پہلے سے بخوبی جانتے تھے۔ پھر نئے نئے استاد دہلی سے آئے اور آصف الدّولہ کے عہد میں استاد فیض بخش نے بادشاہ کے اشارے سے مرزا حیدر کے والد کو جو ہاتھی پر سوار آ رہے تھے، ایسی پھرتی سے تیر مارا کہ نہ کسی نے اُن کو نشانہ بازی کرتے دیکھا اور نہ انھیں خبر ہوئی۔ حالاں کہ تیر پٹکے کو توڑ کے نکل گیا تھا۔ وہ آخر تک بے خبر رہے۔ گھر پہنچ کے پٹکا کھولا تو وہ خون آلود تھا اور ساتھ ہی زخم سے خون کا فوّارہ چھوٹا اور دم بھر میں مر گئے۔

اس کی تعلیم کا طریقہ بھی مشکل تھا۔ مگر اب یہ فن دنیا کی تمام متمدّن قوموں میں فنا ہو گیا۔ اس لیے کہ موجودہ آتش بار اسلحہ نے اسے بالکل بے کار کر دیا ہے۔ مگر ہندوستان کی وحشی قوموں میں آج تک باقی ہے جو شکار اور درندوں کے مارنے میں عمومًا اور کبھی باہمی جنگ و پیکار میں بھی تیروں سے کام لیا کرتی ہیں۔

(۹) کٹار

یہ پُرانا خاص آریا قوم کا حربہ تھا اور آخر میں اُس سے زیادہ تر چور اور قزّاق کام لیتے۔ اِس سے حریف پر ٹوک کے حملہ نہ کیا جاتا بلکہ اسے غافل رکھ کے حملہ کیا جاتا اسی

وجہ سے غالباً دہلی میں بھی اور خاصۃً لکھنؤ میں شرفا نے اُن سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا تھا کٹار سب باندھتے مگر اس سے لڑنا اور حربہ کرنا کوئی نہ جانتا تھا۔ اس سے حربہ کرنے کی تعریف یہ تھی کہ جب چاہیں تو حربہ کریں مگر دشمن کے جسم میں کہیں خراش بھی نہ آئے اور جب چاہیں تو قبضے تک پار ہو جائے۔ اس سے چور اکثر راتوں کو غافل اور سوتے حریف پر حملہ کرتے اور چھپ کے اس کا کام تمام کر آتے۔

(۱۰) جل بانک

یہ وہی بانک کا مذکورہ فن تھا جو پیراکی اور شناوری سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کریں اور اُسے باندھ لائیں یا پانی ہی میں اس کا کام تمام کر دیں۔ تاریخ میں اور کسی جگہ اس کا تذکرہ نہیں مگر لکھنؤ میں پیرنے کے ایک استاد میر کے جان نے اسے ایجاد کیا، اور سیکڑوں شاگردوں کو سکھایا۔ بادی النظر میں اس کی ایجاد لکھنؤ ہی میں ہوئی اور آج بھی پیراکی بعض یہیں کے استاد جانتے ہیں اور کہیں اس فن کا نام و نشان بھی نہیں۔

پیرائیوں میں لکھنؤ نے جو ترقی کی، اس کا تذکرہ ہم آیندہ کریں گے۔

(۱۸)

اُردو میں مثل مشہور ہے کہ "بڑھاپے میں انسان کی قوتِ شہوانی، زبان میں آجایا کرتی ہے۔" ویسے ہی بہادروں اور جاں بازوں کی قوّتِ شجاعت کی نسبت اکثر تجربہ ہوا ہے کہ جب کم زوری آتی ہے یا ہاتھ پیروں کی طاقت جواب دیتی ہے، تو ساری بہادری اور شجاعت دست و بازو سے نکل کے زبان اور آنکھوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنی گذشتہ شجاعت و نام وری کے افسانے بیان کرتے اور شجاعت کے

کارنامے اپنی ذات سے نہیں دکھاتے بلکہ اُن کا تماشا لڑنے والے جانوروں کے ذریعے سے دیکھتے اور دوسروں کو دکھا دکھا کے دادِ طلب ہوتے ہیں۔

یہی حال لکھنؤ کا ہوا۔ جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدانِ جنگ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کے جاں بازی اور خوں ریزی کا تماشا دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت سب جگہ ہے، مگر اِس میں جس قدر انہماک اہلِ لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ بلکہ سنگ دلی کی دل چسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجۂ کمال کو پہنچا دیا، اور مقامات کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اِس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دل کش تماشے سوادِ لکھنؤ میں دیکھے گئے، دہلی یا ہندوستان کا کوئی دربار درکنار، غالباً ساری دنیا کے کسی شہر میں نہ دیکھے گئے ہوں گے۔

لکھنؤ میں غیر کی شجاعت سے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ شوق تین طریقوں سے پورا کیا گیا: (الف) درندوں اور چوپایوں کو لڑا کے (ب) طیور کو لڑا کے (ج) تکلیں اور کنکوے لڑا کے یعنی پتنگ بازی کے ذریعے سے۔ ان تینوں قسموں کو ہم بہ قدرِ اپنی جستجو اور معلومات کے جُدا جُدا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

قسمِ اوّل یعنی درندوں اور چوپایوں کی لڑائی کا تماشا یہاں مندرجۂ ذیل جانوروں کو لڑا کے دیکھا گیا: (۱) شیر (۲) چیتے (۳) تیندوے (۴) ہاتھی (۵) اونٹ (۶) گینڈے (۷) بارہ سنگھے (۸) مینڈھے۔

درندوں کے لڑانے کا مذاق قدیم ہندوستان میں کہیں یا کبھی نہیں سنا گیا تھا۔ یہ اصلی مذاق پُرانے رومیوں کا تھا، جہاں انسان اور درندے کبھی باہم اور کبھی ایک دوسرے سے لڑائے جاتے تھے۔ مسیحیت کے عروج پاتے ہی وہاں بھی یہ

مذاق چھوٹ گیا تھا۔ مگر اب تک اسپین میں اور بعض دیگر ممالکِ یورپ میں وحشی سانڈ باہم اور کبھی کبھی انسانوں سے لڑائے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں غازی الدین حیدر بادشاہ کو غالباً اُن کے یورپین دوستوں نے درندوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق دلایا۔ بادشاہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ اور چند ہی روز میں شاہی دل چسپی ان خوف ناک اور وحشیانہ لڑائیوں میں ایسی بڑھی کہ کوئی امکانی کوشش نہیں اٹھا رکھی گئی۔ موتی محل میں عین لبِ دریا دو نئی کوٹھیاں، مبارک منزل اور شاہ منزل تعمیر کی گئیں۔ ان کے مقابل دریا پار کوسوں تک ایک فرحت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا، جس میں آہنی کٹہرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنا بنایا گیا تھا۔ اس میں قسم قسم کے ہزارہا جانور لا کے چھوڑے گئے تھے اور درندے کٹہروں میں بند کر کے رکھے گئے تھے۔ اسی رمنے کے سلسلے میں دریا کنارے ہی وحشی جانوروں کے لڑانے کے لیے بڑے بڑے میدان بانس کے ٹھاٹھروں یا آہنی حصار سے محفوظ کیے جاتے، جو شاہ منزل کے عین محاذی دریا کے اُس پار ہوتے۔ دریا کا پاٹ وہاں بہت کم ہے۔ بادشاہ اور اُن کے مہمان و مصاحبین، شاہ منزل کے بالائی صحن پر گنگا جمنی شامیانوں کے سایے میں بیٹھ کے اطمینان اور آرام سے سیر دیکھتے اور پار کے محصور میدان میں درندوں کی قیامت خیز لڑائی کا محشر بپا ہوتا۔ درندوں اور مست ہاتھیوں کا لڑانا تو آسان ہے، مگر اُس کی سنبھال نہایت ہی مشکل ہے۔ ایک مست ہاتھی یا شیر کٹہرے سے چھوٹ جاتا ہے تو شہروں میں بھگدر پڑ جاتی ہے اور بہت سی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مگر یہاں لوگ اِس خوف ناک کام میں اس قدر ہوشیار ہو گئے تھے کہ اُس وقت جو یورپین سیّاح دربار میں موجود تھے، خود اپنی تحریروں میں اقرار کرتے ہیں کہ وحشی جانوروں کے پالنے، سدھانے اور اُن کی داشت اور سنبھال کرنے والے آدمی لکھنؤ سے بہتر دنیا بھر میں کہیں نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہاتھیوں اور درندوں کو لا کے چھوڑتے، ان کو اپنے بس میں رکھتے، اُن کے ہارتے وقت

غالب و مغلوب دونوں درندوں کو اپنے قابو میں کرتے۔ اِس کام کے لیے سیکڑوں سانٹے مار اور بلّم بردار مقرر تھے جو اُنھیں مارتے اور اپنے آپ کو اُن کے حملوں سے بچاتے۔ لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخوں اور آتش بازیوں سے ان کو جدھر چاہتے موڑتے اور جہاں چاہتے، ہنکا لے جاتے۔ شیروں اور تیندوؤں کو کٹہروں میں بند کرتے۔ غرض اُن لوگوں کی پھُرتی، چالاکی، اور جلت پھرت اور ہوشیاری خود جانوروں کی لڑائی سے زیادہ دل چسپ اور حیرت انگیز تھی اِن باتوں کو دیکھ کے دم بھر میں نظر آجاتا کہ اِن بڑے بڑے دیو ہیکل جانوروں اور مہیب وحشی درندوں پر انسان دنیا میں کن اسباب سے غالب آیا ہے۔ اب ان جانوروں میں سے ہر ایک کی لڑائی کا جداگانہ حال سنیے، جو غالبًا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

۱: شیر

بادشاہ نے بہت سے شیر جمع کر رکھے تھے۔ جو نیپال کی ترائی سے پکڑ پکڑ کے لائے جاتے۔ ان میں سے بعض بہت بڑے تھے۔ بعض مختلف لڑائیوں میں غالب آ کے، بادشاہ کو بہت عزیز ہو گئے تھے۔ لڑائی کے لیے اُن کے کٹہرے میدان کے حصار کے پاس لا کے کھول دیے جاتے۔ دونوں حریف چھوٹتے ہی غرّا کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور دانتوں اور پنجوں سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے، باہم گتھ جاتے۔ کبھی یہ اس کو گرا کے اوپر چڑھ بیٹھتا۔ کبھی وہ اس کو زیر کرتا۔ دیر تک ایک نہایت ہول ناک لڑائی ہوتی رہتی، جس میں کبھی تو ایک حریف جان سے مارا جاتا، اور کبھی سخت زخمی ہو کے ہمت ہارتا۔ کثرت سے خون نکل جانے کے باعث کم زور ہو کے بھاگتا اور حریف غصّے سے اُس کا تعاقب کرتا۔ اس وقت ان دونوں کے سنبھالنے اور قابو میں لانے کے لیے لڑانے والوں کا کمال اور ان کی دوڑ دھوپ اور کارستانیاں

دیکھنے کے قابل ہوتیں۔

شیر اکثر تیندوؤں سے لڑائے جاتے۔ مگر یہاں ایسے ایسے زبردست تیندوے تھے جن سے شیر بہت ہی کم جیت سکتا۔ ان کی لڑائی کی شان بھی ویسی ہوتی جو شیروں کے باہم لڑنے کی ہے۔ کبھی کبھی شیر اور ہاتھی بھی لڑا دیے جاتے۔ مگر ان کی لڑائی جوڑ کی نہ ہوتی اور اس کے نتیجے بھی خلاف امید مختلف قسم کے ہوتے۔ اگر ہاتھی خوب جیالا ہوا تو شیر بہت کم اس سے پیش پا سکتا تھا۔ سب سے زیادہ پُرلطف لڑائی شیر اور گینڈے کی ہوتی۔ گینڈا سوا پیٹ کے حصۂ زیریں کے، روئیں تن واقع ہوا ہے۔ اس پر نہ شیر کے دانت اثر کرتے ہیں نہ پنجے۔ اسی قدرتی مضبوطی کے زعم میں وہ کسی زبردست سے زبردست حریف کی پروا نہیں کرتا۔ اور خود جب سر جھکا کے حریف کے پیٹ کے نیچے گھستا ہے تو اپنے بانسے کے اوپر والا ہول ناک سینگ پیٹ میں اس طرح پیوست کر دیتا ہے کہ آنتیں باہر نکل پڑتی ہیں اور حریف کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر کبھی ایسا ہوا کہ شیر نے گینڈے کو چاروں شانے چت گرا کے اپنے ناخنوں اور دانتوں سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا ہو۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا کہ گینڈا اپنا سینگ بھونک کے شیر کو مار ڈالتا۔

مگر سب سے زیادہ حیرت ناک یہ چیز ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک گھوڑے کے مقابلے میں شیروں کو بڑی زک اٹھانا پڑی۔ یہ عجیب غریب گھوڑا تھا جو مردم آزاری میں درندوں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی آدمی اُس کے پاس جائے۔ دانہ دُور سے اُس کی طرف بڑھا دیا جاتا۔ اور جب چھوٹ جاتا بہت سے آدمیوں کو ہلاک کر ڈالتا۔ جو سامنے آتا، اُسے مار کے، ہڈیاں پسلیاں چبا ڈالتا اور لاش ایسی بگاڑ دیتا کہ پہچانی نہ جاتی۔ مجبورًا تجویز ہوئی کہ اس پر شیر چھوڑ دیے جائیں۔ چناں چہ بھوریا نام شیر جو بادشاہ کو عزیز تھا، اور اکثر بازیاں لے چکا تھا، اُس پر چھوڑ اگیا۔ گھوڑا بجائے اس کے کہ شیر سے خوف کھائے، لڑنے کو تیار ہو گیا۔ اور جیسے ہی شیر جست کر کے اس پر

آیا، اُس نے اِس طرح اگلا جسم جُھکایا کہ شیر پشت پر گرا اور اس کے پٹھوں میں ناخون سے خنجر پیوست کر دیے۔ ساتھ ہی گھوڑے نے اِس زور سے پشتک ماری کہ شیر قلابازیں کھاتا ہوا دُور جا گرا۔ مگر پھر سنبھلا اور چند منٹ اِدھر اُدھر تاو دے کے پھر جست کر کے گھوڑے پر جا رہا۔ گھوڑے نے پھر وہی حرکت کی کہ اگلا جسم جھکا دیا۔ شیر پٹھوں پر جا پڑا۔ اور ارادہ کیا کہ اسے پنجوں سے گرا کے مار ڈالے۔ مگر گھوڑے نے اب کی اس زور سے دولتّی جھاڑی کہ شیر کے جبڑے ٹوٹ گئے اور چاروں شانے چت دُور جا گرا۔ لیکن اس چوٹ سے شیر نے ایسی ہمّت ہار دی تھی کہ گھوڑے کی طرف پیٹھ پھیر کے بھاگنے لگا، اور تماشائی حیران رہ گئے۔ تب دوسرا اُس سے بڑا شیر چھوڑا گیا۔ اس نے رُخ ہی نہ کیا۔ مجبوراً وہ شیر بھی ہٹا لیا گیا۔ اور تین ارنے بھینسے چھوڑے گئے۔ وہ بھی گھوڑے سے نہ بولے اور گھوڑے نے بڑھ کے، بے چھیڑے، ایک بھینسے پر اس زور سے دولتّی جھاڑی کہ وہ بھینسا تیورا گیا۔ اور اس کے دونوں ساتھی اس طرح سر ہلانے لگے گویا داد دے رہے ہیں کہ ہاں! یہ ہوئی! آخر گھوڑے کی جان بخشی کی گئی اور نصیر الدین حیدر نے کہا: "میں اس کے واسطے ایک آہنی کٹہرا بنوا دوں گا اور اس کی پرورش کا بھی سامان کر دوں گا۔ ابّا جانی کے سر کی قسم، یہ بڑا بہادر ہے۔"

۴: چیتا

سب ہی درندے لڑائی کے لیے دو ایک دن بیش تر سے بھوکے رکھے جاتے ہیں، مگر چیتے کے بارے میں اِس کا خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اِس لیے کہ چیتا جس قدر زیادہ ظالم و خوں خوار ہے، اُسی قدر بعض وقت بُزدل بھی ثابت ہوتا ہے۔ علی العموم بگڑے امیر زادوں کی طرح وہ خوشامد طلب خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میدان میں جب اس کا جی چاہے، لڑتا ہے اور جب نہ جی چاہے، لاکھ جتن کرو، نہیں لڑتا۔ لڑائی میں

وہ کترا تا اور کنیاتا ہوا حریف پر جاتا ہے، پہلے جست کر کے ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتا ہے، ایسی دو ایک جستوں کے بعد دونوں پچھلے پانو پر کھڑے ہو کے پنجوں سے لڑنے لگتے ہیں۔ یہ بڑی خوں ریز لڑائی ہوتی ہے جس میں دونوں غرّاتے جاتے ہیں اور حریف پر پنجے مارتے جاتے ہیں۔ آخر زبردست، کم زور کو گرا کے، مار مار کے، حریف کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مگر خود بھی سر سے پانو تک زخمی ہو جاتا ہے۔

۳ : تیندوا

تیندوا چھوٹے پیمانے کا شیر ہوتا ہے، مگر کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں شیروں سے اکثر لڑنے والے تیندوے تھے، جو قیامت کی لڑائی لڑتے اور اکثر شیروں پر غالب آجاتے۔ تیندوے کی لڑائی بالکل شیروں کی سی ہوتی ہے۔ لڑتے لڑتے دونوں حریف سخت زخمی ہو جاتے ہیں۔ اور مغلوب حریف کبھی تو وہیں میدان میں گر کے مر جاتا ہے اور کبھی دشمن سے ہار کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

۴ : ہاتھی

لکھنؤ میں ہاتھیوں کی لڑائی بہت پسند کی جاتی تھی اور نہایت ہی دل چسپ سمجھی جاتی۔ اور یہ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ڈیڑھ سو لڑائی کے ہاتھی تھے، جن کو سواری سے تعلق نہ تھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مست ہو گئے ہوں۔ اس لیے کہ ہاتھی جب تک مست نہ ہوں نہیں لڑتے۔ اور لڑیں بھی تو اُن میں فتح یابی اور حریف پر غالب آنے کا سچا جوش اور غصہ نہیں ہوتا۔

لڑائی کے وقت اُن کی گردن سے دُم تک ایک رسا بندھا ہوتا ہے۔ حریف کا سامنا ہوتے ہی دونوں حریف سونڈیں اور دُمیں اٹھا کے زور سے چنگھاڑتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہیں، اور بڑی زبردست ٹکر ہوتی ہے۔ اس کے بعد

برابر بھنّدوں پر ٹکریں ہوتی رہتی ہیں جن کی آواز بڑی دور تک جاتی ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے مُنہ ملا کے اور دانتوں کو اڑا کے ایک دوسرے کو ریلنا اور ڈھکیلنا شروع کرتے ہیں، جس میں اُن کے جسم کے پیچ و تاب کھانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسا زور لگا رہے ہیں۔ فیل بان، آنکس مار مار کے زور لگانے پر انھیں اور زیادہ اُبھارتے رہتے ہیں۔ آخر دونوں میں سے ایک ہاتھی کم زور پڑتا اور ریلے کی تاب نہ لا کے زمین پر گرتا ہے۔ غالب ہاتھی اُس وقت اکثر دانت سے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالتا اور کام تمام کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر ہاتھیوں کا معمول ہے کہ کم زور پڑتے ہی دانت چھڑا کے بھاگتے ہیں اور غالب آنے والا تعاقب کرتا ہے۔ پا گیا تو ٹکریں مار کے گراتا اور اکثر دانتوں سے پیٹ پھاڑ کے مار ڈالتا ہے۔ اور اگر وہ نکل گیا تو جان بچ جاتی ہے۔

لکھنؤ میں ہاتھیوں سے اکثر گینڈے بھی لڑائے جاتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں جانور باہم لڑتے ہی نہ تھے اور اگر کبھی لڑ گئے تو بے شک سخت لڑائی ہوتی۔ اگر کبھی ہاتھی نے گینڈے کو ڈھکیل کے اُلٹ دیا تو اُس کے دانت پیٹ میں پیوست ہو کے اس کا کام تمام کر دیتے۔ اور اگر گینڈے نے موقع پا کے اپنا بالائی سینگ ہاتھی کے پیٹ میں اتار دیا تو کھال دور تک پھٹ جاتی۔ مگر ہاتھی سونڈ کی مدد سے گینڈے کے سینگ کو اپنے جسم میں زیادہ دور تک نہ گھسنے دیتا اور کاری زخم سے بچ جاتا۔

۵: اونٹ

یوں تو دنیا میں ہر ذی روح لڑ سکتا ہے، لیکن اونٹ سے زیادہ غیر موزوں لڑائی کے لیے کوئی جانور نہیں ہو سکتا۔ مگر لکھنؤ میں اونٹ بھی مست اور پُرجوش

بنا کے لڑائے جاتے۔ اونٹ کی پکڑ مشہور ہے، اور اس کا بے طریقے گرنا اُس کے حق میں نہایت ہی خطرناک ہے۔ اونٹوں کا جوش، کف نکالنے اور جھاگ اُڑانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کف اڑاتے ہوئے دوڑتے ہیں اور گالیاں دینے اور ایک دوسرے کے مُنہ پر تھوکنے یعنی بلبلانے اور جھاگ اڑانے سے لڑائی شروع ہوتی ہے۔ جسے موقع مل گیا، حریف کا لٹکتا ہوا ہونٹھ دانتوں سے پکڑ لیتا ہے اور کھینچنا شروع کرتا ہے۔ جس اونٹ کا ہونٹھ حریف کے دانتوں میں آگیا، وہ اکثر گر پڑتا ہے اور ہارتا ہے، اور اسی پر لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔

۶: گینڈا

گینڈے سے زیادہ مضبوط جانور کوئی نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ قدوقامت میں شیر اور ہاتھی سے چھوٹا ہے مگر ایسا روئیں تن پیدا کیا گیا ہے کہ نہ اس پر ہاتھی کے دانت کارگر ہوتے ہیں، نہ شیر کے پنجے اور ناخن۔ صرف پیٹ کی کھال نرم ہوتی ہے۔ اگر کوئی جانور اس پر حربہ کر سکا تو مار لیتا ہے، ورنہ ہر جانور اپنا زور صرف کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور آخر میں گینڈا اپنا بانسے پر کا زبردست سینگ اُس کے پیٹ میں بھونک کے مار ڈالتا ہے۔

لکھنؤ میں گینڈے، ہاتھیوں سے، شیروں سے، تیندووں سے اور خود گینڈوں سے لڑائے جاتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں لڑانے کے علاوہ بعض گینڈے اس خوبی سے سدھائے گئے تھے کہ گاڑی میں جوتے جاتے اور ہاتھی کی طرح اُن کی پیٹھ پر ہودا کس کے سواری لی جاتی۔ گینڈا بالطبع لڑنے والا جانور نہیں ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے، لڑائی کو طرح دیتا ہے۔ لیکن ہاں اگر اسے چھیڑا جائے تو مقابلے کے لیے تیار ہو کے نہایت ہی موذی بن جاتا ہے۔ نصیرالدین حیدر کے زمانے میں لڑائی

کے پندرہ بیس گینڈے موجود تھے جو چاند گنج میں رہا کرتے۔ جب سوار انھیں رگید کے ایک دوسرے کے مقابل کر دیتے تو وہ سر جھکا کے ایک دوسرے کی طرف دوڑتے اور ٹکریں ہونے لگتیں۔ دونوں کی یہ کوشش ہوتی کہ حریف کے پیٹ کو اپنے سینگ سے پھاڑ ڈالیں۔ اور اسی کوشش میں وہ دیر تک ایک دوسرے کو ریلتے پیلتے اور ڈھکیلتے رہتے۔ بڑے زور زور سے غراتے، سینگ کو سینگ سے ٹکراتے اور آخر میں لڑتے لڑتے سر جوڑ کے گتھ جاتے اور حریف کو ڈھکیلتے رہتے۔ یہاں تک کہ جو حریف کم زور پڑتا ہے، وہ آہستہ آہستہ ہٹنے اور جگہ چھوڑنے لگتا ہے۔ اور اس پر بھی جان نہیں چھوٹتی تو بھاگتا ہے۔ مگر غالب رگید رگید کے مارتا ہے۔ کم زور، اپنا سینگ الگ کر کے مقابلے سے منہ موڑتا اور بڑے زور سے بھاگتا ہے۔ اگر محصور میدان ہوا تو غالب حریف بھاگتے میں اس پر حملہ کر کر کے اسے گراتا اور پیٹ میں سینگ بھونک کے کام تمام کر دیتا ہے اور اگر وسیع کھلا میدان ہوا اور شکست خوردہ گینڈا بھاگ سکا تو بھاگ کے اپنی جان بچا لیتا ہے اس وقت سوار رگید رگید کے اور گرم سلاخوں سے مار مار کے غالب کو مغلوب کے تعاقب سے روکتے اور ہٹائے جاتے ہیں۔ گینڈوں کی لڑائی کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ سر جھکائے اور اپنے پیٹ کو بچائے رہیں۔ اگر دھوکے میں بھی کسی کا سر اٹھ گیا تو مقابل حریف اپنا کام کر گزرتا ہے۔ چنانچہ ایک گینڈا غالب آگیا اور اس کا حریف بھاگنے لگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کے غالب نے سر اونچا کر دیا اور ساتھ ہی اسی شکست خوردہ گینڈے نے بجلی کی طرح دوڑ کے اس کے پیٹ میں سر ڈال دیا اور پیٹ پھاڑ ڈالا۔

۷: بارہ سنگھا

یہ چھوٹا نازک اور خوب صورت جانور ہے اور شاید لکھنؤ کے سوا اور کسی جگہ

یہ تفننِ طبع کے طور پر نہ لڑایا گیا ہوگا۔ مگر اس کی لڑائی بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔ ہرن، شعرا کے معشوق کا ہم شکل ہے، اِس لیے اس کی لڑائی میں بھی معشوقانہ ادائیں ظاہر ہوتی ہیں۔ مقابلے کے وقت پہلے بڑی خوب صورتی کے ساتھ دونوں حریف پینترے بدلتے رہتے ہیں اور آخر ٹکریں ہونے لگتی ہیں جن میں سینگوں سے وہ تلوار کا بھی کام لیتے ہیں اور سپر کا بھی۔ آخر دیر تک کی ٹکروں کے بعد دونوں کے سینگ آپس میں اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قفلی پڑ گئی۔ اب ایک دوسرے کو ریلتے اور ڈھکیلتے رہتے ہیں۔ اسی ریلا پیلی میں ایک کم زور پڑ جاتا ہے اور اُس پر مغلوبی کی ایسی ہیبت طاری ہو جاتی ہے کہ نازک پانو تھرتھرانے لگتے ہیں اور سارے تن بدن میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔ مگر حریف ترس کھانے کے عوض زور میں آکے اور ڈھکیلتا ہوا میدان کے خاتمے یعنی ٹھاٹھر تک پہنچا دیتا ہے، اب مغلوب کو بالکل نا امیدی ہوتی ہے، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اور سینگوں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور وہ سینگ چھڑا کے لڑائی سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔ اُس وقت حریف سینگوں سے اس کے جسم کو زخمی کرنا شروع کرتا ہے اور مغلوب بارہ سنگھا زور سے بھاگتا ہے، جس پھرتی سے وہ بھاگتا ہے اُسی تیزی سے غالب حریف اس کا تعاقب کرتا ہے۔ یہ دوڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ دونوں ہوا سے باتیں کرنے لگتے ہیں اور ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی ہے مگر بے رحم دشمن مغلوب کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جہاں پاتا ہے، زخمی کرتا ہے۔ آخر زخموں سے چور کرتے کرتے مار ڈالتا ہے اور مرنے کے بعد اس کی لاش کو اپنے سینگوں سے جھنجھوڑ کے ہٹتا اور اپنی فتح پر نازاں ہوتا ہے۔[۵]

عہ۵ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے بتایا اور ہمیں بھی بعد کو تاریخوں میں نظر آیا کہ درندے اور ہاتھی دہلی میں بھی لڑائے جاتے تھے۔

۸: مینڈھا

یہ نہایت ہی غریب اور بے آزار جانور ہے مگر اس کی ٹکر بڑی زبردست ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو پہاڑ لڑ گئے۔ چنانچہ انھیں ٹکروں کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ انھیں لڑاتے ہیں اور آج ہی نہیں قدیم الایام سے ان کی لڑائی دیکھی جاتی رہی۔ ان کے لڑانے کا آغاز ہندوستان میں بلوچی لوگوں سے ہوا اور انھیں سے دوسرے مقاموں میں شوق پیدا ہوا۔ مگر لڑائی کے لیے ان کے پالنے اور تیار کرنے کا کام اکثر قصائیوں اور ادنا طبقے کے لوگوں سے متعلق رہا۔ امرا اور شرفا انھیں سامنے بلوا کے لڑائی کا تماشا دیکھ لیا کرتے تھے۔ سنا جاتا ہے کہ نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کو مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے سامنے بھی اکثر مینڈھے لڑائے گئے۔ واجد علی شاہ کو کلکتے کے قیام میں بھی کسی حد تک شوق تھا۔ منشی السلطان بہادر ان کی دل چسپی کے لیے اکثر قصائیوں کے زیر اہتمام بہت سی جوڑیں تیار رکھتے تھے۔ اور میں نے کئی بار دیکھا کہ کسی زبردست مینڈھے کی ایسی ٹکر پڑی کہ دوسرے حریف کا سر پھٹ گیا۔ مینڈھا جب ہارتا ہے اور مقابل حریف کی ٹکر کی تاب نہیں لاسکتا تو اس کی ٹکر خالی دے کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار بادشاہ کا رمنا دیکھنے کے لیے مقررہ سالانہ تاریخ کو کلکتے کے صدہا انگریز جمع تھے۔ بادشاہ سلامت اپنی وضع کے خلاف، بوچے پر سوار نکل آئے اور ان مہمانوں کے خوش کرنے کے لیے حکم دیا کہ مینڈھے لا کے لڑائے جائیں۔ چنانچہ ان کی ٹکروں کا ہنگامہ بلند ہوا اور اس سے زیادہ شور یورپین لوگوں نے "ہرّے" اور خوشی کے نعرے بلند کر کے مچایا اور عجیب جوش و خروش کا عالم نظر آتا تھا۔ لکھنؤ میں انتزاع سلطنت کے بعد بھی نواب محسن الدولہ بہادر کو مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اب شرفا

اور امراسے یہ مشغلہ چھوٹ گیا ہے ادنا لوگوں میں معمولی حد تک باقی ہے۔

(۱۹)

درندوں کی لڑائی لکھنؤ میں صرف سلطنت اور امرائے دربار تک محدود تھی۔ اس لیے کہ اُن کی داشت، تیاری، لڑائی کے وقت ان کو سنبھالنا اور تماشائیوں کو اُن کی مضرت سے بچانا، ایسی چیزیں ہیں جو غُربا درکنار، بڑے بڑے امیروں کے امکان سے بھی باہر ہیں۔ اور اسی لیے درندوں کی لڑائی سوادِ لکھنؤ میں اسی وقت تک دیکھی گئی جب تک اگلا دربار قائم تھا۔ اُدھر وہ دربار برخاست ہوا اور اِدھر وہ وحشت ناک دنگل بھی اجڑ گئے۔

لیکن طیور کی لڑائی ایسی نہ تھی۔ اس کا شوق ہر امیر و غریب کر سکتا تھا اور ہر شوقین محنت کر کے لڑائی کے قابل مرغ یا بٹیر تیار کر سکتا تھا۔ جو طیور لکھنؤ میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ لڑائے گئے حسبِ ذیل ہیں (۱) مرغ (۲) بٹیر (۳) تیتر (۴) لوے (۵) گُل دُم (۶) لال (۷) کبوتر (۸) توتے۔ ان میں سے ہر ایک کھیل کے جُدا جُدا بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

لکھنؤ کی کبوتر بازی اور بٹیر بازی عام طور پر مشہور ہے، جس پر آج کل کے تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دل دادہ اکثر تمسخر کیا کرتے ہیں۔ وہ اِس سے واقف نہیں کہ اِن شوقوں اور کھیلوں میں سے ہر ایک کو اُن لوگوں نے کس درجۂ کمال پر پہنچا کے، ایک مستقل فن بنا دیا تھا۔ لیکن جب وہ یورپ میں جا کے وہاں بھی اِسی قسم کے لغو شوق دیکھیں گے تو کم از کم انھیں اپنے اِن الفاظ پر ندامت ضرور ہو گی جو اپنے وطن کے اُن شوقینوں کی نسبت اکثر بے ساختہ کہہ بیٹھتے ہیں۔

۱: مرغ بازی

لڑنے اگرچہ ہر قسم اور ہر قوم کے مرغ ہیں، مگر لڑائی کے لیے مخصوص اصیل مرغ ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ دنیا میں اصیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہیں ہے۔ مرغ کی سی بہادری درحقیقت شیر میں بھی نہیں ہے۔ وہ مر جاتا ہے، مگر لڑائی سے منہ نہیں موڑتا۔ اصیل مرغ کی نسبت یہاں کے محققین کا خیال ہے کہ ان کی نسل عرب سے لائی گئی ہے، اور یہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فی زمانتا اصیل کی جس قدر زیادہ اور اعلا نسلیں حیدر آباد دکن میں موجود ہیں، کہیں نہیں ہیں۔ اور ہندوستان میں وہی ایک شہر ہے جہاں اہلِ عرب سب جگہوں سے زیادہ آباد اور مقیم ہیں۔ بلندیِ ہند میں مرغوں کی نسلیں ایران ہوتی ہوئی آئیں۔ لکھنؤ کے نامی مرغ بازوں میں سے ایک صاحب کا بیان تھا کہ بازی میں اُن کا مرغ اتفاقاً ہار گیا تھا، دل شکستہ ہو کے وہ ارضِ عراق میں چلے گئے۔ نجفِ اشرف میں کئی مہینے تک مصروفِ عبادت رہے اور شب و روز دعا کرتے کہ خداوندا! اپنے ائمۂ معصومین کا صدقہ، مجھے ایسا مرغ دلوا جو لڑائی میں کسی سے نہ ہارے۔ ایک رات کو خواب میں بشارت ہوئی کہ "جنگل میں جاؤ"۔ صبح آنکھ کھلتے ہی انھوں نے کوہ و بیاباں کا راستہ لیا اور ایک مرغی ساتھ لیتے گئے۔ یکایک ایک درۂ کوہ سے ککڑوں کوں کی آواز آئی۔ انھوں نے فوراً قریب جا کے مرغی چھوڑی، جس کی آواز سنتے ہی مرغ نکل آیا۔ اور یہ فوراً کسی حکمت سے اسے پکڑ لائے۔ اُس کی نسل ایسی تھی کہ پھر کبھی بازی میں انھیں شرمندہ نہ ہونا پڑا۔

مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک

برابر رہا۔ نوّاب آصف الدّولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نوّاب سعادت علی خاں باوجود بیدار مغزی کے، مرغ بازی کے دل دادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امراے دربار درکنار، اُس زمانے میں جو اہلِ یورپ یہاں موجود تھے انھیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا چناں چہ جنرل مارٹن، جن کی کوٹھی لکھنؤ کی ایک قابلِ دید عمارت اور یوروپین بچّوں کی درس گاہ ہے، اوّل درجے کے مرغ باز تھے، اور نوّاب سعادت علی خاں اُن سے بازی بد کے مرغ لڑایا کرتے۔

لکھنؤ میں مرغوں کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ مرغ کے کانٹے باندھ دیے جاتے تاکہ اُن سے ضرر نہ پہنچا سکے۔ چونچ چاقو سے چھیل کے تیز اور نکیلی کی جاتی اور جوڑ کے دونوں مرغ پالی میں چھوڑ دیے جاتے۔ مرغ باز اُن کے پیچھے پیچھے رہتے۔ مرغ کو دوسرے مرغ کے مقابلے میں چھوڑنا بھی ایک فن تھا جس میں یہ کوشش رہتی کہ ہمارا ہی مرغ پہلے چوٹ کرنے کا موقع پائے۔ اب دونوں مرغ چونچوں اور لاتوں سے لڑنا شروع کرتے۔ مرغ باز اپنے اپنے مرغ کو ابھارتے اور اشتعال دیتے اور چلّا چلّا کے کہتے: "ہاں بیٹا! شاباش ہے!" "ہاں بیٹا، کاٹ!" "پھر یہیں پر!" مرغ اُن کی للکاروں اور بڑھاووں پر اس طرح بڑھ بڑھ کے لاتیں اور چونچیں مارتے کہ معلوم ہوتا جیسے سمجھتے اور اُن کے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ جب لڑتے لڑتے زخمی اور چور ہو جاتے، تو باتفاقِ فریقین تھوڑی دیر کے لیے اُٹھا لیے جاتے۔ یہ اٹھا لینا، مرغ بازی کی اصطلاح میں "پانی" کہلاتا ہے۔ اُس وقت مرغ باز اُن کے زخمی سروں کو پونچھتے، اُن پر پانی کی پھُہاریں دیتے، زخموں کو اپنے منہ سے چوستے اور ایسی ایسی تدبیریں کرتے کہ چند منٹ کے اندر مرغوں میں پھر نیا جوش پیدا ہو جاتا اور تازہ دم ہو کے دوبارہ پالی میں چھوڑ دیے جاتے۔ اسی طرح برابر "پانی" ہوتے رہتے۔ اور لڑائی کا خاتمہ چار پانچ روز بعد اور کبھی آٹھ نو روز بعد ہوتا۔ جب ایک مرغ اندھا ہو جاتا یا ایسی چوٹ کھا جاتا کہ اُٹھنے کے قابل نہ رہے،

یا اور کسی وجہ سے لڑنے کے قابل نہ رہتا، تو سمجھا جاتا کہ وہ ہار گیا۔ بار ہا یہ ہوتا کہ مرغ کی چونچ ٹوٹ جاتی۔ اِس صورت میں بھی جہاں تک بنتا، مرغ باز چونچ باندھ کے لڑاتے۔

حیدر آباد کا کھیل یہاں کے خلاف بہت سخت ہے۔ وہاں کانٹے نہیں باندھے جاتے۔ بلکہ بہ عوض باندھنے کے، چاقو سے چھیل کے برچھی کی اَنی بنا دیے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑائی کا فیصلہ گھنٹا ہی ڈیڑھ گھنٹے میں ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ میں خاروں کے باندھنے کا طریقہ غالباً اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ لڑائی طول کھینچے اور زیادہ زمانے تک لطف اٹھایا جا سکے۔

لڑائی کے لیے مرغوں کی تیاری میں مرغ باز کے کمالات، غذا اور داشت کے علاوہ اعضا کی مالش، پھوئی یعنی پانی کی پُھہار دینے، چونچ اور خار بنانے یا خار کے باندھنے اور کوفت کے مٹانے میں نظر آتے ہیں۔ اِس اندیشے سے کہ زمین پر دانہ چگنے میں چونچ کو نقصان نہ پہنچ جائے، اکثر انھیں دانہ ہاتھ پر کھلایا جاتا ہے۔

یہ شوق واجد علی شاہ کے زمانے تک زوروں پر تھا۔ مٹیا برج میں نوّاب علی نقی خاں کی کوٹھی میں مرغوں کی پالی ہوتی تھی اور کلکتے سے بعض انگریز اپنے مرغ لڑانے کو لایا کرتے تھے۔ بادشاہوں کے علاوہ اور بہت سے رئیسو کو بھی مرغ بازی کا شوق تھا۔ مرزا حیدر، بہو بیگم صاحبہ کے بھائی نوّاب سالار جنگ حیدر بیگ خاں، میجر سوارس، جو نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تھے، اور خود بادشاہ سے مرغ لڑاتے تھے۔ آغا برہان الدین حیدر بھی مرغ بازی کے شائق تھے۔ آخر الذکر رئیس کے وہاں آخر زمانے تک دو ڈھائی سو مرغ رہتے۔ نہایت ہی صفائی اور نفاست سے رکھے جاتے۔ دس بارہ آدمی ان کی داشت

پر مامور تھے۔ میاں داراب علی خاں کو بڑا شوق تھا۔ نواب گھسیٹا نے بھی اس شوق کو آخر تک نباہا۔ ملیح آباد کے معزز پٹھانوں کو بھی بہت شوق تھا اور ان کے پاس اصیل مرغوں کی بہت اچھی نسلیں محفوظ تھیں۔ یہاں مشہور مرغ باز جو اپنے فن میں استادِ یگانہ مانے جاتے، بہت سے تھے: میر امداد علی، شیخ گھسیٹا، منوّر علی، جن کو یہ کمال حاصل تھا کہ مرغ کی آواز سن کے بتا دیتے کہ یہ بازی لے جائے گا۔ صفدر علی۔ اور ایک اوّل درجے کے وثیقے دار سید میرن صاحب بھی مشہور تھے۔ اس آخری زمانے میں مندرجۂ ذیل لوگوں کا نام مشہور ہوا: فضل علی جمعدار۔ قادر جیون خاں حسین علی۔ نوروز علی۔ نواب محمد تقی خاں، جو یہاں کے ایک عالی مرتبہ رئیس تھے۔ میاں جان۔ دل چھنگا حسین علی بیگ۔ احمد حسین۔ ان میں سے اب کوئی زندہ موجود نہیں ہے۔

یہی لوگ ہیں جنھوں نے مرغ بازی کو یہاں انتہائی کمال کے درجے پر پہنچا کے دکھا دیا، مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال مرغ بازی کا شوق حیدر آباد دکن میں بڑھا ہوا ہے۔ وہاں کے بہت سے امیروں، جاگیرداروں اور منصب داروں کو شوق ہے، اور ان کے پاس مرغوں کی نسلیں بھی بے مثل ہیں، جن کی وہ بہت حفاظت کرتے ہیں۔

۲: بٹیر بازی

بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔ پنجاب کے بعض کنجن لوگ، جن کی عورتیں عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہیں، نواب سعادت علی خاں کے عہد میں واردِ لکھنؤ ہوئے اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے، جن کو وہ لڑاتے تھے۔ آج کل کی بعض نامور رنڈیاں انھی لوگوں کی نسل سے ہیں۔ بٹیروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک گھاگس اور دوسری چنگ۔ پنجاب میں صرف گھاگس بٹیر ہوتا ہے۔

وہ چِنگ سے بڑا زبردست اور طاقت ور ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں گھاگس اور چِنگ دونوں ہوتے ہیں۔ چِنگ، گھاگس سے قد میں چھوٹا اور نازک ہوتا ہے، مگر لڑنے میں زیادہ مضبوط اور بہت جیالا ہوا کرتا ہے اور اس کی لڑائی زیادہ شان دار اور خوب صورت ہوتی ہے۔ بہ ہر حال، اس بات کا پتا لکھنؤ ہی میں لگا کر لڑانے کے لیے چِنگ بٹیر زیادہ موزوں ہے۔

بٹیر کی لڑائی کے لیے نہ کسی بڑے میدان کی ضرورت تھی نہ گھر سے باہر نکل کے صحن تک بھی آنے کی۔ بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر تہذیب کے ساتھ بیٹھ کے اس کی لڑائی کی سیر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے لکھنؤ کی سوسائٹی نے اسی کو بہت پسند کیا۔ نہایت نفیس، خوب صورت اور سبک کابکیں بٹیروں کے لیے ایجاد کی گئیں جو ہاتھی دانت کی ننھی ننھی کڑیوں سے آراستہ کی جاتیں اور اُن میں بٹیر رکھے جاتے۔

اِس کا کھیل یوں ہے کہ پہلے موٹھ یعنی پانی میں بھگو بھگو کے گھنٹوں ہاتھوں میں دبائے رہنے سے اُس کی وحشت دُور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بولنے اور چونچیں مارنے لگتا ہے۔ اس کے بعد بھوک دے کے اور دشت آور اجزا جن میں مصری بہت مخصوص ہے، دے دے کے اُس کا جسم درست کیا جاتا ہے۔ پھر رات گئے یا آدھی رات کو اُن کے کان میں چِلّا کے "کو" کہا جاتا ہے، جسے کوکنا کہتے ہیں۔ غرض اِن تدبیروں سے چربی چھنٹ جاتی ہے، بھدا پن دور ہو جاتا ہے اور جسم نہایت ہی پُھرتیلا اور قوی ہو جاتا ہے۔ یہی بٹیر کی تیاری ہے۔ اور اِن باتوں میں جس قدر زیادہ پورا ہے، اُسی قدر سمجھیے کہ لڑائی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

لڑائی کے وقت فرش پر چاروں طرف ہلکا ہلکا دانہ چھڑکا دیا جاتا ہے اور بٹیر کابک سے نکالے جاتے ہیں۔ پہلے دونوں بٹیروں کی چونچیں چاقو سے بنا کے خوب

تیز کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ بٹیر کی لڑائی مرغ سے ملتی ہوئی ہے۔ چونچ سے کاٹتا اور پنجوں سے لات مارتا ہے۔ چونچ سے حریف کے منہ کو زخمی اور لہو لہان کر دیتا ہے اور پنجوں سے بعض وقت حریف کا پوٹا تک پھاڑ دیتا ہے۔ لڑائی پندرہ بیس منٹ یا کبھی اس سے زیادہ دیر تک رہتی ہے، اور آخر مغلوب حریف بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اور بھاگنے کے بعد پھر وہ کسی بٹیر کے سامنے لڑائی میں نہیں ٹھہرتا۔

بٹیر کی ترقی کے تین درجے ہیں اور اُس کی نام وری کے تین دَور سمجھے جاتے ہیں: اوّل نیا، جو پکڑ کے اور پہلے پہل مانوس کر کے لڑایا جاتا ہے۔ اگر وہ بہت سی لڑائیوں میں جیتا اور نہ بھاگا، تو لڑائی کی فصل ختم ہوتے ہی معمولی پنجروں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ پُرانے پر جھاڑ کے نئے نکال لاتا ہے۔ اسے "کریز بٹھانا" کہتے ہیں۔ یہ زمانہ ختم ہوتے ہی، دوسرے سال اِس کی ترقی کا دوسرا درجہ اور دَور ہوتا ہے، اور اسے "نوکار" کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ کریز بیٹھ کے جب تیسرے سال وہ لڑائی کے لیے تیار کیا جاتا ہے، تو کریز کہلاتا ہے اور یہ اس کی ترقی کا تیسرا دور، اعلا درجہ ہے۔

عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑائی میں نوکار، نئے سے اور کریز، نوکار سے زبردست ہوتا ہے۔ نیا بٹیر، کریز سے دو چونچیں بھی مشکل سے لڑ سکتا ہے۔ اعلا درجے کے بٹیر باز اور شوقین رئیس صرف کریزوں کو لڑاتے ہیں۔ اور نئے بٹیروں کا لڑانا بالکل معمولی کھیل ہے۔ لڑائی میں طرح طرح کے فریب و فن بھی کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے بٹیر کے منہ پر کبھی کوئی ایسی گرد دی اور زہریلی چیز یا عطر لگا دیتے ہیں کہ دوسرا بٹیر دو ایک چونچیں مارتے ہی پیچھے ہٹنے اور لڑائی سے منہ موڑنے لگتا ہے۔ اور اگر اس پر بھی لڑتا رہا تو لڑائی کے بعد مر جاتا ہے۔ بعض لوگ کیف کا کھیل کھیلتے ہیں یعنی لڑائی سے ایک

ساعت پہلے اپنے بٹیر کو کوئی ایسی تیز نشے والی چیز کھلا دیتے ہیں کہ وہ لڑائی میں بے حس ہو کے بھاگنا بھول جاتا ہے۔ اور جب تک حریف کو پالی سے نہ بھگا دے، مجنونوں کی طرح لڑتا رہتا ہے۔

لکھنؤ میں بٹیر بازی کے شوق نے ایسے باکمال بٹیر باز پیدا کر دیے جن کا کہیں نظیر نہیں مل سکتا۔ بعض لوگوں نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کسی کے اچھے نامی بٹیر کو ایک نظر دیکھا، اور کسی معمولی بٹیر کی ویسی ہی صورت بنا دی اور کسی موقع پر باتوں باتوں میں بدل لیا۔ خیر، یہ تو ایک بے ہودہ چوری تھی، مگر بعض استادوں نے یہ کمال حاصل کیا کہ بھگنے بٹیروں کو تیار کر کے، اچھے اچھے کریزوں سے لڑا دیتے اور بازی لے جاتے۔ کیف کے کھیل والے استادوں میں ایک صاحب کیفت کی نہایت اعلا درجے کی گولیاں تیار کرتے، جو سو روپے کی دس گولیاں بکتیں اور لوگ شوق سے لے جاتے۔

اُن لوگوں کی سب سے بڑی اُستادی، بٹیروں کے علاج میں نظر آتی ہے۔ اور ایسے ایسے بیمار اور از کار رفتہ بٹیروں کو درست کر لیتے ہیں اور اِس خوبی سے اُن کے مرض کی تشخیص کرتے اور مناسب اجزا استعمال کراتے ہیں، کہ اطبّا اور ڈاکٹر حیرت میں رہ جائیں۔ اس کی بہت کوشش کی گئی کہ بٹیروں کو یہاں کے، انڈے سے بچے دلوائے جائیں، مگر اس میں کام یابی نہ ہوئی۔

بٹیروں کے نام بھی بڑے بڑے شان دار رکھے گئے، جیسے رستم، سہراب، شہرۂ آفاق۔ پالیوں میں بڑی سے بڑی بازیاں ہاری جاتی ہیں، اور ایک ہزار روپے تک کی بازی میں نے خود دیکھی ہے۔ اِس کا شوق بھی بعض بادشاہوں کو رہا۔ نصیر الدین حیدر اپنے سامنے میز پر بٹیروں کی لڑائی دیکھ کے خوش ہوتے تھے۔

پُرانے بٹیر بازوں میں میر نجّو، میر عمد و، خواجہ حسن، میر فدا علی، چھنگا، میر عابد، اور سیّد میرن کے نام یادگار ہیں۔ آج سے چالیس سال پہلے مٹیا برج میں میں نے دار وغہ غلام عباس، چھوٹے خاں، اور غلام محمد خاں خالص پوری کو جو بڑے معمّر اور سن رسیدہ

لوگ تھے، اس فن میں نہایت باکمال پایا تھا۔ غالب علی بیگ، مرزا اسد علی بیگ، نواب مرزا، میاں (ں) جان، شیخ مومن علی، اور غازی الدین خان نے بھی آخر عہد میں بہت نام وری حاصل کی تھی۔

بٹیروں کا شکار بھی لکھنؤ والوں کے لیے بڑی دل چسپی کی چیز ہے۔ پہلے اس میں صرف شوقینی تھی جس کی بدولت بہت سے عین آدمی جنھوں نے کبھی شہر سے باہر کی سواد نہیں دیکھی تھی، کھیتوں اور جنگلوں کی ہوا کھاتے تھے، مگر اب اسی پر بہتوں کی روٹیاں چلتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ بٹیر پہاڑوں سے رات کو نکلتے اور اوپر کی فضا میں اڑتے ہوئے جاتے ہیں۔ شکار کے شوقین، بڑی آواز سے بولتے والے بٹیروں کو تیار کرتے ہیں جو برابر رات بھر بولتے رہتے ہیں۔ ایسے بٹیروں کو پھندیت کہتے ہیں۔ کسی ارہر کے کھیت کے اطراف میں اکثر جال پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھندیتوں کی آواز سن کے بٹیر اوپر سے اترنا اور گرنا شروع ہوتے ہیں اور رات بھر میں بہت سے جمع ہو جاتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی وہ سب طرف سے ہنکا کے جال کی طرف بھگائے جاتے ہیں، جس میں پھنستے ہی پکڑ پکڑ کے پٹکیوں میں بند کر لیے جاتے ہیں۔

۳: تیتروں کی لڑائی

یہ بھی دل چسپ ہے۔ تیتر، اور طیور کی بہ نسبت اُچک اُچک کے لڑتا ہے۔ مگر اس کا شوق سواد دیہاتی لوگوں اور ادنا درجے والوں کے، امرا و شرفا کو کبھی نہیں رہا۔ تیتر، لوٹ سے اور دوڑا دوڑا کے تیار کیے جاتے ہیں۔ اُن میں جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لیے اُن کو دیمک کھلائی جاتی ہے۔ مگر یہ کوئی بڑا کھیل نہیں ہے اور نہ مہذب سوسائٹی میں اختیار کیا گیا۔ ہاں لکھنؤ کے ادنا طبقے والوں میں کثرت سے رہا اور ہے۔

۴: لووں کی لڑائی

لوا، چھوٹے قسم کا بٹیر ہے جو بٹیر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ بہ جائے دانے کے اسد

یعنی مادہ پر لڑا کرتا ہے۔ اسے لڑانا ہوتا ہے تو مادہ کا پنجرا لا کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا شوق ریاستِ ریواں وغیرہ میں لوگوں کو زیادہ تھا۔ لکھنؤ میں بھی پسند کیا گیا اور ایک حد تک اختیار کیا گیا۔ لوے کی لڑائی، سچ یہ ہے کہ بٹیر سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔ وہ کندے کھول کے لڑتا اور گتھ جاتا ہے اور پھول کی طرح کھِل کھِل کے اٹھتا اور گرتا ہے۔ لکھنؤ کے بعض اُمرا کو اس کا شوق ہوگیا تھا۔ مٹیا برج میں واجد علی شاہ مرحوم کی سرکار میں ایک بڑے استاد، لوے لڑانے والے تھے، جنھوں نے بہت اچھی اچھی جوڑیں تیار کی تھیں۔ اور جب انھیں سامنے لا کے لڑاتے تو بڑا لطف آتا۔ لووں کی تیاری بھی زیادہ تر لوٹ اور بھوک سے ہوتی ہے۔ اور اس کی لڑائی کا رواج بٹیر کے پیشتر سے تھا۔ مگر آخر میں بٹیر بازی کا اس قدر رواج ہوا کہ لوے کا شوق پھیکا پڑ گیا۔ اس کا شکار بھی عجب طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی بٹیر کی طرح اوپر کی فضا میں اُڑتا ہوا جاتا ہے۔ لوگ بٹیر کے پھندے بتوں کی سی چھپر پر ایک گھڑا باندھ دیتے ہیں، اس کے منھ پر جھلی منڈھ کے ایک سینک میں ڈورا باندھ کے اُس سینک کو جھلی میں چبھو کے، اندر اٹکا دیتے ہیں اور اُس ڈورے کو ہاتھ سے سوتنا شروع کرتے ہیں۔ جھلی سے ایک بے ہنگم بھوں بھوں کی آواز نکلنا شروع ہوتی ہے، جو لووں کو اس قدر پسند ہے کہ اُڑتے اُڑتے نیچے اُتر پڑتے ہیں اور صبح کو جال میں پھنس کے بٹیروں کی طرح پکڑ لیے جاتے ہیں۔

۵: گل دُم

گل دُم کو عوام بلبل کہتے ہیں، مگر یہ غلطی ہے۔ بلبل، بدخشان و عجم کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔ اور اس چڑیا کی دُم کے نیچے ایک سُرخ گل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُس کا نام گل دُم رکھا گیا ہے۔ اس کی لڑائی بھی دیہاتیوں اور بازاری لوگوں میں زیادہ ہے، شائستہ سوسائٹی نے اسے کبھی دل چسپی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مگر اس کی لڑائی لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ دانے پر لڑتے ہیں اور لڑائی میں دونوں حریف گرتے ہوئے اوپر اُڑتے اور گتھ کے گرتے ہیں۔

۶ : لال لڑانا

لال صرف پنجروں میں رکھ کے پالنے کے لیے ہیں، لڑائی کے لیے موزوں نہیں مگر نفس پرست انسان نے انھیں بھی لڑا کے، دو گھڑی دل بہلا لیا۔ لالوں کا پہلے تو اس حد تک مانوس بنانا مشکل ہوتا ہے کہ پنجرے کے باہر نکال کے چھوڑے جائیں اور اُڑ نہ جائیں ۔ دوسرے انھیں اس قدر مست بھی ہونا چاہیے کہ دوسرے لال سے لڑنے کو تیار ہو جائیں ۔ چناں چہ اُن کا لڑ جانا ہی دشوار ہوتا ہے ۔ مگر جب لڑ گئے تو خوب گتھم گتھا ہو کے اور دانڑ آڑ کے لڑتے ہیں اور بڑی دیر تک لڑتے رہتے ہیں ۔ لالوں کی لڑائی دوسرے چھوٹے طیور کی لڑائی کی نسبت دیر تک رہتی ہے ۔ لالوں کی لڑائی کا شوق اہلِ لکھنؤ میں بہت کم رہا، صرف دو ہی ایک استاد پیدا ہوئے جنھوں نے لڑایا ، ورنہ عام رجحان اس کے خلاف تھا اور اس کے شوقین بھی عوام اور بازاری ہی تھے ۔

۷ : کبوتر بازی

کبوتر اُن مانوس جانوروں میں ہیں جن کا شوق لوگوں کو قدیم زمانے سے لے کے آج تک ہر ملک اور ہر سرزمین میں کسی نہ کسی حد تک ضرور رہا۔
کبوتروں کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں اُڑنے والے گرہ باز اور گولے ہوتے ہیں اور جو محض خوب صورتی اور خوش رنگی کے لحاظ سے پالے جاتے ہیں، اُن میں شیرازی، گلی، نساوری، گلوے، لقّے، لوٹن اور چوبا چندن وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یاہو کبوتر رات دن گو بجنے اور " یا ہو" کا دم بھرنے کی وجہ سے عبادت گزاروں کو زیادہ پسند تھے ۔ اور اکثر فقرا و مشائخ کو ان کا شوق تھا۔
سنتے ہیں کہ گرہ باز پہلے پہل کابل سے لائے گئے۔ پہلے عموماً وہی اڑائے

جاتے تھے۔ گولے بعد کو آئے جن کی نسل عرب و عجم اور ترکستان سے آئی۔ گرہ باز کی یہ شان ہے کہ صبح کو اڑے تو گھنٹوں مکان کے عین محاذی آسمان پر چکر لگاتے رہے، اس طرح کہ صحن کے اندر لگن میں پانی بھر کے رکھ دیجیے تو اس میں ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔ بعض دن دن بھر اڑتے رہتے ہیں اور شام کو اترتے ہیں اپنے مکان کے پہچاننے اور وطن پرستی کے دل دادہ ہونے میں گرہ باز اتنا کمال رکھتے ہیں کہ خود میرے یہاں کا ایک کبوتر کسی کے وہاں پھنس گیا تھا جس نے پر کاٹ دیے، تین سال کے بعد جب اسے موقع ملا اور پر نکل آئے تو واپس آیا اور اپنے خانے میں گھس کے اس کبوتر سے لڑنے لگا جو اب اس میں مقیم تھا۔

لیکن گرہ باز کی دس بارہ سے زیادہ کی ٹکڑی نہیں اڑتی۔ لوگوں کو سو سو دو دو سو کبوتروں کی ٹکڑیاں اڑانے کا شوق ہوا تو گولے اختیار کیے گئے۔ کبوتر بازی کا فن دہلی ہی میں اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ کہتے ہیں آخری وارث دولت مغلیہ بہادر شاہ کی سواری نکلتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اڑتی ہوئی جاتی اور جہاں پناہ پر سایہ کیے رہتی۔

کبوتر کو اپنے گھر سے بہت زیادہ اُنس ہوتا ہے۔ کابک کو ٹھیل پر رکھ کے لے جانے اور جہاں کہا جائے، روک کے اڑانے اور پھر کابک پر بلا لینے کا کمال بھی دہلی ہی میں پہلے نظر آچکا تھا۔

لکھنؤ میں کبوتر بازی اس خاندان فرماں روائی کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ سید یار علی نام ایک شخص نے جو بریلی کا رہنے والا تھا، اپنے آپ کو ایک کامل کبوتر باز کی حیثیت سے دربار میں پیش کیا اور اُن کی بڑی قدر کی گئی۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں کو بھی شوق تھا اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے

میں تو کبوتر بازی یہاں بہت اعلا درجے پر پہنچ گئی تھی ۔ میر عبّاس نام یہاں کے ایک کاملِ فن کبوتر باز نے یہ کمال دکھایا کہ جو کوئی پانچ روپے نذر کرکے اُن کی دعوت کرنا چاہے، وہ کہیں رہتا ہو، کابک لے کے پہنچ جاتے اور اُسی کے گھر سے کبوتر اُڑا دیتے اور سیٹی پر بلا لیتے ۔ مجال کیا کہ کوئی کبوتر کسی اور جگہ گر جائے ۔ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض امیروں کے ہاں صرف نو سو کبوتریاں ایک ساتھ اُڑتیں ۔ اور بعض رئیس اتنے ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں نر کبوتر اُڑاتے ۔

خوست (علاقۂ سرحدِ افغانستان) سے ہیبت نام ایک خاص رنگ کے کبوتر آئے تھے جو نہایت قیمتی تھے ۔ اکثر رئیس ہزاروں روپیا صرف کرکے انھی کو اُڑاتے ۔

ایک جدّت پسند بزرگ نے لکھنؤ میں یہ کمال کیا کہ کبوتر کے دو بچّوں کو لے کے، ایک کا داہنا اور ایک کا بایاں بازو کاٹ دیا اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ ان دونوں میں ٹانکے لگا کے، ایک دوہریا کبوتر بنا لیا ۔ اور ایسی داشت سے پالا کہ وہ بڑے ہوئے اور اُڑنے لگے ۔ ایسے بہت سے دوہریا کبوتر تیار کیے ۔ اکثر معمول تھا کہ جب نصیر الدین حیدر، چھتر منزل سے بجرے پر سوار ہو کے پار جاتے اور کوٹھی دلآرام میں بیٹھ کے دریا کی سیر دیکھتے، وہ اُس پار سے اپنے اُن عجیب الخلقت دوہریا کبوتروں کو اُڑا دیتے، جو پار جا کے بادشاہ کے قریب بیٹھ جاتے ۔ بادشاہ انھیں دیکھ کے بہت محظوظ ہوتے اور انعام دیتے ۔

میر امان علی نام ایک بزرگ نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کبوتر کو رنگ کے جیسا چاہتے بنا دیتے ۔ اکثر جگہ پر اکھاڑ کے دوسرے رنگ کا پر اسی کے سوراخ میں رکھ کے اس طرح جما دیتے کہ وہ اصلی پروں کی طرح جم جاتا ۔ اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے مگر ایسا مضبوط اور پختہ رنگ کہ مجال کیا جو ذرا پھیکا بھی پڑ جائے ۔ برس بھر تک رنگ قائم رہتا ۔ مگر جب کریز میں پر گر جاتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا ۔

اُن کے اِن کبوتروں میں سے ہر ایک پندرہ بیس روپے کو بکتا اور اُمرا بڑے شوق سے لیتے۔ وہ بھانتیا بھی بنا لیا کرتے، جو لاکھوں میں ایک نکلتا ہے اور رنگ کے حدود اور گلّوں کے اعتبار سے بے مثل ہوتا ہے۔

ایک بڑے کبوتر باز، نوّاب پالکٹے تھے، جو گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح اُڑاتے۔ کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس مکان پر چاہتے، چھیپی کے اشارے سے بازی کرا دیتے۔ یعنی کبوتر ہوا میں قلابازیاں کھانے لگتے۔

واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں بہت سے نئے کبوتر جمع کیے تھے۔ کہتے ہیں کہ ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا پچیس ہزار کو لیا تھا اور ایک قسم کے سبز کبوتروں کی نسل بڑھائی تھی۔ جب انتقال ہوا ہے تو چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے جن پر سیکڑوں کبوتر باز نوکر تھے۔ اور ان کے داروغہ غلام عباس، کبوتر بازی کے فن میں جواب نہ رکھتے تھے۔

شوقینی اور فن دانی نے پالنے کے رنگین کبوتروں میں بھی بے مثل ترقی کی تھی۔ یہ صرف مشہور نہیں ہے، بلکہ ایسا شیرازی جو گز بھر کے پنجرے کی وسعت کو بھر لے اور ایسا گلی جو ایک بارہ برس کی لڑکی کی چوڑی میں سے نکل جائے، میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ (یہ ذکر ابھی ختم نہیں ہوا، باقی آیندہ نمبر میں عرض کروں گا)

(۳۰)

طیور کو لڑا لڑا کے دل چسپی پیدا کرنا اور تفنّن کے کمالات دکھانا، لکھنؤ کے بے فکروں کا نہایت ہی عام مشغلہ ہو گیا تھا۔ کبوتروں اور بٹیروں کے تیار کرنے اور لڑانے میں انھوں نے اس قدر ترقی کی کہ اب ہندوستان کے جس شہر میں اور جہاں کہیں کسی رئیس کو ان چیزوں کا شوق ہے (اور یہ کم بخت شوق، ناعاقبت اندیش دولت مندوں

میں اکثر ہوا کرتا ہے) وہاں استاد لکھنؤ ہی سے بلائے جاتے ہیں اور اس مد کا سارا کارخانہ انھی کے زیرِ اہتمام ہوتا ہے۔

توتے

طیور لڑانے کے حد سے گزرے ہوئے شوق نے اس میں جدّتیں پیدا کرنا شروع کیں اور بعض شوقینوں کا خیال اِس جانب مبذول ہوا کہ جو کام کبوتروں سے لیا جاتا ہے، اور کن کن طیور سے لیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ میر محمد علی نام ایک بزرگ نے توتوں سے کبوتروں کا کام لینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

توتا فطرۃً نہایت ہی بے وفا جانور ہے۔ زندگی بھر رکھیے اور پالیے، لیکن پنجرے سے اڑا تو پھر اُدھر کا رخ نہیں کرتا۔ توتا چشمی، نام ہی بے وفائی کا ہو گیا ہے۔ وہ بولتا ہے، باتیں کرتا ہے، جانوروں کی بولیاں اڑا لیتا ہے، جو فقرے یاد کرا دیجیے، اُن کی رٹ لگاتا ہے، مگر اڑانے کے کام کا نہیں۔ اس لیے کہ پنجرے سے چھوٹتے ہی پھر وہ کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ مگر میر صاحب موصوف نے خدا جانے کس تدبیر سے اُن کی فطرت بدل دی تھی کہ دس بارہ توتوں کی ٹکڑی اُڑاتے اور مجال کیا کہ وہ سیٹی بجا کے "آ" کریں اور وہ آسمان سے اتر کے سیدھے پنجرے میں نہ چلے آئیں۔ وہ ان توتوں کو روز حسین آباد میں لا کے اڑاتے۔

طیور کی اِن تیاریوں کا حال بیان کر کے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اہلِ لکھنؤ نے جتنی محنت طیور کی تیاری میں کی ہے، کاش خود اپنی اور اپنے جسم کی تیاری میں کرتے تو یہ انجام ہرگز نہ ہوتا جو ہوا۔

پتنگ بازی

کنکوے اُڑانے کا شوق کسی نہ کسی حد تک سارے ہندوستان میں ہے۔

اور آج کل عموماً لڑکوں اور نوجوانوں کا نہایت ہی دل چسپ کھیل ہے۔ اس کی کثرت اور تعمیم دیکھ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت پرانی چیز ہوگی، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ فن ایک صدی پیش تر کا بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے اور اس کا مرکزِ ترقی لکھنؤ ہی ہے۔

یورپ میں لڑکے ایک قسم کے کپڑے کے کنکوّے اڑایا کرتے ہیں جن کو جب تک ڈور پکڑ کے بھاگتے رہو، اڑتے ہیں۔ اور اِدھر قدم رُکا اور اُدھر وہ زمین پر آرہے۔ ان کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے ہیں، اور کہاں سے لیے گئے؟

سنا جاتا ہے کہ دہلی میں شاہ عالم بادشاہ اول کے عہد میں یہ شوق شروع ہوا۔ ابتداءً بعض خاص خاص لوگ چنگ اڑایا کرتے تھے۔ چنگ بڑے اہتمام سے بنایا جاتا تھا۔ اس میں دو تکلیں تھوڑے فصل سے آگے پیچھے برابر کھڑی کر کے جوڑ دی جاتیں۔ تکلوں کی شکل: یہ ہوتی تھی جس میں تین طرف مدوّر کونے نکلتے۔ اس میں ایک کھپاچ چھیل کے بیچ میں کھڑی لگائی جاتی جو ٹھڈا کہلاتی اور دو کھپاچیں خوب چھیل کے اور نرم کر کے اوپر نیچے لگائی جاتیں جو کانپیں کہلاتیں اوپر کی کانپ کی وضع یوں: ⌒ رہتی۔ اور نیچے کی کانپ کی یوں: ب۔ ان کے درمیان میں ہلکا باریک کاغذ منڈھ دیا جاتا۔ یہ ایک تکل ہوئی۔ ایسی دو تکلوں کو آگے پیچھے رکھ کے، اور درمیان میں جا بجا آڑی کھپچیاں لگا کے جوڑ دیا جاتا۔ اور چاروں طرف سے بھی کاغذ منڈھ کے، ایک خاص وضع کی تکنی قندیل بنا دی جاتی، جس کے اندر ایک کپڑے کا بنا ہوا تیل میں ڈوبا گیند، تاریں باندھ کے لٹکا دیا جاتا۔ اور اسے روشن کر کے رات کو لوگ مضبوط سوتی یا ریشمی ڈور پر اڑاتے۔ چنگ کی شان یہ تھی کہ معلوم ہوتا ایک لالٹین آسمان پر اڑ رہی ہے۔ اور غبارے کے خلاف

اُڑانے والے کے اختیار میں ہے جب چاہیں اُڑائیں اور جب چاہیں اتارلیں وہ ہوا میں قائم رہتا، کبھی اوندھا ہوتا تو پھر سیدھا ہو جاتا۔

اُسی زمانے میں بعض لوگ اسی وضع سے انسان کا ایک پُتلا بنا کے اڑاتے۔ بلکہ بعض قابلِ وثوق یادگارانِ سلف کا بیان ہے کہ سب کے پہلے وہ پُتلا ہی دہلی میں ایجاد ہوا تھا۔ پھر اُسی سے ترقی کر کے چنگ ایجاد ہوا، جس کا طول و عرض برابر ہونے کی وجہ سے، اُڑانا اور ہوا میں ٹھہرانا زیادہ آسان تھا۔ اس کا شوق زیادہ تر ہندوؤں میں تھا۔ اور کیا عجب کہ اُن کے وہاں کی قومی و مذہبی چیز ہوا ورا کاس دیا وغیرہ کے خیال سے ماخوذ ہو۔ پھر اُس چنگ کے کاٹنے کے لیے یا دن کو اڑانے کے خیال سے تکّل اُڑنے لگی، جو دراصل آدھا چنگ یا چنگ کی فقط ایک طرف کی دیوار تھی۔ تکّل میں خوبی یہ تھی کہ بہ نسبت چنگ کے آسانی سے اُڑ سکتی تھی۔ اِس میں چلت پھرت تھی۔ آسمان پر ہوا میں ناچتی اور دُور ہوتی چلی جاتی تھی۔ چنگ ایک جگہ قائم رہتا اور تکّل اِدھر اُدھر چلتی پھرتی تھی اور اِس پر اتنا قابو تھا کہ جب چاہیں اُس کی ڈور سے رگڑا دے کے دوسرے کے چنگ کو کاٹ دیں۔

تکّل نے دراصل قندیل یا روشن پُتلا اڑانے کا خیال بھلا دیا۔ اور لوگوں کو اس جانب متوجہ کیا کہ ہوا میں کوئی ایسی چیز اڑائی جائے جو زیادہ قابو میں ہو۔ اِدھر اُدھر آسمان پر دَوڑے اور ناچے۔ تکّل کا شوق مسلمان امیروں اور معزز ہندوؤں میں بڑھا۔ اس پر دولت صرف ہونے لگی۔ اعلا درجے کی تکّل کا نام پتنگ مشہور ہوا جس کا ٹھڈّا مرشد آبادی بانس کا ہوتا جس میں اسّی روپے لاگت آتی۔ بیس روپے کی جُھل جُھل ہوتی۔ دو روپے کا کاغذ لگتا اور پانچ روپے بنوائی پڑتی۔ غرض ایک سو سات روپے میں ایک پتنگ تیار ہوتا۔

بہ ہر حال، دہلی میں تکّل اور پتنگ ہی تک ترقی ہوئی تھی کہ قدردان دربار دہلی

سے لکھنؤ میں منتقل ہوا، اور اس کے ساتھ ہی زمانے کے شوقین بھی یہاں چلے آئے۔ ایک پتنگ اڑانے سے، پتنگ لڑانے کا شوق نکلا۔ ایسی زوردار تکلیں بنائی جانے لگیں جن کو معمولی قوت کا آدمی مشکل سے سنبھال سکتا۔ آٹھ آٹھ بل کی مضبوط ڈور چرخیوں پر چڑھائی جاتی اور انھیں چرخیوں کے ذریعے سے تکلوں کا زور سنبھالا جاتا۔ لڑائی کی یہ شان تھی کہ دو تکلوں کی ڈور ایک دوسری میں ڈال کے دونوں طرف سے ڈھیل دی جاتی۔ دونوں تکلیں چکر کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی اور بلند ہوتی چلی جاتیں۔ اور دونوں طرف سے چرخیوں پر چرخیاں خالی ہوتی رہتیں۔ لکھنؤ کے شوق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کی تکل میں پانچ روپے کی مقیش کی جھل جھل ہوتی۔ جو لوٹ کے لاتا اسے پانچ روپے دے کے تکل لے لی جاتی۔ اور نہ لاتا، تو بھی جہاں چاہتا، پانچ روپے کو بیچ لیتا۔

پتنگ بازی کے پرانے نامی استاد لکھنؤ میں میر عمدو، خواجہ مٹھن، شیخ امداد تھے۔ ایک جلاہے نے بھی ان دنوں اس فن میں کمال حاصل کیا تھا جس کی وجہ سے امرا کی صحبتوں میں اس کی بڑی قدر ہوتی۔

امجد علی شاہ کے زمانے میں یک بہ یک گڈی ایجاد ہوئی جس کی قطع لوزات کی سی ہوتی۔ وہ تکل کی بہ نسبت آسانی سے بنتی۔ تکل میں دو کانپیں اور ایک ٹھڈا ہوتا تھا، گڈی میں صرف ایک ہی کانپ اور ایک ہی ٹھڈا رہ گیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں ڈیڑھ کنا کنکوا بن گیا جس کی قطع موجودہ کنکوے کی تھی، مگر نیچے تکل کی یادگار میں کاغذ کا چھوٹا سا پھندنا ہوتا۔ اب نواب محمد حسین خاں سالار جنگی، آغا ابو تراب خاں اور دو ایک شوقین رئیسوں نے پھندنے کی جگہ نیچے پتا لگا کے وہ کنکوا بنا دیا، جو فی الحال مروج ہے اور جس میں ابھی تک اور کسی ترقی کی گنجایش نہیں نظر آتی۔ فی الحال سارے ہندوستان میں پتے دار کنکوا یا پھندنے دار کنکوا جو ڈیڑھ کنا

کہلاتا ہے، اُڑتا ہے۔ مگر اِس کی ایجاد لکھنؤ ہی میں ہوئی ہے یہیں سے سب جگہ گیا اور مقبولِ عام ہوا۔

کنکوّوں کے لڑانے میں بھی پہلے تکّل کی طرح ڈھیل کا رواج تھا۔ بڑے بڑے کنکوّے بنتے اور سیروں ڈور پیتے چلے جاتے۔ آخر شاہی اور آغاز انگریزی کے مشہور استاد ولایت علی جو ولایتی کہلاتے۔ الٰہی بخش ٹنڈے جو مٹیا برج میں جا کے مشہور ہوئے اور لکھنؤ کے سیکڑوں باکمال استاد تھے جن کے نام مجھے اس وقت نہیں یاد آتے۔ مگر سچ یہ ہے کہ لمڈورے پیچ لڑانے کے بادشاہ تھے۔

انگریزی کے آغاز میں کھینچ لڑانے کا رواج ہوا۔ اس کا آغاز تو اُن چھوٹے لڑکوں سے ہوا جن کے پاس تھوڑی سی ڈور ہوتی اور دوسرے کے کنکوّے میں پیچ ڈال کے اپنی بے مایگی سے بے تحاشا کھینچ جاتے اور کاٹ دیتے۔ پُرانے استاد اُن دنوں اِن لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اپنے کنکوّوں کو اُن سے الگ رکھتے۔ مگر آخر کار کھینچ ہی کنکوّے بازی کا اعلاترین فن ہو گیا جس میں بڑے بڑے استاد پیدا ہوئے۔ آج لکھنؤ میں بیسیوں استاد پڑے ہوئے ہیں جو اسی شوق میں لاکھوں روپے اُڑا کے استاد بنے ہیں اور گھر بگاڑ کے اتنی فوقیت حاصل کی ہے کہ کنکوّے کے میدانوں میں بڑے شوق سے بلائے اور ادب و تعظیم کے ہاتھوں سے لے کے آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔

(۳۱)

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فنِّ موسیقی کا اور اس کے سلسلے میں اُن لوگوں کا جو اِس فن سے وابستہ ہیں، لکھنؤ میں کیا حال رہا۔

گانا اُن چیزوں میں سے ہے جن کو انسان کی فطرت نے سب سے پہلے ایجاد کیا۔

جن الفاظ کے ادا کرنے میں جوش ظاہر کرنے کو جی چاہا، لوگ گانے لگے۔ اور جن حرکات و افعال میں جذبات نے ابھارا، ناچنا شروع کر دیا۔ اور چونکہ سب سے زیادہ جوش و قیمنا نہ انہماک عبادت میں ہوتا ہے، اور دنیوی امور میں سب سے زیادہ بے اختیاری کا ناقابلِ برداشت جوش عشق و محبت کے اظہار میں ہوتا ہے، اس لیے گانے کا آغاز بھی ابتداً عبادت و عشق میں ہوا۔ ہندوستان میں گانے کا آغاز قطعاً عبادت سے ہوا۔ اس لیے کہ یہاں کے پہلے گویّے، خاص برہمن تھے، جو ابتداً عبادت کرتے کراتے وقت اپنے معبودوں کی تعریف کے بھجن گایا کرتے کنھیّا جی کی ولادت نے اُن کی محبت اور ان کے عشق کو عبادت بنا کے، عاشقانہ موسیقی ایجاد کی۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں شاعری اور موسیقی دونوں کا اظہار عورت کی زبان سے ہوا کرتا ہے۔ ابتداً برہمن فقط گیت اور سنگیت یعنی سیدھے سادے گانے گایا کرتے تھے جن میں فن کی ترقّیوں کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا مگر بعد کو مصریوں، بابلیوں اور ایرانی محققوں کے مذاق کی آمیزش سے ایک فن کی بنیاد پڑی اور سب سے پہلے سات سُر ایجاد ہوئے، اس لیے کہ ہر آواز پھیلنے میں ایک حد پر پہنچ کے بدل جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کا صحیح اندازہ کر کے محققین نے سات سُر ایجاد کیے۔

اس کے بعد ہندوستان میں موسیقی کی تقسیم اس حیثیت سے ہوئی کہ جو راگ عبادت میں گائے جاتے، وہ یا تو برہما (پیدا کرنے والی قوّتِ الٰہی) کی منقبت میں ہوتے، یا بشن (جلانے اور پالنے والی قوّتِ الٰہی) کی تعریف میں ہوتے، یا مہیش یعنی مہا دیو (مارنے والی قوّتِ الٰہی) کی مدح میں ہوتے۔ اسی لحاظ سے تین قسم کے راگ بن گئے۔ پہلی قسم کے راگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ برہمنوں نے کسی کو نہ بتائے اور اپنے ساتھ لے کے مر گئے۔ جو راگ تمام مراحلِ زندگی، زچہ خانے، شادی، اور دنیا بھر کے کاروبار کے متعلق تھے، وہ دوسری

قسم کے راگ قرار پائے۔ آخری قسم کے راگ، مابعدُ الموت کی حالت اور ثواب وعقاب سے وابستہ تھے، وہ اکثر ہیبت خوف دلانے والے اور دل پر عالم کے فانی ہونے کا اثر ڈالنے والے ہوتے۔ عاشقانہ راگ بھی محض اس لیے کہ عاشق، مرگ کا خواہاں ہوتا ہے، اسی قسم میں شامل کر دیے گئے۔ خصوصًا اس لیے کہ کنھیا، سری کرشن جی مہادیو ہی کا ایک اوتار تھے۔ اس قسم کے راگ عمومًا "بروگ" کہلاتے۔ ان کے راگ: بھیروں، سری راگ، اور راگنیاں: بھیرویں، پرج، کالنگڑا، سوہنی، سندھ، پیلو وغیرہ ہیں۔

اس کے بعد جب برہمنوں کو راجاؤں کے دربار میں اُن کی مدح کے قصائد گانا پڑے، تو اِن کے مناسب رعب داب اور سطوت و شوکت کے راگ ایجاد ہوئے۔ جیسے مالکوس، درباری، شاہانہ (اڈانہ) وغیرہ۔

مسلمان اپنے ساتھ اپنا موسیقی لائے تھے۔ ان کا موسیقی سب کے پہلے ابن مسجح نے مدوّن و مکمل کیا تھا۔ اس کے بعد جب عراق میں عباسی دربار قائم ہوا تو عربی اور فارسی موسیقی سے مل کے ایک نیا اور نہایت مکمل فنِ غنا ایجاد ہوا، جو ساری دنیا میں پھیل گیا۔ اور وہی آخر میں عجمی موسیقی تھا۔ مسلمان اسی فن کو ہندوستان میں لائے۔ اور جو گویے اُن کے ساتھ یہاں آئے تھے انھی کی یادگار آج کل قوّال ہیں۔ اُن کے آلاتِ طرب: سرود، چنگ، شہنائی (سینائی) بربط اور رباب ہیں۔

ہندوستان میں ہر چیز پر مسلمانوں نے اپنا اثر ڈالا، تمام علوم و فنون اور معاشرت کی تمام باتوں کو بدل دیا۔ مگر یہاں موسیقی پر بہت کم اثر ڈال سکے جس کی وجہ عمومًا یہ خیال کی جاتی ہے کہ خود یہاں کا موسیقی اس قدر باضابطہ اور اعلا درجے کا تھا کہ اپنی مضبوطی و باقاعدگی کے باعث بیرونی اثر سے متاثر ہی نہ ہو سکا۔ لیکن حقیقتِ حال اور اس کا اصلی باعث یہ ہے کہ کسی ملک اور زبان کی موسیقی کی طرف انسان اُس وقت توجّہ کرتا ہے جب اُس ملک کا باشندہ بن لے اور وہاں کی

زبان و معاشرت کا رنگ اُس پر چڑھ جائے۔ لہٰذا یہاں آنے کے بعد حملہ آور مسلمان جب تک عربی یا عجمی رہے، یہاں کے موسیقی کی طرف توجہ نہ کی اور جب توجہ کی تو اُس وقت ہندوستانیت اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اپنے قومی راگوں کو بھول چکے تھے، اور یہاں کے نغموں کے دل دادہ تھے۔ اُس وقت وہ اِس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ یہاں کے موسیقی میں کسی قسم کا تصرّف کرتے یا اس میں کچھ نکتہ چینی کر سکتے۔

پھر بھی عجمی قوّالوں کے نغموں نے ہندوستان کے موسیقی پر تھوڑا بہت اثر ڈال ہی دیا۔ چنانچہ اُن کے متعدد راگ ہندی موسیقی میں شامل ہو گئے۔ زنگولہ (جنگلا) زلیف، شاہانہ، درباری، ضلع (کھماچ) وغیرہ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ عجمی راگ ہیں جو ہندوستانی فنِ غنا میں شامل ہو گئے ہیں۔

امیر خسرو نے دونوں فنون کو حاصل کیا، اور دونوں کے ملانے کی بہت کچھ کوشش کی۔ کہتے ہیں کہ ستار کو اُنھی نے ایجاد کیا۔ اور یقیناً بہت سی دُھنیں اُن کی ایجاد کی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا پتا لگانا بہت مشکل ہے کہ امیر خسرو نے یہاں کے موسیقی میں کون کون خاص چیزیں بڑھائیں۔

مسلمانوں میں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں سے پہلے مشائخ صوفیہ نے موسیقی کی طرف توجہ کی۔ اور حال و قال کی جو صحبتیں عراق و عجم کے زُہّادِ سلف میں عبادت کی شان سے قائم تھیں، ہندوستان میں بھی قائم ہو گئیں۔ اور جو گویے اس سے بیش تر بُت خانوں میں بھجن گایا کرتے تھے، مسلمان زُہّاد و صوفیہ کے حلقے میں بیٹھ کے معرفت کی غزلیں گانے لگے۔

بادشاہوں کے درباروں میں بھی یہاں کے گویّے اور گانے ناچنے والی رنڈیاں موجود رہا کرتیں، مگر اُن کا افسرِ اعلا کوئی عجمی گویّا ہوا کرتا تھا جو اُن کے موسیقی پر اپنا کچھ نہ کچھ

اثر ضرور ڈالتا۔ محمد تغلق کے عہد میں دربار کا سب سے بڑا گویا امیر شمس الدین تبریزی تھا، اور کل زن و مرد اربابِ نشاط اُس کے زیرِ حکم تھے۔ اُنھی دنوں دیوگڑھ یعنی دولت آباد کے متصل اربابِ نشاط کی ایک پوری بستی آباد تھی، جو "طرب آباد" کہلاتی۔ اُس کے چوپڑ کے بازار کے بیچوں بیچ میں ایک برج تھا جس میں روز بعدِ عصر اربابِ نشاط کا چودھری آکے بیٹھتا اور اُس کے سامنے تمام گویّوں اور رنڈیوں کے طائفے باری باری آکے گاتے۔ ان میں سے اکثر مسلمان تھے اور صوم و صلات کے پابند اس بستی میں جا بہ جا مسجدیں تھیں، جن میں ماہِ مبارکِ رمضان میں تراویح پڑھی جاتی۔ بڑے بڑے راجا یہاں آکے گانا سنتے۔ کئی مسلمان تاج داروں نے بھی یہاں آکے گانا سُنا تھا۔ اہلِ طرب کے سرگروہ اور چودھری چوں کہ عموماً مسلمان تھے اس لیے ظاہر ہے کہ عربی و عجمی اور ہندوستانی فنونِ غنا کس قدر جلد مل جُل گئے ہوں گے۔

ہندو موسیقی کے مرکز شمالی ہند میں متھرا، اجودھیا اور بنارس تھے۔ جہاں مذہبی عنصرِ اعظم ہونے کی وجہ سے موسیقی کا فن ہمیشہ پرورش پاتا رہتا تھا۔ جون پور کے سلاطینِ شرقی میں سے سلطان حسین شرقی کو موسیقی کا شوق بہت تھا۔ وہ خود ایک بڑا گویا تسلیم کیا جاتا۔ اور چونکہ اجودھیا اور بنارس دونوں اُس کی قلم رَو میں تھے، اِس لیے، یقیناً اُس نے ہندوستان کے اِس شریف فن کو بڑا فائدہ پہنچایا ہوگا۔

اکبر نے اس فن کی یہاں تک قدر کی کہ اُس کے عہد کا سب سے بڑا نامور گویّا تان سین اس کے "نورتن" میں شامل ہوا۔ ایک مسلمان شہنشاہ کی یہ توجہ و عنایت دیکھ کے وہ خود، یا اُس کا بیٹا بلاس خاں مسلمان ہوگیا۔ اِس خاندان میں دربار کی قدردانی سے ہندی موسیقی کو روز بہ روز عروج حاصل ہوتا رہا۔ بعد کے درباروں میں اِسی نسل کے گویّے سرفراز ہوتے رہے۔ چناں چہ آج تک اس خاندان کے لوگ اپنے

آپ کو دربارِ مغلیہ ہی سے وابستہ خیال کرتے ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ اسی نسل کے ذریعے سے ہندوؤں کا یہ فن مسلمانوں میں آیا۔ مگر جن واقعات کو ہم بیان کرتے ہیں، اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اِس خاندان سے بہت پہلے مسلمانوں نے اِس ہندی کمال کو حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ فی الحال ہندی موسیقی کے تمام باکمال اور کُل نامی گویے مسلمان ہی ہیں۔

دہلی میں اس فن پر سب سے پہلے شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں کتاب شمس الاصوات لکھی گئی، جو اب کہیں نہیں ملتی۔ پھر اکبر ثانی کے عہد میں میرزا خان نام ایک بزرگ نے پنڈتوں اور علمائے سنسکرت کی مدد سے کتاب "تحفۃ الہند" تصنیف کی جس کے دو ہی ایک نسخے بعض لوگوں کے پاس رہ گئے ہیں۔ اِس میں بہت سے ہندی فنون کو جمع کیا ہے۔ جہاں جوتش، سرودھا، سامدرک، کوک، نائکا بھید، اندرجال وغیرہ مختلف فنون پر بحث کی ہے، وہاں ہندی موسیقی کو بھی بتایا ہے۔

دہلی میں اِسی حد تک ترقی ہونے پائی تھی کہ یہ دل چسپ فن دربارِ لکھنؤ میں منتقل ہو آیا اور نواب شجاع الدولہ کی قدردانی و فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر لا کے اکٹھا کر دیا۔ یہاں اجودھیا اور بنارس کے موسیقی کے پُرانے اسکول قائم ہی تھے۔ جون پور کے شرقی سلاطین کی قدردانی کی کچھ نہ کچھ یادگاریں بھی باقی تھیں، ان میں جب دہلی کے باکمال گویے اور تان سین خاں کے مستند اسکول کے استادانِ موسیقی بھی آ کے مل گئے تو خاص شان پیدا ہو گئی۔ اور موسیقی کا در اصل ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

شجاع الدولہ کی نسبت مصنفِ تاریخ فیض آباد لکھتے ہیں کہ اربابِ نشاط کا بڑا شوق تھا۔ ہزارہا گانے والی رنڈیاں عموماً دہلی سے اور دیگر بلادِ دور و دراز سے یہاں آ کے جمع ہو گئی تھیں۔ عام رواج پڑ گیا تھا کہ نواب وزیر کے علاوہ اور تمام امراء

سرداران فوج بھی کسی طرف کوچ کرتے تو ارباب نشاط اور رنڈیوں کے ڈیرے اُن کے ساتھ ساتھ جاتے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں فارسی زبان میں کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" لکھی گئی۔ ہندوستان کے فنِ موسیقی پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک تصنیف نہیں ہوسکی، اگرچہ اس کتاب کے بھی بہت ہی کم نسخے دست یاب ہوتے ہیں۔ میرے پاس موجود ہے؛ اور میں نے اسے پڑھا ہے۔ مصنّف پختہ مغز، صاحب علم وفضل ہے۔ عربی فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں میں پوری دست گاہ رکھنے والا معلوم ہوتا ہے جس نے اس امر میں بڑی کام یاب کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ہر شخص کے ذہن نشین کر دے۔ اسد اللہ خاں کوکب مرحوم، جنھوں نے چند ہی روز ہوئے انتقال کیا، موسیقی کے اعلا درجے کے صاحبِ علم استاد تھے، اور کلکتے میں ہندوستانی موسیقی کے پروفیسر مشہور تھے، وہ اس کتاب کی نسبت مجھے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "موسیقی کا یہ فارسی رسالہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ رسالہ اُن معتبر کتابوں سے؛ جو اس علم کی قدیم مایۂ بساط ہیں: مضامین اخذ کرکے، بڑی تحقیق اور تدقیق سے لکھا گیا ہے۔"

(افسوس، یہ لاجواب کتاب آج تک نہیں چھپی۔ اور اس کے نسخے اس قدر کم یاب ہیں کہ اس کے فنا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اگر کوئی رئیس توجہ کریں تو ملک اور اپنی قدیم تاریخ پر بڑا احسان کریں)

یہ رسالہ ہی بتا رہا ہے کہ آصف الدولہ کے عہد کے لکھنؤ میں موسیقی کو کس قدر ترقی ہوگئی تھی۔ اس کا مصنّف ایک بڑا محقق معلوم ہوتا ہے جس نے ابن سینا

کی کتاب شفا سے لے کے عربی اور فارسی موسیقی کے اُصول بھی بہ صراحت بتا دیے ہیں۔ دل گداز کے اس مضمون کی تکمیل کے لیے ہم نے پروفیسر کوکب مرحوم سے مدد مانگی تھی۔ انھوں نے جواب میں ہمیں جو کچھ لکھا، اُسے ہم بجنسہٖ شائع کیے دیتے ہیں اس سے بہ خوبی معلوم ہو جائے گا کہ لکھنؤ میں آنے کے بعد فنِ موسیقی کی کیا حالت رہی؟ افسوس اب وہ دنیا میں نہیں ہیں، ورنہ ہمیں اُن سے بہت زیادہ مدد ملتی۔ خصوصاً اس لیے کہ اپنی نئی کتاب، جو فنِ موسیقی میں لاجواب ہے، وہ ہمارے یہاں چھپوانا چاہتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد کی ترقیِ موسیقی تسلیم کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں موسیقی پر اوس پڑ گئی۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بہت بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا، جس کا نام حیدری خاں تھا۔ یہ صاحب اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے "سڑے حیدری خاں" مشہور تھے، اور گولا گنج میں رہتے تھے۔ غازی الدین حیدر کو ان کا گانا سننے کا بڑا شوق تھا، مگر کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کنارے تفریح کو نکلے۔ رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ سڑے حیدری خاں چلے جاتے ہیں۔ بادشاہ سے عرض کی کہ قبلۂ عالم! حیدری خاں یہی ہیں۔ بادشاہ کو تو اشتیاق تھا ہی، حکم دیا کہ بلاؤ۔ لوگ پکڑ لائے اور سامنے کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے کہا: ارے میاں حیدری خاں، کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے؟ بولے: جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا، مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے۔ بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا: اچھا ہمارے ساتھ چلو، ہم خود تمھیں اپنے مکان پر لے چلیں گے۔ "بہت خوب" کہہ کے، بے تکلف ساتھ ہو لیے۔ چھتر منزل کے قریب پہنچے تھے کہ حیدری خاں ہنستے ہنستے پر سے اکھڑ گئے اور بولے:

میں چلتا تو ہوں مگر پوریاں اور بالائی کھلوایئے گا، تو گاؤں گا۔ بادشاہ نے وعدہ کیا، اور محل میں بیٹھ کے گانا سُننے لگے۔ تھوڑی ہی دیر سُن کے بہت محظوظ ہوئے وجد کا عالم طاری ہوا اور بے خود و بے تاب ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کے حیدری خاں خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے: حضور! یہ تمباکو جو آپ کے پیچوان میں بھرا ہوا ہے، بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے، آپ کس کی دُکان سے منگواتے ہیں؟ غازی الدین حیدر خود بھی آشفتہ مزاج تھے اور سِڑی مشہور تھے، اِس سوال پر منغض ہوئے، تو مصاحبوں نے عرض کیا: قبلۂ عالم! یہ سِڑی تو ہئی ہے، ابھی تک یہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔

اب لوگ بادشاہ کے ایما سے حیدری خاں کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ پوریاں بالائی کھلوائیں، حقّہ پلوایا۔ آپ نے پاؤ بھر پوریاں، آدھ پاؤ بالائی اور ایک پیسے کی شکر منگوا کے اپنی بی بی کو بھجوائی (جو اُن کا ہر جگہ معمول تھا) جب تک اِن کاموں میں رہے، بادشاہ نے بادۂ ناب کے جام پیے اور جب نشے کا زور ہوا تو پھر حیدری خاں کی یاد ہوئی۔ فوراً بلوا کے گانے کا حکم دیا۔ مگر جیسے ہی اُنھوں نے اپنا نغمہ شروع کیا، روک کے کہا: حیدری خاں، سنتے ہو! اگر مجھے خالی خوش کیا اور رُلایا نہیں تو یاد رکھو کہ گومتی میں ڈبوا دوں گا۔ اب تو حیدری خاں کی عقل چکر میں آئی۔ سمجھے کہ یہ بادشاہ ہیں۔ کہا: حضور! اللہ مالک ہے، اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت یا یہ کہیے کہ حیدری خاں کی زندگی تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ پر اثر ہوا، بے اختیار رونے لگے، اور خوش ہو کے کہا: حیدری خاں! مانگ کیا مانگتا ہے؟ عرض کیا: جو مانگوں گا دیجیے گا؟ بادشاہ نے وعدہ کیا۔ اور حیدری خاں نے تین دفعہ قبولوا کے کہا: حضور، یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی نہ بلوایئے گا اور نہ گانا سنیے گا۔ بادشاہ نے تعجب سے پوچھا: کیوں؟ عرض کیا: آپ کا کیا ہے، مجھے مروا ڈالیے گا، پھر مجھ سا حیدری خاں پیدا نہ ہوگا۔

اور آپ مر جائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔ اس جواب پر غازی الدین حیدر نے ناراض ہو کے مُنہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے ہی حیدری خاں اپنی جان لے کے بھاگے اور اپنے گھر آئے۔

غرض، غازی الدین حیدر کے زمانے میں یہی ایک باکمال موسیقی داں لکھنؤ میں تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں یوں تو ہزاروں گانے والے تھے، مگر اس پایے کا گویا کوئی نہ تھا۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانے ثقاہت مآبی کے عہد تھے، اس لیے کہ محمد علی شاہ میں پیرانہ سالی کی بے حسی تھی اور امجد علی شاہ بغیر جناب قبلہ و کعبہ سے پوچھے کوئی کام نہ کرتے تھے، لہٰذا اُن کے زمانے میں بعض شوقین رؤسائے شہر اگر اربابِ نشاط کے قدر دان بھی تھے تو چھپا کے گانا سنتے۔ اس لیے اب اس فن کی جو کچھ قدر ہوئی، واجد علی شاہ کی عہدِ شباب کی تخت نشینی میں ہوئی جب کہ لکھنؤ کا ساغرِ عیش چھلکنے کو تھا اور گُل ہونے والا چراغ آخری مرتبہ بھڑک کے روشن ہوا تھا۔"

(۴۲)

اگرچہ ہم نصیر الدین حیدر اور بعد والے فرماں روایانِ عہد کے موسیقی کے بارے میں کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے ہیں، مگر اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسد اللہ خاں کوکب مرحوم کے خط کا باقی ماندہ حصہ بھی اپنے ناظرین کو سنا دیں، جس سے لکھنؤ کی موسیقی پر ایک مستند ماہرِ فن کی رائے معلوم ہو جائے گی۔

وہ تحریر فرماتے ہیں: "واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں باکمالانِ موسیقی کا گروہِ کثیر جمع ہو گیا تھا۔ لیکن دربار کے رسوخ یافتہ اور صاحبِ خطاب گویے کاملینِ فن نہ تھے۔ صرف ایک قطب الدولہ، رام پور کے رہنے والے البتہ ستار

خوب بجاتے تھے اور اپنے فن میں اچھے تھے۔ انیس الدولہ، مصاحب الدولہ، وحید الدولہ اور رضی الدولہ اگرچہ گویے تھے، مگر ایسے باکمال نہ تھے، فقط عنایتِ شاہی سے دولہ ہو گئے تھے۔ کاملین فن میں یہ لوگ تھے: پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں، باسط خاں۔ یہ سب لوگ میاں تان سین کے خاندان کی یادگار تھے۔ اس خاندان کے دو نامی شخص آج کل بھی موجود ہیں: ایک وزیر خاں جو ریاستِ رام پور میں ہیں۔ دوسرے محمد علی خاں، جو ریاستِ پرسنڈا میں ملازم ہیں۔ محمد علی خاں کے والد باسط خاں تھے جن کا نام اوپر آ چکا ہے۔"

اس موقع پر کوکب خاں مرحوم بتاتے ہیں کہ میرے والد مرحوم نعمت اللہ خاں نے باسط خاں ہی سے علمِ موسیقی حاصل کیا تھا۔ نعمت اللہ خاں تقریباً گیارہ سال تک مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے ساتھ رہے۔ پھر اس کے بعد تیس برس تک دربار نیپال میں رہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں: "واجد علی شاہ کے عہد میں موسیقی کا خوب چرچا رہا۔ لیکن علمِ موسیقی اپنے بلند پایہ سے گر کے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر آ گیا تھا۔ لکھنؤ میں کدر پیا نے ٹھمریاں تصنیف کر کر کے عوام میں پھیلائیں، اور موسیقی کو بے حس کر دیا چنانچہ اکثر شیدایانِ موسیقی اعلا درجے کی راگ راگنیوں کو چھوڑ کے کدر پیا کی ٹھمریاں پسند کرنے لگے۔ موسیقی کے مذاق میں تنزل محمد شاہ رنگیلے ہی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا جب میاں سارنگ نے خیال کو تصنیف کیا، جس سے فنِ موسیقی اصولاً ناقص ہو گیا۔ مگر اس سے بدرجہا زیادہ خرابی کدر کی ٹھمریوں سے پیدا ہو گئی۔ اور اب عوام و رؤسا کی یہ حالت تھی کہ اعلا قسم کے موسیقی کو اگر سنتے بھی تھے تو دلچسپی و شوق سے نہیں، بلکہ ناپسند کرتے تھے۔

واجد علی شاہ کے مصاحب گویوں میں سے انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ نے موسیقی کو پیار خاں سے حاصل کیا تھا، جو بہت بڑا صاحبِ کمال اُستاد تھا۔ اور جو کچھ اُس نے اِن دونوں شاگردوں کو بتایا، وہ بے شک اعلا پایہ کا تھا، لیکن اس کا کیا علاج کہ دربار میں ایسے موسیقی کی قدر ہی نہ تھی۔ رہس جو قیصر باغ میں ہوتا تھا،

جس میں واجد علی شاہ خود کنھیا بنتے تھے، بہت ہی مبتذل درجے کا موسیقی تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رغبت نہ ہونے پر بھی اہلِ کمال کی دربارِ شاہی میں بڑی قدر ہوتی تھی۔ جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ واجد علی شاہ نے بھی باسط خاں سے فنِ موسیقی حاصل کیا تھا۔ اور فن میں پوری بصیرت رکھتے تھے۔ اپنی عالی دماغی کی وجہ سے بادشاہ نے اپنے طرز میں نئی راگنیاں تصنیف کیں، جن کے نام اپنی طبیعت داری سے جوگی کنڑ، جوہی، شاہ پسند وغیرہ رکھے۔ واجد علی شاہ کو اس فن میں اساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ صاحبِ کمال تھے۔ لیکن اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ اُن کے عامیانہ مذاق نے لکھنؤ میں موسیقی کو سبک اور عام فہم بنا دیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کے، نفیس طبیعتیں رکھنے والے گویّوں نے بھی راگ راگنیوں کی مشکلات کو ترک کر کے، چھوٹی چھوٹی، سادی اور دلکش اور عام فہم چیزوں پر موسیقی کو قائم کیا۔ عوام میں غزل، ٹھمری کا چرچا ہو گیا۔ اور دھرپد، ہوری وغیرہ، جو نہایت ثقیل اور مشکل چیزیں ہیں، اُن کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔ کھماچ، جھنجھوٹی، بھیرویں، سیندورا، تلک کامود، پیلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی مزے دار راگنیاں اہلِ مذاق کے تفنن کے لیے منتخب کی گئیں۔ اور یہی چیزیں بادشاہ کو بالطبع مرغوب تھیں۔ یہ راگنیاں لکھنؤ کی قدرداں سوسائٹی کے مذاق میں یہاں تک سرایت کر گئیں کہ آج سارے ہندوستان میں لکھنؤ کے سفیدے خربوزوں کی طرح، لکھنؤ کی بھیرویں بھی مشہور ہو گئی۔ اور سچ یہ ہے کہ بھیرویں، لکھنؤ ہی کا حصہ ہے۔ ایسی بھیرویں ہندوستان کے کسی حصے میں نہیں گائی جاتی۔ سوز خوانوں نے بھی انھی عام پسند و عام فہم راگنیوں کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی سفارش سے گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک کے گلے میں اُتر گئیں۔ یہاں تک کہ اُن کی نوحہ خوانی سُن کے بڑے بڑے باکمال گویّے نقشِ حیرت بن جاتے ہیں۔ سوز خوانوں میں سے اکثر پیار خاں اور حیدر خاں کے شاگرد تھے۔

لَے، ایک اہم جزِ موسیقی ہے۔ جس کو عرفِ عام میں ٹائم یا وقت کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اِس کا مادّہ واجد علی شاہ میں بہت زیادہ تھا، جسے قدرت کی دین کہنا چاہیے۔ اور یوں تو لَے کا مادّہ کم و بیش ہر شخص میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ شعرا نے جو اوزان مقرّر کیے ہیں، وہ بھی لَے ہی سے تعلّق رکھتے ہیں۔ علمِ عروض دراصل مکمّل لَے ہے۔ ارکان، تال کے اجزا ہیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص میں فطرۃً لَے کا مادّہ بہت بڑھا ہوا ہوگا، اُس کے ہر عضو اور بُنِ مو سے حرکتِ بے اختیاری ظہور پذیر ہوگی پیدا ہوجائے گی، اور لَے پر عضو عضو پھڑکنے لگے گا۔ عوام کی نظر میں یہ حرکت بے وقعت اور مہمل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے مجبور ہے۔ وہ دانستہ اِس فعل کو نہیں کرتا، بلکہ اعضا خود بہ خود لَے پر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے اِسی فعل کو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ناچتے تھے۔ حالانکہ وہ ناچتے نہ تھے۔ بلکہ لَے داری میں محو ہو کے، اُن کے اعضا سے ایسے حرکات سرزد ہونے لگتے تھے۔ جو لوگ اصولِ موسیقی سے ناواقف ہیں، کہنے لگے: بادشاہ ناچتے ہیں۔ دراصل واجد علی شاہ کبھی اور کسی زمانے میں نہیں ناچے۔ اُن کا ناچنا بس یہی تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ لے داری میں کوئی اعلا درجے کا کاملِ فن گویا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ میں نے اُن کی صحبت کے معتبر گویّوں سے سنا ہے کہ بادشاہ کے پانو کا انگوٹھا سوتے میں بھی لَے ہی پر چلتا تھا۔

نرت، جس کو بھاو بتانا کہتے ہیں، یہ فن بھی علمِ موسیقی کا ایک خاص جز ہے۔ نرت کا مقصد یہ ہے کہ مافی الضمیر، حرکات اور اشاروں سے ادا کیا جائے۔ جس کو انگریزی میں موشن کہتے ہیں۔ موشن بڑے بڑے جیّد اسپیکروں اور لیکچراروں میں پایا جاتا ہے، لیکن انھیں کوئی ہدفِ ملامت نہیں بناتا۔ مگر بے چارے واجد علی شاہ محض اپنی لَے داری کی وجہ سے بدنام کیے جاتے ہیں۔"

یہ ہے جو لکھنؤ کی موسیقی اور واجد علی شاہ کے متعلق کوکب مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوا۔ اِس سے صاف پتا چل سکتا ہے کہ لکھنؤ نے چاہے اعلا درجے کے موسیقی کو رواج نہ دیا ہو، مگر اُس کے سدھارنے اور عام پسند بنانے کا یہ شہر کتنا بڑا زبردست اسکول قرار پا گیا تھا۔

غازی الدّین حیدر ہی کے زمانے میں یہاں اعلا درجے کے قوّالوں کی شہرت تھی۔ چھجّو خاں اور غلام رسول خاں استادِ فن مانے جاتے تھے۔ شوری اتنا بڑا زبردست موجدِ فن تھا کہ ٹپّے کا موجد وہی مانا گیا ہے۔ بخشو اور سلاری اُن دنوں طبلہ بجانے کے استاد مانے جاتے تھے اور اِن کے مقابل کسی کو طبلہ چھونے کی جراُت نہ ہوتی تھی۔

اِس آخر زمانے میں صادق علی خاں سارے ہندوستان میں استادِ بے بدل مانے جاتے تھے۔ چھوٹے اور بڑے منّے خاں کے گانے میں ایسا مزہ اور لطف تھا کہ باوجود کاملِ فن ہونے کے، ناواقف عوام کو بھی اپنے نغمے پر فریفتہ کر لیتے۔

مٹیا برج میں جو ڈھاڑی، واجد علی شاہ کے دربار میں ملازم تھے، اُن سب کو میں نے خود سنا تھا۔ احمد خاں، تاج خاں اور غلام حسین خاں اُس وقت کے زبردست صاحبِ کمال مانے جاتے۔ دُلّی خاں جس نے سارے کلکتے میں اپنی دھوم مچا رکھی تھی، اور اپنے سحر آفریں گلے سے ہر ادنا و اعلا کو فریفتہ کر لیا کرتا، لکھنؤ ہی کا تھا اور لکھنؤ ہی کے اسکولِ موسیقی کا تعلیم یافتہ تھا۔ مرد گویّوں کے علاوہ لکھنؤ میں بعض رنڈیوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے ڈھاڑی ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ زہرہ و مشتری، جو شاعرہ بھی تھیں، گانے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ حیدری نے والی حیدر کو وہ ناموری حاصل ہوئی کہ اُس کے گلے سے سوز سننے کے لیے لوگ محرّم کے انتظار میں دن گِنا کرتے اور محرم میں باہر کے سیکڑوں ہزاروں شوقین لکھنؤ میں آ کے حیدر کے امام باڑے میں گھنٹوں امیدوار بنے بیٹھے رہتے

کہ کب بی حیدری اپنا نغمۂ غم شروع کریں گی۔

طبلہ بجانے میں آخری عہد کا کامل، محمد جی تھا، جس کی سارے ہندوستان میں شہرت تھی۔ تقریباً تیس سال کا زمانہ ہوا، مجھے چوک میں ایک جنٹل مین مرہٹا ملا جو کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور کسی معزز خدمت پر مامور تھا۔ مجھ سے مل کے اُس نے کہا کہ "میں لکھنؤ میں صرف اس شوق میں آیا ہوں کہ یہاں کے باکمالانِ موسیقی کا کمال دیکھوں۔" میں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ کہا: "میں خاندانی گویا ہوں اور میرے باپ دادا سیوا جی کے دربار میں گویے تھے۔ اگرچہ اب انگریزی تعلیم پانے کے بعد نوکری کر لی ہے، مگر اپنے خاندانی فن کو بھی جانتا ہوں۔" اتفاقاً اُس وقت ایک اور صاحب آگئے جو لکھنؤ کی مشہور گانے والی محمدی کے وہاں آتے جاتے تھے۔ بولے: چلیے آپ میرے ساتھ چلیے۔ وہ مرہٹے صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے گئے اور ہم سب محمدی کے وہاں پہنچے۔ اتفاقاً وہاں صادق علی خاں بھی موجود تھے۔ اور سب نے اپنا کمال دکھایا۔ خود وہ مرہٹا بھی گایا۔ اِس کے بعد ہم سب چودھرائن کے وہاں گئے، جو گھر یہاں صاحبانِ فن کا سب سے بڑا کلب سمجھا جاتا ہے۔ وہاں دونوں مِیّنہ خاں بلائے گئے۔ انھوں نے گا کے اپنا کمال دکھایا۔ آخر میں اُس مرہٹے نے کہا: "مجھے تو صرف اتنی تمنا یہاں لائی ہے کہ میں ایک ترانہ گاؤں اور محمد جی میرے ساتھ طبلہ بجائیں۔" فوراً محمد جی بلوائے گئے اور مرہٹے جنٹل مین کے گانے اور محمد جی کے بجانے میں کل حاضرین کو بڑا مزہ آیا۔ سب اَش اَش کر گئے۔ اور آخر میں اُس مرہٹے نے قبول کر لیا کہ میں سب جگہ گیا ہوں، مگر محمد جی سے زیادہ باکمال طبلہ نواز آج تک آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔

لکھنؤ میں موسیقی کو اِس قدر عروج ہو گیا تھا کہ بہ خلاف اور شہروں کے امرا اور دولت مندوں کے، یہاں کے امرا ذوقِ صحیح رکھتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ دُھنوں، راگوں اور

راگنیوں کو پہچانتے ہیں اور دو ہی ایک تانیں سُن کے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ گویا کس پایے کا ہے۔ معمولی گانے والا یہاں کی صحبتوں میں فروغ نہیں پا سکتا۔ بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکوں اور گذرگاہوں میں گاتے پھرتے ہیں، وہ بھی مختلف چیزوں کو ایسے سچے سُروں میں ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے راگنی اور لَے گلے میں اُتری ہوئی ہے۔ اکثر شہروں میں لوگ کثرت سے ایسے ملیں گے جو شعروں کو موزوں نہیں پڑھ سکتے۔ بہ خلاف اِس کے، یہاں آپ کو ایسا جاہل ڈھونڈے نہ ملے گا۔ جو اشعار کو موزوں نہ پڑھ سکتا ہو۔ دلیل ہے اِس بات کی کہ لَے داری یہاں کے بچے بچے کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ بعض اوقات کسی بازاری لڑکے کو بھیروَیں، سوہنی، بھاگ یا کسی اور دُھن میں ایسی خوبی سے گاتے سنا گیا ہے کہ سننے والے محو ہو گئے اور بڑے بڑے گویّوں کو ان پر حسد آنے لگا۔

موسیقی کے سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سازوں اور آلاتِ موسیقی کا بھی حال بیان کر دیں۔

موسیقی میں دو چیزیں ہوتی ہیں: سُر اور لَے۔ اِن دونوں چیزوں میں بگڑنا، گانے کا ناقابلِ عفو عیب ہے۔ لہٰذا اِن دونوں کی نگہداشت کے لیے دو ہی سازوں کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ فی الحال سُر پر رہنے کی مدد کے لیے سارنگی اور لَے پر قائم رہنے کی ضرورت سے طبلہ کام میں لائے جاتے ہیں۔

سُروں کی مدد کے لیے ہندوستان کا پُرانا ساز بین تھی، جس میں ایک مجوّف چوبی نلی کے دونوں سِروں پر دو تونبیاں لگائی جاتیں اور اُس پر ساتوں سُروں کے سات تار کھینچ دیے جاتے۔ جن کا نغمہ نلی کے اندر سے دونوں جانب دوڑ کے دونوں تونبیوں میں گونجتا۔ مسلمان اپنے ساتھ رباب، چنگ اور سرود لائے۔ رباب غالباً عربی باجا تھا۔ جس نے عباسیہ کے دور میں بہت ترقی کی تھی۔ چنگ اور سرود عجمی

باجے تھے۔ اِن میں سے چنگ بہت ہی پُرانا ساز ہے، جس کا سراغ اسیریا، بابل، مصر، یونان اور روم، غرض تمام اگلی قوموں میں لگتا ہے۔ سرود خالص فارسی باجا تھا، جس کو عبّاسی دَور کے مغنّیوں نے اختیار کر کے بہت ترقی دی۔ ہندوستان میں آنے کے بعد جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے نغموں میں میل جول ہوا تو پہلے طنبورہ ایجاد ہوا جو دراصل بین کا اختصار اور صرف سُروں کے قائم رکھنے کا کام دیتا تھا، اور تنہا بجانے کی چیز نہ تھا۔ چند روز بعد امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا جو دراصل بین اور طنبورہ دونوں میں ایک آسان اور عام پسند تصرّف تھا لیکن بین ہو یا طنبورہ یا ستار، گلے کا پورا ساتھ کوئی نہ دے سکتا تھا۔ یہ کمی دیکھ کے محمد شاہ رنگیلے کے دربار کے زبردست و نامور مغنّی میاں سارنگ نے سارنگی ایجاد کی جو اُنھی کی طرف منسوب ہے۔ سارنگی نے بین، طنبورے اور ستار سب کو پیچھے ڈال دیا اور رقص و سرود کی محفلوں میں ایسا رسوخ حاصل کیا کہ ان اگلے سازوں کے بجانے والے بھی فنا ہو گئے۔ اِنھی پُرانے سازوں میں یہاں ایک قانون بھی تھا، جسے یقیناً مسلمان، شام و عراق سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے بجانے والے بھی اب کہیں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ غرض عیش و طرب کی محفلوں سے سارنگی نے ان سب کو نکال دیا اور ان قدیم سازوں کی یہ شان رہ گئی کہ اعلا درجے کے استاد گویّوں میں کبھی کبھی کوئی ایک آدھ نظر آجاتا ہے جسے بین یا سرود، رباب یا قانون کے بجانے میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ ستار نوجوانوں کے تفنّنِ طبع کے لیے رہ گیا، جسے وہ بغیر گانے کے بجاتے اور سنتے ہیں اور اس کے ساتھ کوئی گانے بھی لگتا ہے۔

اب رہا طبلہ، یہ اگرچہ گانے کے لیے بہت ہی لازمی چیز ہے مگر اس قسم کی کسی چیز کا پتا دیگر ممالک کی پُرانی قوموں میں نہ تھا۔ لڑائی میں طبلِ جنگ بجتا۔ نوبت میں نقارہ بجایا جاتا۔ مگر ناچ گانے کے ساتھ سوائے ہندوستان کے اور کہیں

اس قسم کی کوئی چیز اگلے زمانے میں نہ تھی۔ سوا دف کے، جو عربوں میں تھی اور گانے کے ساتھ بجائی جاتی تھی۔ یہاں بھی گانے کے ساتھ سب سے پہلے دف کا رواج معلوم ہوتا ہے، جو بین کے ساتھ بجتی اور لَے کے قائم رکھنے میں مدد دیتی۔ اس کے بعد قدیم الایام ہی میں مردنگ نکلی جو غالباً سری کرشن جی کے زمانے میں موجود تھی۔ اور ان کی بانسری کے نغمے کے ساتھ مردنگ کی گمک بھی جمنا کنارے برج کے جنگل میں سنی جاتی تھی۔ مردنگ کے بعد ترقی یہ ہوئی کہ پکھاوج بنی، جو اعلا موسیقی کا خوب ساتھ دے سکتی تھی۔ اب اُس کے بعد سے عام لوگوں میں اور گھر کی بیٹھنے والی عورتوں میں ڈھول کا رواج ہوا جو مردنگ اور پکھاوج سے نکل کے عام پسند ہو گئی۔ اور خاص باکمالانِ موسیقی کی اعلا محفلوں کے لیے طبلہ ایجاد ہوا جس میں پکھاوج کے دونوں رخ، دو جُدا سازوں میں تقسیم ہو کے، دہنا اور بایاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ طبلہ یقیناً مسلمانوں کے آنے کے بعد کی ایجاد ہے۔ اگرچہ ہمیں نہیں معلوم کہ لے داری کے ان سازوں میں مذکورہ ترقیاں کب اور کس کے ہاتھ سے ہوئیں۔

(۲۳)

موسیقی کے ساتھ ناچ نے بھی ایک ممتاز فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں بہت نمایاں ترقی کی۔ رقص ہر قوم میں تھا اور قدیم سے قدیم زمانے میں تھا۔ فراعنۂ مصر کے سامنے بانکی رسیلی عورتیں کھڑی ہو کے ساز کے ساتھ ناچا کرتی تھیں۔ حضرت مسیح کے عہد میں بپتسمہ دینے والے یوحنا کا سر ہیرودیا نے ناچ ہی کے کٹوایا تھا۔ مگر ہندوستان میں بہت صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی طرح ناچنا بھی عبادت میں داخل تھا اور یہاں فنِ رقص کی پرورش ہمیشہ مذہب ہی کے آغوش میں ہوئی۔ چنانچہ اس فن کے جاننے اور کرنے والے خاص برہمن تھے اور ان کا مرکز یا تو اجودھیا اور بنارس کے کتھک تھے، یا متھرا اور برج کے رہس دھاری۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے

تمام قدیم مندروں میں اگرچہ سیکڑوں ہزاروں عورتیں دیوتاؤں کی مورتوں کے سامنے روز مجرا کیا کرتی تھیں اور جہاں بڑے معبد تھے وہاں قدیم سے قدیم زمانے میں ناچنے والیوں کا ایک بڑا بھاری گروہ بھی موجود رہا کرتا تھا، مگر ناچنے کی استادی ہمیشہ مردوں میں رہی اور وہی جوان عورتوں کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ناچنا دراصل حرکاتِ جسمانی کے باقاعدہ بنانے کا نام ہے۔ حرکات کی اِس باقاعدگی کو اگر بہت سے اشخاص کے حرکات کے موافق یکساں اور موزوں بنانے سے تعلق ہو تو وہ ڈرل یا فوجی قواعد ہے، یا یورپ کے میوزک ہالوں کا وہ ناچ ہے جو "بیلڈ" کہلاتا ہے، اور اب اکثر ہندوستان کے تھیٹروں میں نظر آجایا کرتا ہے۔ اور اگر وہ حرکات کی باقاعدگی، موسیقی کی لَے اور آواز کے نشیب و فراز کے موافق بنانے سے علاقہ رکھے، تو وہ رقص ہے۔ ہندوستان کا اصلی خالص رقص یہی ہے کہ جسم کے حرکات و سکنات، گیتوں اور شعروں کے زیر و بم کے مطابق اور مناسب بنالیے جائیں۔ یہ اصلی ناچ ہے جو ہندوستان میں ایک بہت بڑا وسیع فن بن گیا۔ اس کی سیکڑوں گتیں اور بے شمار توڑے اور ٹکڑے ایجاد ہو گئے۔ اس کے بعد رقص میں جذبات و خیالات کا اشاروں اور حرکتوں سے ادا کرنا بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی گانا، ناچنے کی شرح بن جاتا ہے۔ پھر جب خوبصورت عورتوں کا ناچنا لوگوں کو فطرۃً زیادہ پسند آیا، تو معشوقانہ ناز و انداز دکھانا اور نزاکت و نازنینی کی اداؤں کا ظاہر کرنا بھی اِس کا جز بن گیا۔ لکھنؤ کے اسکول نے انھی امور کا لحاظ کر کے، زنانے اور مردانے طائفوں میں امتیاز پیدا کر دیا۔ نزاکت کے ساتھ بتانا، معشوقانہ ناز و انداز دکھانا اور ہر حرکت میں معشوقیت و نازنینی کا لحاظ رکھنا، ناچنے والی عورتوں کے ساتھ مخصوص رہا۔ جو بعض وقت اگر بے مزہ ہو تو ناظرین کی طبیعتوں کو شُست اور پست کر دیتا ہے۔ اس کے مقابل، حرکات کو لَے کے مناسب بنانے

میں چلت پھرت دکھانا اور شاعرانہ دل کشی سے اظہارِ جذبات کرنا، مردانے طائفوں کے لیے خاص ہو گیا۔ اگرچہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے فن کا ایک مناسب حد تک ضرور لحاظ رکھتے ہیں، مگر یہ امتیاز نمایاں طور پر قائم ہے۔

یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اودھ اور لکھنؤ میں اربابِ نشاط اور مجرا کرنے والی رنڈیوں کے طائفوں کا آ آ کے جمع ہونا، نوّاب شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں انتہائی درجے کو پہنچ گیا تھا۔ ان کے علاوہ اجودھیا اور بنارس کے کتھک جو یہیں یا قریب ہی موجود تھے، قدر دانی دیکھ کے، دربار کے مرکز کی طرف کھنچنے لگے۔ اور دونوں کے میل جول سے رقص کا فن نمایاں ترقی کرتے کرتے یہاں خاص شان پیدا کرنے لگا۔

مرد ناچنے والوں کے یہاں دو گروہ ہیں: ایک ہندو کتھک اور رہس دھاری اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ۔ مگر اصلی ناچنے والے کتھک ہیں۔ اور کشمیری طائفوں نے معلوم ہوتا ہے اپنی نقّالی کے کمالات میں جان ڈالنے کے لیے اپنے گروہ میں ایک ناچنے والا نو عمر لڑکا بڑھا لیا، جو بال بڑھا کے، عورتوں کا سا جوڑا باندھتا ہے، اور نہایت ہی پھرتیلے پن سے ناچ کے، اپنی چلت پھرت سے محفل میں زندہ دلی اور تازگی پیدا کر دیتا ہے۔

ہندو کتھکیوں میں سے کوئی نہ کوئی باکمال ہر زمانے میں یہاں موجود رہا۔ یہ لوگ اپنے فن کا بانی مہادیو جی، پاربتی جی، اور کنھیا جی کو بتاتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد میں خوشی مہاراج ناچنے کا بڑا زبردست استاد تھا۔ نوّاب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور میں ہلال جی، پرکاش جی، اور دیالو جی مشہور ناچنے والے تھے۔ محمد علی شاہ کے زمانے سے واجد علی شاہ کے عہدِ فرماں روائی تک پرکاش جی کے بیٹوں: درگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد کے ناچ کی شہرت رہی۔ درگا پرشاد کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ناچ میں واجد علی شاہ کا استاد تھا۔ اس کے بعد درگا پرشاد کے

بیٹوں: کالکا اور بندادین کی شہرت ہوئی اور قریب قریب تمام لوگوں نے مان لیا کہ سارے ہندوستان میں ناچنے کا ان دونوں سے زیادہ صاحبِ کمال استاد کوئی نہیں ہے۔ پرانے استاد کسی خاص بات میں نمود حاصل کرتے تھے، مگر ان دونوں بھائیوں خصوص بندادین نے ناچ کے تمام فنون میں کمال دکھائے، اپنے آپ کو ہر حیثیت سے استادِ بے بدل ثابت کر دیا۔ اور آج کل کے اکثر مشہور ناچنے والے انھی دونوں بھائیوں کے شاگرد ہیں۔ اور ان کا گھر، ہندوستان بھر کا سب سے بڑا رقص کا اسکول ہے۔

کالکا تھوڑا زمانہ ہوا کہ مر گیا اور سچ یہ ہے کہ اُس کے مرنے سے بندادین کے ناچ کا مزہ اُٹھ گیا۔ بندادین کی عمر اس وقت ۷۷ سال کی ہے اور اب بھی ناچ کے شائق اُس کا مجرا دیکھنے کو اپنی زندگی کی ایک یادگار مسرت تصور کرتے ہیں۔ اُس کا گت پر ناچنا، رقص کے استادانہ توڑے اور ٹکڑے اصلی صورت میں دکھانا، گھونگھرو بجانے میں یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ جے گھونگھرو چاہے بجائے، اور اس کے بعد ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا، ایسی چیزیں ہیں جن کا بندادین ہی پر خاتمہ ہے۔ وہ ایک ایک چیز کو سَو سَو اداؤں، وضعوں، نزاکتوں اور دل فریب اشاروں سے بتاتا ہے، اور اس میں ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی ہے کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ معمول تھا کہ بندادین بتاتا اور کالکا پاس کھڑے ہو کے اُس کی تشریح کرتا جاتا۔ اُس کی تشریح ہی سے لوگوں کو پتا چلتا کہ بندادین اپنے فن میں کیسا کمال دکھا رہا ہے۔ ناچ میں اُس کے پانو اِس نزاکت سے زمین پر پڑتے ہیں کہ مشہور ہے بعض اوقات وہ تلوار کی باڑھ پر ناچا اور مجال کیا جو تلوے میں چرکا آیا ہو۔

(۲۴)

مرد ناچنے والوں کا دوسرا گروہ، بھانڈ ہیں۔ اُن کے مجرے کی شان یہ ہے کہ

ایک نوخیز خوش رُو لڑکا، جس کے بال عورتوں کی طرح لمبے ہوتے ہیں، رنگین اور زرق برق کپڑے پہن کے اور پانو میں گھنگھرو باندھ کے ناچتا گاتا ہے۔ اُس کے ساتھ کا ساز، لَے میں ڈوبا ہوا اور دلوں کو ابھارنے والا ہوتا ہے۔ اُس کے ناچ میں غیر معمولی چلت پھرت اور شوخی و چالاکی ہوتی ہے اور اس کا گانا بھی اسی رنگ اور مذاق کے مناسب ہوتا ہے۔ ساتھ بجانے والوں کے علاوہ سات آٹھ یا اس سے زیادہ بھانڈ رہتے ہیں جو اُس کے ناچ گانے پر واہ واہ کے نعرے بلند کرتے۔ متاثر ہو ہو کے تال دیتے اور اکثر خلافِ تہذیب بے اعتدالیوں سے اُس کے حرکات و سکنات اور اس کی اداؤں پر ہنسانے والے ریمارک کرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں وہ لڑکا تھوڑی دیر گا چکا، وہ سامنے آ کے نقلیں کرتے اور بذلہ سنجی و نقالی کا کمال دکھاتے ہیں۔

لکھنؤ میں اِن لوگوں کے دو گروہ ہیں: ایک کشمیری، جو کشمیر سے آئے ہیں۔ اور دوسرے خاص یہاں کے، جن کا پیشہ ابتداءً کچھ اور تھا، مگر اب نقالی ان کا خاص فن ہو گیا ہے۔

نقالی اور خصوصاً رقص و سرود کے ساتھ نقالی، ہندوستان کا بہت ہی پُرانا فن تھا، جو راجا بکرماجیت کے دربار میں یعنی حضرت مسیح سے پہلے بہت ترقی پر تھا۔ مگر اس وقت اس میں اعلا درجے کے ڈراما دکھائے جاتے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہ بہت ہی مہذب و شایستہ نقالی تھی۔ ہندوستان کی ادنا قوموں کی تقریبوں میں آج تک معمول ہے کہ جب وہ لوگ خود ہی ناچتے گاتے ہیں تو اکثر اس کے ساتھ مضحک نقلیں بھی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے زمانے میں دولتِ مغلیہ سے پہلے بھانڈوں اور نقالوں کا پتا نہیں لگتا۔ ممکن ہے کہ ہوں اور اس دَور کے وقائع نگاروں نے اُن کو قابلِ لحاظ نہ خیال کیا ہو۔ مگر دولتِ مغلیہ کے زمانے میں بھانڈوں نے خاص نمود حاصل

کرلی تھی۔ ان کا پتا اورنگ زیب کے بعد سے ملتا ہے، جب امرا و سلاطینِ دہلی کو ملک گیری و ملک داری کی زحمتوں سے چھٹی مل گئی تھی اور صرف درباری داری و عیش پرستی کو اپنا آبائی حق تصور کرنے لگے تھے۔ مگر دراصل ان بھانڈوں نے یہاں کی سوسائٹی میں عجیب عجیب کام کیے۔ یہی یہاں کے نیشنل سٹائرسٹ ہیں اور انھوں نے قریب قریب وہی کام کیے جو انگلستان میں اسپکٹیٹر اور ٹاٹلر نے کیے تھے۔ دہلی کا سب سے پہلا بھانڈ کریلا مشہور ہے، جو محمد شاہ کے عہد میں تھا۔ کسی بات پر ناراض ہو کے محمد شاہ نے حکم دیا کہ بھانڈوں کو ہمارے ملک سے نکال دو۔ دوسرے دن بادشاہ کی سواری نکلی تو اوپر سے ڈھول بجنے اور بھانڈوں کے گانے کی آواز آئی۔ تعجب سے سر اٹھا کے دیکھا تو کریلا اور چند بھانڈ ایک کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے ڈھول بجا بجا کے گا رہے تھے۔ سواری رکوا کے پوچھا: "یہ کیا گستاخی ہے؟ اور ہمارے حکم کی تعمیل کیوں نہ ہوئی"؟ عرض کیا: "قبلۂ عالم! ساری دنیا تو جہاں پناہ کے زیرِ نگیں ہے، جائیں تو کہاں"! اس جواب پر بادشاہ اور جملہ مصاحبین ہنس پڑے اور اُن کا قصور معاف کیا گیا۔

لکھنؤ میں آنے کے بعد ان لوگوں کی کچھ ایسی قدر ہوئی کہ ان طائفوں کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی قرار پا گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے فی الحال دہلی میں بھانڈ نہیں ہیں۔ اور ہوں تو بہت ہی کم اور گم نام ہیں۔ ہاں بریلی میں پرانے زمانے سے بھانڈوں کے طائفے موجود ہیں۔ اور اکثر لکھنؤ کے ڈوم ڈھاڑی بھی بریلی سے آئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوانینِ روہیل کھنڈ بھی موسیقی اور ارباب نشاط کے قدر داں تھے، جن کی فیاضی سے بریلی و مراد آباد میں ان لوگوں کا نشو و نما اچھی طرح ہوا۔ اور وہاں سے بھی صاحبِ کمال ڈھاڑی اور نقال لکھنؤ میں آئے۔ اگرچہ اب اُن کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی بنا ہوا ہے۔

اِن کے لطیفے، نوک جھونک کے فقرے، اور نقالی کے عجیب کمالات لکھنؤ میں مشہور ہیں۔ نواب سعادت علی خاں کے اشارے سے اُس وقت کے سب سے بڑے بانکے کے سامنے جو چوٹ کرتا ہوا فقرہ ایک بھانڈ نے کہا تھا، اس سے پہلے ہم اپنے ناظرین کو سُنا چکے ہیں۔ اُسی زمانے کا ایک یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ کسی رئیس نے انعام میں دوشالا دیا۔ مگر وہ دوشالا بوسیدہ اور پُرانا تھا۔ ایک نقال نے ہاتھ میں لے کے اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا اور اس پر بہت ہی گہری نظریں جمادیں۔ دوسرے نے پوچھا: دیکھتے کیا ہو؟ کہا: دیکھتا یہ ہوں کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ پوچھا: آخر کیا لکھا ہے؟ عینک نکال کے لگائی اور اٹک اٹک کے بڑی مشکلوں سے پڑھا: لا الٰہ الاّ اللہ۔ پوچھا: بس اتنا ہی؟ محمد رسول اللہ نہیں لکھا؟ جواب دیا: محمد رسول اللہ کیسے لکھا ہو، یہ تو ہمارے حضرت سے پہلے کا ہے۔

لکھنؤ کے ایک نواب صاحب "گڑھیا والے نواب" مشہور تھے۔ اس لیے کہ اُن کے مکان کے قریب ایک گڑھیا تھی۔ اُنھی کے وہاں کسی تقریب میں محفل رقص و سرود تھی۔ ایک بھانڈ گھبرایا ہوا انھی کے سامنے آیا اور سب ساتھیوں سے کہا: اُٹھو اُٹھو، تعظیم کرو۔ سب نے کہا: کس کی تعظیم کریں؟ کوئی ہے بھی؟ بولا: نواب صاحب آئے ہیں۔ اور یہ کہہ کے ایک ہانڈی جو کھولی تو ایک بڑا سا مینڈک اچھل کے بیچ محفل میں بیٹھ گیا اور سب سے کہنا شروع کیا: جلدی اُٹھو، جلدی اُٹھو۔ ساتھیوں نے حیران ہو کے پوچھا: آخر کس کے لیے اُٹھیں؟ کہا: تم نے پہچانا نہیں، آپ گڑھیا کے نواب ہیں۔

اُن لوگوں کی نسبت مشہور تھا کہ جس کے وہاں جاکے ناچتے، اُس کی نقل ضرور کرتے، اور ممکن نہ تھا کہ اُس پر چوٹ نہ کریں۔ اور سچ یہ ہے کہ جیسی جیسی خوب صورتی سے اِن لوگوں نے اُمرا و رؤسا کو سبق دیے ہیں اور اُن کی لغزشوں پر اُنھیں

متنبہ کیا ہے، اور کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اسی طرح نقالی میں جس کی نقل کرتے، اُس کا ایسا مکمل بہروپ بھرتے اور ایسا سچا کیرکٹر دکھاتے کہ لوگ اَش اَش کرجاتے۔ آج کل انگریزوں کی صحبت میں جس طرح "بابوز انگلش" کا مضحکہ اُڑا کرتا ہے، اُن دنوں کایتھوں کی فارسی آمیز اُردو کا مضحکہ اُڑا کرتا تھا۔ اُن کی نقل اور دیوان جی کا کیرکٹر ایسا اعلیٰ درجے کا یہ بھانڈ دکھایا کرتے تھے کہ لوگ محوِ حیرت ہوجاتے۔ یہاں دوسرا کریلا بھانڈ نصیر الدین حیدر کے زمانے تک موجود تھا۔ اس کے بعد سجن، قائم، دائم، رحیمی، نوشاہ، بی بی قدر وغیرہ کی شہرت ہوئی۔ علی نقی خاں مع اپنی بی بی کے جن کا بہت کچھ دور دورا تھا، قائم کی سبیل دیکھنے کو آئے جسے وہ خوب سجتا اور شربت پلایا کرتا تھا۔ ان معزز زائروں کو دیکھتے ہی قائم سامنے آگیا، اور ہاتھ جوڑ کے کہا: خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحب کو قائم رکھے۔ اتنا سخت فقرہ تھا، مگر نواب اور بیگم دونوں کو انعام ہی دیتے بنی۔ قائم کا کمال یہ تھا کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک فقط طرح طرح کے منہ بناتا رہا۔

آخر زمانے میں فضل حسین، کھاونا، بادشاہ پسند، کیا خوب، کے طائفے بہت مشہور تھے۔ اب بھی علی جان غنیمت ہے۔ یہ اُن طائفوں کے ناچنے والوں کے نام ہیں جنھوں نے رقص میں بڑی ناموری حاصل کی تھی اور جواب نہ رکھتے تھے۔

مگر لکھنؤ کی سوسائٹی پر ان سب لوگوں سے زیادہ اثر ڈومنیوں کا پڑ گیا تھا۔ تمام قصبات اور کل شہروں میں شادیوں میں گانے والی میراثنیں اور جاگنیں مدت ہائے دراز سے ہوتی آئی ہیں، جن کی وضع ڈفالیوں کی طرح ہمیشہ یکساں رہی۔ مگر ڈومنیوں نے لکھنؤ میں عجیب نمایاں ترقی کی۔ ڈھول کو چھوڑ کے، انھوں نے رنڈیوں اور مردانے طائفوں کی طرح طبلہ سارنگی اور مجیرے اختیار کیے۔ صرف گانے کی حد سے ترقی کرکے ناچنا شروع کیا۔ اور اسی پر کفایت نہ کی بلکہ بھانڈوں کی طرح زنانی محفلوں

میں نقلیں بھی کرنے لگیں۔ شادی کی تمام رسموں کا وہ سب سے بڑا عنصر بن گئیں اور دولت مند گھرانوں کی بیگموں کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ کوئی محل اور کوئی ڈیوڑھی نہ تھی جس میں ڈومنیوں کا کوئی طائفہ نہ نوکر ہو۔ ان میں سے اکثر گانے اور ناچنے میں بے مثل ہوتی تھیں۔ اور ایسے نور کے گلے پائے تھے کہ زنانی محفلیں، مردانی محفلوں سے زیادہ شان دار اور حد درجہ دل کش و پُرلطف ہو گئیں۔ خصوصاً محفلوں میں ان کی شوخیاں اور جدّت طرازیاں ایسی دل فریب ہوتی تھیں کہ مردوں کو اکثر تمنا رہتی تھی کہ کسی طرح ڈومنیوں کا مجرا دیکھنے کا موقع ملے۔ اس لیے کہ ڈومنیاں مردانی صحبتوں میں گانا ناچنا کسی طرح گوارا نہ کرتی تھیں۔ اب بھی ڈومنیاں کثرت سے موجود ہیں، اور اُسی شان و وضع پر ہیں، مگر کمال اٹھ گیا۔ جیسی جیسی نامی نے دار اور گلے باز ڈومنیاں لکھنؤ میں گزر گئیں، ویسے گوّیے بھی کہیں نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔

(۳۵)

ناچنے کی استادی اگرچہ مردوں ہی میں مخصوص ہے، مگر علی العموم جس وسعت اور تعمیم کے ساتھ گانے والی رنڈیوں نے اس فن کو ترقی دی، مردوں سے ممکن نہیں۔ ناچنے کو عورتوں کے ساتھ خصوصیت اور موزونیت بھی زیادہ ہے۔ یہ چیز ایک حد تک ہندوستان کے ہر شہر میں نظر آئے گی۔ مگر جیسی باکمال ناچنے اور بتانے والی رنڈیاں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں، شاید کسی شہر میں نہ ہوئی ہوں گی۔ آج سے ۴۰ سال پیش تر لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی منصرم والی گوہر نے کلکتے میں جا کے نمود حاصل کی تھی۔ میں نے ایک محفل میں اس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو ایسی خوبی سے بتاتی رہی کہ حاضرینِ محفل (جن میں مٹیا برج کے تمام باکمال ڈھاڑی اور معزز لوگ موجود تھے) اوّل سے آخر تک محوِ حیرت و سکوت تھے، اور کوئی بچہ بھی

نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو۔ زہرہ و مشتری شاعرہ اور صاحبِ کمال گانے والیاں ہی نہیں، بے نظیر رقاصہ بھی تھیں۔ جدّن نے ایک مدت تک زمانے کو اپنے رقص و سرود کا گرویدہ رکھا ہے۔

یہاں کی رنڈیاں عموماً تین قوموں کی تھیں: اول کنچنیاں، جو اصلی رنڈیاں تھیں اور اُن کا پیشہ علی العموم عصمت فروشی تھا۔ دہلی اور پنجاب ان کے اصلی مسکن تھے، جہاں سے ان کی آمد شجاع الدولہ ہی کے زمانے سے شروع ہو گئی۔ شہر کی نامی رنڈیاں اکثر اسی قوم کی ہیں۔ دوسری، چونے والیاں: ان کا اصلی کام چونا بیچنا تھا مگر بعد کو بازاری عورتوں کے گروہ میں شامل ہو گئیں، اور آخر میں انھوں نے بڑی نمود حاصل کی۔ چونے والی حیدر جس کے گلے کا شہرہ تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس کا سا گلا کسی نے پایا ہی نہیں، اسی قوم کی تھی اور اپنی برادری کی رنڈیوں کا بڑا گروہ رکھتی تھی۔ تیسری، ناگرنیاں۔ یہ تینوں وہ شاہدانِ بازار ہیں جنھوں نے اپنے گروہ قائم کر لیے ہیں اور برادری رکھتی ہیں۔ ورنہ بہت سی اور قوموں کی عورتیں بھی آوارگی میں پڑنے کے بعد اسی گروہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔

گویّوں اور ناچنے والوں کے بعد یہاں اسی نوعیت کا ایک اور گروہ بھی ہے، جس کا نشو و نما لکھنؤ میں بہت ہوا اور اسے لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ رہس والے ہیں۔ رہس خاص متھرا اور برج کا فن ہے۔ وہیں کے رہس دھاریوں نے آ کے لکھنؤ کو اس کا شوق دلایا۔

واجد علی شاہ کو جب رہس پسند آیا تو انھوں نے اپنے مذاق اور اپنے خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس تیار کیا۔ اس کو دیکھتے ہی رعایا میں اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو اُن دنوں پریوں کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے، عملی صورت میں دکھائے جائیں۔ پبلک کا یہ رجحان دیکھ کے میاں امانت نے، جو رعایتِ لفظی

میں کمال رکھنے والے ایک مشہور شاعر تھے، اپنی اندرسبھا تصنیف کی جس میں ہندوؤں کی دیومالا میں مسلمانوں کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔

یہ اندرسبھا جیسے ہی شہر میں دکھائی گئی، ہر شخص والہ وشیدا ہوگیا۔ یکایک بیسیوں سبھائیں شہر میں قائم ہوگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا اس قدر رواج ہوا کہ گویّوں اور ناچنے والی رنڈیوں کا بازار چند روز کے لیے سرد پڑگیا۔ اب امانت کے سوا اور بہت سے لوگوں نے نئی سبھائیں بنانا شروع کیں، جن میں اردو شاعری چاہے بگڑتی ہو، مگر زبان منجتی اور پورب کی دیہاتی اور ہندو اہلِ حرفہ کی آبادی میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ اس مذاق نے ڈراما اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی تھی اور اگر چند روز اور شاہی کا دور رہتا تو بہت اچھے اصول پر خالص ہندوستانی ناٹک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا جو بالکل اچھوتی اور ہندوستانی مذاق میں ڈوبی ہوتی۔

مگر یکایک مہذب سوسائٹی کو جس میں پرانی موسیقی گھر کر چکی تھی، ان کھیلوں میں ابتذال نظر آیا۔ فنِ موسیقی کے شوق نے شرفا کو پھر گویّوں اور مجرا کرنے والے طائفوں کی طرف متوجہ کر دیا اور یہ چیزیں جو ناٹک کی شان رکھتی تھیں، عوام الناس اور بازاری لوگوں ہی تک محدود رہ گئیں۔ مگر اگلے ذوق نے شہر میں اس مذاق کو عملی صورت میں دکھانے والا ایک خاص گروہ پیدا کر دیا جن کو آج کل کی اصطلاح میں ایکٹر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہمارے یہ ایکٹر پہلے تو مہذب سوسائٹی کی قدردانی سے زبانِ اردو میں ترقی کرتے جاتے تھے۔ مگر چونکہ ان کا شمار ادنا درجے کے بازاری لوگوں میں رہ گیا ہے، اس لیے وہ مہذب زبان چھوٹ گئی۔ بازاری زبان میں آج کل بھی یہ لوگ بیسیوں طرح کے پرفارمنس دکھاتے ہیں۔

ہمارے ان ایکٹروں کے متنزل ہوجانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ بمبئی کے پارسیوں نے انگریزی مذاق کے تھیٹر کھڑے کیے۔ جن میں سچ یہ ہے کہ نہ فنِ موسیقی

ہی تھا اور نہ صحیح ایکٹ۔ مگر اُن کی صفائی، ترتیب، طلسم نُمائی اور اُن کے زرق برق پردوں نے ہمارے قومی ڈراما کا جو ایک بچّے کی طرح ہنوز گہوارے میں تھا، گلا گھونٹ دیا۔ اعلا سوسائٹی کے لوگ ناٹکوں کی شان داری پر فریفتہ ہو کے صحیح مذاق کو بھول گئے۔

سچ یہ ہے کہ بمبئی کے تھیٹروں نے ہندوستان کو بہ لحاظ فنونِ رقص و سرود کے بے حد نقصان پہنچا دیا۔ سب سے پہلے موسیقی کو تباہ کیا اور ایسی وضع کے بے اصول نغموں کو اختیار کر کے بازاروں میں پھیلا دیا، جن سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اِس کے بعد اس نے ہمارے رقص کو، جو بہت ہی اعلا درجے کا فن تھا، مٹانا چاہا۔ اور اپنے اسٹیج پر ناچ کے نام سے یورپ کے "ڈرل" کو رواج دیا، جس میں چند لڑکے اپنی ترتیب اور وضع بدل کے دل چسپی پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن رہس والوں کا موسیقی اور ایکٹ اگرچہ دونوں ناقص ہیں، مگر وطنی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور قومی مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے چھوڑنے کی نہیں، بلکہ ان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

(۲۶)

موسیقی ہی کے سلسلے میں سوز خوانی کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس نئے مذہبی فن کو گانے بجانے کے خلافِ شرع فنون میں داخل کرنا، بے ادبی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ سوز خوانی ایک خاص قسم کی موسیقی ہی ہے۔ محرّم میں شہادتِ سبطِ اصغر علیہ السّلام کی یاد تازہ کرنا ہندوستان میں خاص شیعوں سے شروع ہوا۔ خصوصاً اُس وقت سے جب کہ مذہبِ اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہاں کے لوگ آ آ کے ہندوستانی دربار میں رسوخ حاصل کرنے لگے۔ تاہم دہلی میں چوں کہ تاج داروں اور شاہی خاندان کا مذہب سنت و جماعت تھا، اس لیے

وہ خاص چیزیں جو شیعوں کی مذہبی معاشرت کے ساتھ مخصوص تھیں، وہاں نشوو نما نہ پا سکیں۔ اِس لیے اُن فنون کی پرورش کا گہوارہ شہرِ لکھنؤ اور اِس کا اگلا شیعہ دربار قرار پا گیا۔

جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا، اُسی طرح موسیقی میں سوز خوانی پیدا کر دی۔ پھر اُن دونوں فنون کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے۔ اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تحت اللفظ خوانی، مرثیوں کا متانت اور بے تکلفی کے ساتھ اِس طرح پڑھنا اور بتا بتا کے سنانا ہے، جس طرح شاعر مشاعرے میں اپنی غزل سناتا ہے۔ اور سوز خوانی، اُن کو پُرسوز و گداز نغمے کے ساتھ سُنانا ہے۔

اصلی اور پُرانی مرثیہ خوانی، سوز خوانی ہی تھی، یعنی مرثیے مجلسوں میں ہمیشہ نغمے کے ساتھ سُنائے جاتے تھے، اور ان کا رواج دہلی ہی نہیں ہندوستان کے ان تمام شہروں میں تھا جن میں شیعہ حضرات آباد تھے۔ مدراس اور دکن تک میں زور و شور سے اس قسم کی مرثیہ خوانی ہوتی تھی اور ڈیڑھ دو سو برس کے تصنیف کیے ہوئے نوحے آج تک موجود ہیں۔ مرثیوں کو شاعروں کی شعر خوانی کے لہجے میں ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے اور اس میں میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ نے جو کمالات دکھائے، اُن کا ذکر ہم شاعری کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔

سوز خوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہر جگہ تھی مگر اس میں بھی لکھنؤ کے سوز خوانوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی اپنے ساتھ مخصوص کر لیا۔ سارے ہندوستان کی اگلی سوز خوانی کا اندازہ اس مثل سے ہو سکتا ہے کہ "بگڑا گویّا، مرثیہ خواں" لکھنؤ نے سوز خوانی کا پایہ اس قدر بلند کر دیا کہ صاحبِ کمال گویّوں کا بازار بھی سوز خوانوں کے آگے سرد پڑ گیا۔

لکھنؤ میں سوزخواں دیگر اہلِ فن کی طرح نواب شجاع الدّولہ کے ساتھ یا اُن کے عہد میں آئے۔ تاریخ فیض آباد میں لکھا ہے کہ شجاع الدّولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ کے محل میں مجلسیں ہوتیں اور جواہر علی خاں خواجہ سرا جو ان کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا، مرثیہ خوانوں کی نوحہ خوانی سنا کرتا۔ مگر اُس وقت تک یہاں کی سوزخوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن مودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنّفِ نغمات الآصفیہ کے استاد تھے، اور باوجود عطائی ہونے کے، فنِ موسیقی میں ایسا کمال[۱] رکھتے تھے کہ دُور دُور تک کہیں اُن کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سنّی المذہب تھے، مگر انھوں نے موسیقی کی خاص خاص دُھنیں سوزوں میں قائم کر کے اپنے شاگردوں کو بتائیں اور اِس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد پڑ گئی۔ اِس کے بعد جب سیّد حیدری خاں کا زمانہ آیا تو اُن کا معمول تھا کہ محرّم میں اپنے مذاق کی مناسب دُھنوں میں نوحہ خوانی کیا کرتے۔ چونکہ وہ بہت بڑے صاحبِ کمال گویّے تھے اور دربار قدرداں تھا۔ اِس کوشش میں اُن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور پتا لگ گیا کہ اگر ترقی دی جائے تو یہ فن جُداگانہ طور پر ایک خاص اور ممتاز شان پیدا کر سکتا ہے۔ موسیقی کی ہزارہا دُھنوں میں سے وہ دُھنیں منتخب کی گئیں، جو اظہارِ حُزن و ملال اور بَین کے

---

[۱] موسیقی میں ان کے کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرہٹوں کی دست بُرد کے زمانے میں وہ میانے میں سوار لکھنؤ سے اٹاوے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں کسی گانو میں گزر ہوا اور سنا گیا کہ اس گانو پر مرہٹے تاخت کرنے والے ہیں۔ کہاروں نے جو بہت دُور سے انھیں لیے چلے آتے تھے یکایک میانہ رکھ دیا اور کہا ہم میں اب آگے چلنے کی طاقت نہیں ہے۔ ہزار کہا گیا کہ یہ مقام خطرناک ہے مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ خواجہ صاحب نے زندگی سے مایوس ہو کے وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی اور بیٹھے بیٹھے کچھ الاپنا شروع کیا اور اس کا کہاروں پر اس قدر اثر پڑا کہ تازہ دم ہو گئے اور اس کی جگہ پہنچا دیا۔

لیے مناسب ہوں، اور وہ صدہا سوزوں میں قائم کی گئیں۔ آخر میں حیدری خاں نے اپنی سوزخوانی سید میر علی صاحب کو سکھادی، جو ایک شریف النسل سید زادے تھے۔ اور انھوں نے مذہبی جوش میں اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی۔ اور اپنے زمانے میں اتنے بڑے صاحبِ کمال مشہور ہوئے کہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں انھوں نے کسی بات پر برہم ہو کے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشاء اللہ خاں نے اپنے موثر شاعرانہ انداز اور تمسخر کی شان سے سفارش کی اور نواب نے دل دہی و قدردانی کے ساتھ انھیں روکا۔

اس کے بعد تان سین کے خاندان کا ایک گویّا ناصر خاں لکھنؤ میں آیا اور چمکا۔ یہاں سوزخوانی کی طرف لوگوں کا توغّل دیکھا تو اُس نے بھی اپنے موسیقی کے کمال کو نوحہ خوانی میں صرف کر کے مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اور اپنے پڑوس کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھا کے، ان کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوزخوانی کی تعلیم دی۔ ان دونوں کا کمال تمام ماسبق استادوں سے بڑھ گیا، اور سوزخوانی میں بے عدیل و نظیر ثابت ہوئے۔ انھوں نے سوزخوانی کو اعلا درجے کا راگ بنادیا ہے۔ یہاں تک کہ موسیقی کے اصلی راگوں کے بول تو اکثر گویّوں تک کو یاد نہیں، مگر ایسے سوز اکثر سوزخوانوں کو یاد ہیں جو راگوں کے بول ہیں جن کو سُن کے حقیقی راگ اور سچی دُھنیں متمائز طور پر سمجھ لی جاسکتی ہیں۔

اِنھی بزرگوں کی وجہ سے لکھنؤ میں سوزخوانی کا فن گویّوں سے نکل کے شرفا میں آگیا۔ اور کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ڈوم ڈھاڑی نہیں، شریف وضیع ہیں، مگر سوزخوانی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ گویّوں کا بازار اُن کے سامنے سرد پڑ گیا ہے۔

فی الحال منجھو صاحب اور دو ایک اور بزرگ سوزخوانی میں ایسا کمال

اور ایسی شہرت رکھتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں ہر جگہ اُن کے استقبال میں شوق کی آنکھیں بچھائی جاتی ہیں۔ اور دیگر بلاد کے لوگوں کی قدر دانی، ماہِ محرم اور عزاداری کے خاص ایام میں ہمیشہ انھیں شائقینِ لکھنؤ کے ہاتھ سے چھین لیا کرتی ہے۔

سب سے زیادہ اثر اس مذاق نے لکھنؤ کی عورتوں پر ڈالا۔ سوزوں کی موثر اور دل کو پاش پاش کر دینے والی دُھنیں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے گلے سے نکلتے ہی صدہا شریف مردوں کے گلے میں اتریں اور اُن کے ذریعے سے ہزارہا شریف شیعہ خاندانوں کی عورتوں کے نور کے گلوں میں اتر گئیں۔ عورتوں کو فطرۃً گانے بجانے کا زیادہ شوق ہوتا ہے اور اُن کے گلے نغموں کے لیے عموماً زیادہ موزوں ہوا کرتے ہیں، یہ با اصول اور باقاعدہ نوحہ خوانی عورتوں میں پہنچی تو اُس میں قیامت کی دل کشی پیدا ہو گئی۔ اور چند روز میں شیعہ ہی نہیں ادنا طبقے کی سنیوں کی عورتوں میں بھی نوحہ خوانی کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ محرم میں، اور اکثر مذہبی عیادتوں کے ایام میں لکھنؤ کے گلی کوچوں میں تمام گھروں سے پُرسوز و گداز تانوں اور دل کش نغموں کی عجیب حیرت انگیز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور کوئی مقام نہیں ہوتا جہاں یہ سماں نہ بندھا ہو۔ آپ جس گلی میں کھڑے ہو کے سننے لگیے، ایسی دل کش آوازیں اور ایسا مست و بے خود کرنے والا نغمہ سننے میں آجائے گا کہ آپ زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ ہندوؤں اور بعض خاص سنیوں کے مکانوں میں تو خاموشی ہوتی ہے، باقی جدھر کان لگائیے، نوحہ خوانی کے قیامت خیز نغموں ہی کی آوازیں آتی ہوتی ہیں۔

تعزیہ داری چوں کہ نوحہ خوانی کا بہانہ ہے، اس لیے سنی اور شیعہ دونوں گروہوں کے گھروں میں نوحہ خوانی کے شوق میں تعزیہ داری ہونے لگی۔ اور سُنی مسلمان ہی نہیں، ہزارہا ہندو بھی تعزیہ داری اختیار کر کے نوحہ خوانی کرنے لگے۔ جس سے

معلوم ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ میں تعزیہ داری کے بہت زیادہ بڑھنے اور فروغ پانے کا زبردست باعث، نوحہ خوانی ہے۔

لکھنؤ میں بعض شریف، شائستہ اور تعلیم یافتہ عورتیں ایسی اچھی سوزخواں ہیں کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوزخواں اُن کے مقابلے میں ہرگز فروغ نہ پا سکتے۔ اس کو بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ میں تال کٹورا کی کربلا میں گیا تھا اور وہیں ایک خیمے میں شب باش ہوا تھا۔ دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دل کش نغمے کی آواز کان میں آئی، جس نے سب دوستوں کو جگا کے بے تاب کر دیا۔ ہم سب اس آواز کے شوق میں خیمے سے نکلے اور دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے، چاندنی کھیت کیے ہوئے ہے، اور اس میں عورتوں کا ایک غول تعزیہ لیے ہوئے آرہا ہے۔ سب بال کھولے اور سر برہنہ ہیں۔ بیچ میں ایک عورت شمع ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ اُس کی روشنی میں ایک حسین، سرو قد نازنین چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کے نوحہ خوانی کر رہی ہے اور کئی اور عورتیں اُس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہیں۔ اُس سناٹے، اُس وقت، اُس چاندنی، اُن برہنہ سر حسینوں، اور اُس پُرسوز و گداز نغمے نے جو سماں پیدا کر رکھا تھا، اُس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ نازک اداؤں کا یہ مجمع جیسے ہی کربلا کے پھاٹک میں داخل ہوا، اُس سرو قامت نازنین نے پرج کی دُھن میں یہ نوحہ شروع کیا:

جب کارروانِ شہرِ مدینہ لُٹا ہوا پہنچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حُسینؑ کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کُھلا ہوا

اِس مناسبِ حالت مرثیے نے یکایک ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہہ ہوتا تھا کہ اِن اشعار کے ذریعے سے وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے یا خود اپنے اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی۔

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی عورتوں اور اُن کے ساتھ مردوں پر بھی سوزخوانی و عزاداری نے جو نمایاں اثر ڈالا ہے، اور کسی چیز نے نہیں ڈالا۔ اس کی پہلی برکت تو یہ ہے کہ تمام عورتیں بہت اچھی گلے باز ہو گئیں اور موسیقی کے سچے اصول کے ساتھ نوحہ خوانی کرنے لگیں۔ دوسری برکت یہ ہے کہ سارے اہلِ شہر کو، عام اس سے کہ مرد ہوں یا عورت، موسیقی کے ساتھ مناسبت ہو گئی۔ یہ جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ادنا درجے کے لڑکے اور بازاری لوگ اکثر چلتے چلتے گانے لگتے اور گانے میں ایسی گلے بازی کرتے اور مشکل سے مشکل دُھنوں کو اس آسانی سے اُڑا لیتے ہیں کہ باہر کے لوگوں کو حیرت ہو جاتی ہے، اس کا اصلی باعث یہ نوحہ خوانی و سوزخوانی کا مذاق ہے۔ اور تعریف کی بات یہ ہے کہ سوزخوانی کا نشو و نما باوجود عوام النّاس اور ادنا درجے کے جہلا میں پھیلنے کے، صحیح اصول پر رہا اور موسیقی کے صحیح مذاق سے باہر نہیں ہونے پایا۔ بہ خلاف اور چیزوں کے، جو عوام میں پہنچتے ہی بے قاعدہ اور خراب ہو جایا کرتی ہیں۔

سوزخوانی کو گو کہ عوام شیعہ موجبِ ثواب تصوّر کرتے ہیں، مگر علمائے شیعہ نے اِس وقت تک اُس کے جواز کا فتوا نہیں دیا ہے۔ وہ پابندیِ شرع میں متشدد ہیں۔ اب تک مجتہدین اور ثقہ لوگوں کی مجلسوں میں صرف حدیث خوانی یا تحت اللفظ خوانی ہوتی ہے۔ اور عوام کی جن مجالس میں علمائے شریعت شریک ہوتے ہیں، اُن میں بھی اُن کے سامنے سوزخوانی نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سوزخوانی نے اپنی عام مقبولیت کی وجہ سے علما کے فتووں پر پوری فتح پالی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اہلِ سنّت کے علمائے حدیث اور مشائخِ صوفیہ کے نزدیک تو غنا کے جواز کی بہت گنجایش ہے، مگر شاید فقہِ اثنا عشری میں اتنی گنجایش نہیں۔ ورنہ اِس فن نے اب تک سندِ جواز حاصل کر لی ہوتی۔

(۳۷)

ارباب نشاط اور فنِ موسیقی اور اِس سے نکلے ہوئے فنون کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں لیکن اِسی سلسلے میں بازاری باجوں کا حال بیان کرنا باقی ہے۔ لہٰذا آج ہم یہ بتاتے ہیں کہ اِن باجوں پر لکھنؤ کا کیا اثر پڑا۔ اور اسی پر ہم موسیقی کی بحث ختم کردیں گے۔ باجوں کے جوڑ جو شادی وغیرہ کے جلوسوں کے ساتھ جاتے ہیں، چھے طرح کے ہیں: (۱) ڈھول تاشے (۲) روشن چوکی (۳) نوبت (۴) ترہی اور قرنا (۵) ڈنکے اور نگل (۶) انگریزی باجا جو ارگن باجا کہلاتا ہے اور روز بہ روز زیادہ رواج پاتا جاتا ہے۔

پہلا یعنی ڈھول تاشا، ہندوستان کا قدیم نیشنل باجا ہے جس کا انگریز "انڈین ٹام ٹام" نام رکھ کے، اپنی عدمِ واقفیت اور جہالت سے مضحکہ اڑاتے ہیں ۱۸۹۶ء میں جب انگلستان کی نمایش گاہ "آرلس کورٹ" میں ہندوستانی معاشرت اور یہاں کے فنون و مشاغل کے صد ہا نمونے دکھائے گئے تھے تو وہاں اس باجے کا نمونہ میں نے خود اپنی آنکھ سے یہ دیکھا کہ ایک نہایت ہی سیاہ فام شخص جس کے بدن پر سوا ایک میلے لنگوٹے کے کچھ نہ تھا، عام مجمع میں برہنہ آکے کھڑا ہوجاتا، اِس کے گلے میں ایک ڈھول ہوتی، اور وہ نہایت ہی وحشیانہ طریقے سے بغیر کسی لَے اور ترتیب کے، مجنونوں کی طرح سر ہلا ہلا کے زور زور سے ڈھول کو لکڑی سے پیٹنے لگتا۔ اور کہا جاتا کہ یہی ہندوستان کا باجا "ٹام ٹام" ہے۔ مگر یہ ان لوگوں کی جہالت اور بے عقلی ہے۔ یہ بہت ہی مکمل باجا ہے اور اس کا بجانا ایک باقاعدہ فن ہے جس میں نہایت اعلا درجے کی لَے رکھی گئی ہے۔

اِس میں لکھنؤ میں عموماً دو اور کبھی تین تین چار چار بڑے ڈھول ہوتے ہیں۔ اور

کم سے کم ایک ورنہ دو تین تاشے والے ہوتے ہیں، اور کم سے کم ایک جھانجھ والا ہوتا ہے
جھانجھ کا پتا ایران وغیرہ میں بھی چلتا ہے۔ اور تاشے، مصر وغیرہ میں بھی مروّج ہیں۔
مگر ڈھول خالص ہندوستان کی چیز ہے۔ لکھنؤ میں یہ باجا فوجوں اور خوش باشوں کے
ساتھ دہلی سے آیا۔ مگر دہلی میں اس کے جوڑ میں صرف ڈھول اور جھانجھیں تھیں۔ تاشے
لکھنؤ میں بڑھائے گئے۔ اور رواج پاتے ہی اس قدر ضروری اور اہم نظر آئے کہ معلوم
ہوا جیسے ان سے اس باجے میں جان پڑ گئی۔ اگرچہ اکثر شہروں میں صرف ڈھول
اور جھانجھیں ہی ہوتی ہیں، مگر لکھنؤ میں تاشے جزو لازمی ہو گئے ہیں۔ اور بغیر ان کے
ڈھول کہیں بجتی ہی نہیں ہیں، مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس باجے میں سب سے
زیادہ کمال وہی شخص دکھاتا ہے جو تاشا بجاتا ہے۔ وہی لَے قائم کرتا ہے۔ اور لَے
میں اُس کی پیروی ڈھول والے کرتے ہیں۔ تاشا بجانے کی یہ صفت ہے کہ اتنی جلدی
جلدی ضربیں پڑیں کہ ایک قرعے کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکے۔ اور ان متواتر و
مسلسل قرعوں سے نشیب و فراز یا زیر و بم سے لَے اور گت پیدا ہو۔ لکھنؤ میں اس
باجے کے بجانے والے ایسے ایسے استاد تھے کہ انھوں نے اس معمولی باجے کو، جو
سب جگہ بے اصول تھا، بہت ہی باقاعدہ بنا دیا۔ اور اب بھی یہاں ایسے چابک
دست بجانے والے پڑے ہیں کہ ان کے سامنے کسی شہر کے ڈھول بجانے والے
نہیں بجا سکتے۔

لکھنؤ میں چہلم کے بعد ایک تعزیہ اُٹھتا ہے جو بخشو کا تعزیہ کہلاتا ہے۔ اب
تو اس کے جلوس نے شیعوں، سنّیوں کے جھگڑے کی وجہ سے دوسری صورت
اختیار کر لی ہے، مگر دس بارہ برس پہلے اس کی شان یہ تھی کہ چونکہ شاہی کے ایک
پُرانے مُحبِّ اہلِ بیت کی یادگار تھا، اور اب اُس کے اٹھانے والے غریب و
بے سر و سامان لوگ تھے، اس لیے ہر قسم کے باجوں کے بے نظیر و بے بدل استاد

ثواب سمجھ کے شریک ہوتے اور ثواب کے بہانے اپنے اپنے فنون کا کمال اہلِ شہر کو دکھاتے۔ اور اسی وجہ سے اُن کا معمول تھا کہ جہاں کھڑے ہو گئے، قدر دانوں نے گھیر لیا، اور وہ گھنٹوں اُسی جگہ کھڑے اس بات کا دعوا کر رہے ہیں کہ کوئی ہے جو ہمارے سامنے آ کے بجائے؟ بڑے بڑے استاد گویّے اُن کی داد دیتے اور وہ جوش میں آ کے اور زیادہ خوبی سے بجاتے۔ خصوصاً اُن میں تاشا بجانے والے بڑے استاد ڈھاڑی ہوتے جو موسیقی میں کمال رکھتے اور گتوں میں جدّتیں پیدا کرتے۔

ڈھول تاشا بجانے کے فن کے اہم اور با اصول ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ آخری معزول تاج دارِ اودھ واجد علی شاہ کو جو موسیقی کے استادِ بے بدل تھے، میں نے کلکتے میں اپنی آنکھ سے دیکھا کہ محرّم کی ساتویں تاریخ، جب مہندی کا جلوس اُن کی آسمانی کوٹھی سے روانہ ہوتا، تو وہ خود گلے میں تاشا ڈال کے بجاتے۔ بڑے بڑے گویّوں کے گلوں میں بڑی بڑی ڈھولیں ہوتیں۔ معززینِ دربار گرد حلقہ باندھے ہوتے، اور وہ ایسی نزاکت اور خوبی سے تاشا بجاتے کہ ناواقف سننے والے بھی اَش اَش کر جاتے۔ اور گویّوں کی واہ واہ تو ہمارے مشاعروں کے ہنگاموں کو بھی مات کر دیتی۔ اسی طرح میں نے اُنھیں کئی بار ڈھول بجاتے بھی دیکھا۔

بہ ہر حال، ہندوستان کے اس قدیم ترین باجے میں بھی لکھنؤ کی سوسائٹی نے اپنا تصرّف کیا اور ایسا تصرّف کیا جو نہایت ہی مقبول اور ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص آ کے یہاں کے تاشہ نوازوں کا کمال دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کس قدر مناسب تصرّف ہے اور اس نے ڈھول اور جھانجھ کو کس قدر اہم بنا دیا ہے۔

دوسرا جوڑ روشن چوکی کا ہے۔ روشن چوکی بہت پُرانا باجا ہے اور اگر کُل نہیں تو اُس کے اہم ترین اجزا کو مسلمان اپنے ساتھ لائے، کیونکہ شہنائی اُس کا اہم جز ہے اور اس کی نسبت مشہور ہے کہ شیخ الرئیس ابنِ سینا کی ایجاد ہے۔ بالکل

انسان کے گلے کی طرح جس قدر سچّے سُر گلے بازی کے اعلاترین کمال کے ساتھ شہنائی سے ادا ہوتے ہیں، اور کسی باجے سے نہیں ادا ہو سکتے۔ روشن چوکی میں کم از کم دو شہنائی نواز ہوتے ہیں۔ اور ایک طبلچی جس کی کمر میں چھوٹے چھوٹے دو طبل بندھے ہوتے ہیں۔ طبل، لے کو قائم رکھتے ہیں۔ ایک شہنائی نواز اصلی سُر قائم رکھنے کے لیے سُر دیتا رہتا ہے اور ایک آواز کی چلت پھرت اور گلے بازی کی مشق دکھاتا ہے۔ اور یہی اصلی شخص ہوتا ہے جو غزلوں یا ٹھمریوں وغیرہ کو عجب دلکش سُروں میں ادا کرتا ہے۔

روشن چوکی ہندوستان کا خاص درباری باجا تھا جو بادشاہوں اور اعلاترین امرا کے خاصے کے وقت بجا کرتی۔ رات کو آرام کے وقت روشن چوکی شاہی قصر کے گردِ گشت کیا کرتی اور اُس کا نغمہ دُور سے بہت ہی لطف دیتا۔ دولتِ مغلیہ میں یہ بہت ہی اہم اور لطیف باجا خیال کی جاتی۔ اور دہلی میں خدا جانے کب سے مروّج تھی۔ یقیناً لکھنؤ میں روشن چوکی بجانے والے دہلی سے آئے ہوں گے مگر اس کے صاحبِ کمال ان اطراف میں بھی مدت سے موجود تھے۔ بنارس کے اکثر مندروں میں آج تک صبح کو روشن چوکی بجا کرتی ہے، اور تڑکے منہ اندھیرے کہیں قریب جا کے سنیے تو بہت ہی لطف آتا ہے۔

لکھنؤ میں علی العموم شادی کے جلوسوں میں روشن چوکی بجانے والے دولھا کے قریب رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوؤں کی براتوں میں راستے بھر قدم قدم پر انھیں انعام دیا جاتا ہے۔ روشن چوکی بجانے والے میرے خیال اور تجربے میں لکھنؤ سے اچھے آج کل کہیں نہ ملیں گے۔ جس قدر لے داری اور ہر چیز کو دلکش دُھنوں میں سچّے سُروں کے ساتھ اہلِ لکھنؤ ادا کر لیتے ہیں، اور کسی مقام کے روشن چوکی نواز نہیں ادا کر سکتے۔ اُن کے کمال اور فن دانی کا اندازہ اُس وقت ہو سکتا ہے، جب کوئی شوق سے سنے اور داد دیتا جائے۔ اُسی بخشو کے تعزیے میں، جس کا ذکر آچکا ہے، روشن چوکی بجانے والے بھی اپنا کمال دکھاتے اور اس طرح

جان توڑ کے کوشش کرتے تھے کہ پھر اُن کے بعد اور کسی کی شہنائی میں مزہ نہ آتا۔

تیسرا جوڑ نوبت کا ہے۔ یہ ہمارے پُرانے نغمہائے طرب میں سب سے زیادہ عالی شان بینڈ ہے۔ اس میں دو تین شہنائی نواز ہوتے ہیں، ایک نقارہ بجانے والا ہوتا ہے، جو دو بہت بڑے بڑے عظیم الشان نقاروں کو اپنے آگے خمیدہ رکھ کے، دونوں کو ایک ساتھ چوبوں سے بجاتا ہے۔ اِن نقاروں کی آواز بہت بڑی ہوتی ہے اور گرد کی فضا میں بہت دُور تک گونجتی ہے۔ اور ساتھ ہی ایک جھانجھ والا بھی رہتا ہے۔

نوبت بھی تاریخی باجا ہے اور اظہارِ شوکت کے لیے مدتوں کام میں لایا جاتا رہا ہے۔ تاریخِ اسلام میں ہمیں دمشق و بغداد و مصر کے درباروں میں بھی اس کا پتا لگتا ہے۔ بغداد میں عباسیہ کے درمیانی دَور میں ہر امیر کی ڈیوڑھی پر نوبت بجا کرتی تھی اور موجبِ احترام و عظمت تصوّر کی جاتی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہ ہندوستان میں آئی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان میں پہلے سے موجود ہو۔ اور گو کہ شہنائی نہ تھی، مگر خالی نقارہ اور جھانجھ بجتی ہو۔ لیکن اس کی موجودہ صورت وہی ہے۔ جو ایران و عراق میں مرتّب ہونے کے بعد یہاں آئی۔

بادشاہوں اور عالی مرتبہ امیروں کے جلوس اور لشکر کے ساتھ نوبت بہت ہی لازمی شے تھی۔ اولوالعزم تاج داروں کے جلوس کے آگے آگے ہاتھیوں پر نوبت بجتی جاتی۔ لڑائیوں میں غالب آنے والا گروہ اپنی فتح مندی اور غلبے کے اظہار کے لیے زور شور سے نوبت بجوایا کرتا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے حیدر آباد کو فتح کرکے، اُس کے قریب ایک پہاڑی پر نوبت بجوائی تھی، جو آج تک نوبت پہاڑ کہلاتی ہے۔ دولتِ مغلیہ میں دربار کے اعلاترین طبقے کے رئیسوں اور عہدے داروں کو بادشاہ کی طرف سے نوبت کا حق دیا جاتا، جو اپنی ڈیوڑھیوں اور نیز اپنی سواری

میں نوبت بجوایا کرتے۔ نوبت بجانے والوں کے لیے کوئی بلند برج منتخب کیا جاتا۔ چنانچہ اکثر شاہی محلوں کے پھاٹکوں کے اوپر نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے، جس کے نمونے ہر بڑے شہر میں، جہاں کوئی بڑا دربار رہ چکا ہو، نظر آتے ہیں۔

اِسی قدیم رواج کی پیروی میں لکھنؤ میں آج تک معمول ہے کہ جس دولت مند شخص کے وہاں شادی یا کوئی خوشی کی تقریب ہوتی ہے، تو اس کے دروازے پر لمبی لمبی بلّیاں کھڑی کر کے اور سُرخ کپڑے اور پنّی وغیرہ سے منڈھ کے، عارضی طور پر ایک بلند نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے۔

دن بھر، ٹھہر ٹھہر کے، مختلف اوقات میں، بار بار نوبت بجایا کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، جب براتیں یا تعزیوں کے جلوس چلتے ہیں، اِسی قسم کے مصنوعی نوبت خانے جو تختوں پر بنا لیے جاتے ہیں، کہاروں کے کندھوں پر سب کے آگے آگے چلا کرتے ہیں اور راستے بھر اُن پر نوبت بجتی جاتی ہے۔

یہی نوبت اگلے دنوں خصوص لکھنؤ کے دربار میں وقت پہنچاننے کا ذریعہ قرار پا گئی تھی۔ اُن دنوں وقت کی تقسیم یہ چوبیس گھنٹوں کی نہ تھی جو اب انگریزی گھڑیوں کے رواج سے ہم میں مروّج ہو گئی ہے۔ اُن دنوں وقت کی تقسیم کا یہ حساب تھا کہ دن اور رات کے آٹھ پہر ہوتے ہیں۔ چار پہر دن کے اور چار پہر رات کے۔ اور ہر پہر کی آٹھ گھڑیاں ہوتیں۔ ہر نوبت خانے میں ایک پتیلے یا ناندے میں پانی بھرا رہتا۔ اُس میں کٹورا جس کے پیندے میں ایک باریک سا سوراخ ہوتا تھا، خالی کر کے ڈال دیا جاتا۔ وہ پانی پر تیرتا رہتا تھا۔ اُس سوراخ سے آہستہ آہستہ اُس میں پانی آتا رہتا تھا۔ اور وہ سوراخ ایسا اندازہ کر کے بنایا جاتا تھا کہ ایک گھڑی بھر میں پانی سے بھرتے بھرتے ڈوب جائے۔ پہر شروع ہونے کے بعد جب پہلی مرتبہ کٹورا ڈوبتا، تو ایک گھڑی بجائی جاتی۔ جب دوبارہ ڈوبتا، دو گھڑیاں بجائی جاتیں،

اسی طرح مسلسل آٹھ گھڑیاں بجائی جاتیں۔ اور آٹھویں گھڑی کے ساتھ گجر بجایا جاتا۔ یعنی پہلے ممتاز طور پر آٹھ ضربیں بجا کے گھڑیال پر ایک ساتھ بہت سی بے شمار ضربیں جلدی جلدی لگا دی جاتیں جس میں یہ اشارہ تھا کہ پہر پورا ہوگیا۔ اور گھڑیوں کا سلسلہ پھر ایک سے شروع ہو جاتا۔

جن ڈیوڑھیوں پر نوبت ہوتی، وہاں ہر پہر کے خاتمے پر تقریباً ایک گھڑی تک نوبت بجتی رہتی۔ اس طریقے سے رات دن کے آٹھ پہروں کی آٹھ نوبتیں ہوئیں مگر معمول یہ تھا کہ صرف سات ہی نوبتیں بجا کرتیں۔ پہلی نوبت تڑکے نماز کے وقت یعنی پہلے پہر کے آغاز پر بجتی اور صبح کی نوبت کہلاتی۔ دوسری اس وقت جب کہ ایک پہر دن چڑھ جاتا۔ یہ پہر دن چڑھے کی نوبت کہلاتی۔ تیسری جب آفتاب نصف النّہار پر ہوتا۔ یعنی ٹھیک بارہ بجے۔ یہ دوپہر کی نوبت کہلاتی۔ اس کے بعد جب آٹھ گھڑیاں پوری ہو جاتیں تو تیسری نوبت بجتی اور یہ تیسرے پہر کی نوبت کہلاتی۔ اس کے بعد چوتھا پہر ختم ہونے پر مغرب کے وقت نوبت بجتی اور یہ شام کی نوبت کہلاتی۔ اس کے بعد جب پانچواں پہر پورا ہو جاتا تو پانچویں نوبت بجتی جو پہر رات گئے کی نوبت کہلاتی۔ پھر جب چھٹا پہر گزرتا تو چھٹی نوبت بجتی جو آدھی رات یا دوپہر کی نوبت کہلاتی۔ اس کے بعد جب ساتواں پہر پورا ہوتا اور رات کے تین پہر گزر جاتے تو اس وقت لوگوں کے آرام میں خلل نہ پڑنے پانے کے خیال سے نوبت نہ بجائی جاتی۔ صرف گجر بجا دیا جاتا۔ پھر اس کے بعد آٹھویں پہر کے خاتمے پر صبح کی نوبت بجتی۔

اوقات کا یہ حساب تھا جو دربارِ مغلیہ میں اور نیز انتزاعِ سلطنت تک لکھنؤ میں مروّج رہا، اور کلکتے میں جب تک واجد علی شاہ زندہ رہے، اسی حساب سے پہر اور گھڑیاں بجتی رہیں۔ مگر اتنے ہی دنوں میں وہ حساب اس قدر مفقود ہو گیا کہ اب

شاذ و نادر ہی کوئی شخص ہوگا جو پہروں اور گھڑیوں کا حساب جانتا ہو۔ مگر خرابی یہ ہے کہ باوجود شب و روز کی تقسیمِ اوقات کے بدل جانے کے، اگلا حساب ہماری زبان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ ہم کہتے ہیں: گھڑی بھر میں آؤں گا۔ دو پہر کو سوؤں گا۔ پہر دن چڑھے کھانا کھاؤں گا۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ پہر کتنا ہوتا ہے اور گھڑی کسے کہتے ہیں۔ ہم عموماً سنا کرتے ہیں کہ "پہرا بیٹھ گیا" اور "پہرے کے سپاہی"۔ مگر نہیں جانتے کہ پہرے کا لفظ اسی پہر سے نکلا ہے۔ اِس لیے کہ اُن دنوں پہر پہر بھر کی نوکری ہر ایک کو دینا پڑتی تھی۔

تقسیمِ اوقات کا یہ پُرانا حساب ہندوؤں کا ہے مگر ایران میں بھی اگلے دنوں یہی حساب مروّج تھا اور اسی حساب سے نوبت بجا کرتی تھی۔ ہمارے موجودہ حساب سے ایک پہر، تین گھنٹوں کا ہوا کرتا تھا۔

نوبت نواز بھی لکھنؤ میں ایسے اعلا درجے کے تھے کہ ہر جگہ اور ہر شہر میں یہیں سے جایا کرتے۔ یا یہاں کے اُستادوں کے شاگرد ہوتے۔ لیکن نوبت میں کوئی ترقی یا اضافہ نہیں ہوا۔ بجانے والوں کی تعداد وہی رہی۔ باجے وہی رہے اور بجانے کا طریقہ وہی رہا۔ پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ لکھنؤ کے اسکولِ موسیقی نے جن چیزوں اور جن دُھنوں کو منتخب کر کے عام سوسائٹی میں مقبول کرا دیا تھا، وہی دھنیں اور چیزیں، نقار خانوں میں بھی سنی جانے لگیں۔ مگر باوجود اس کے نوبت بجانے کا جو قدیم طریقہ تھا، وہ بھی اپنی حد پر قائم رہا۔ امیر خسرو نے اپنے زمانے کی نوبت نوازی کی جو تصویر اپنی نظم میں دکھائی ہے، اِس سے اُس وقت کی نوبت بجنے کے طرز کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہی طرز آج تک مروّج ہے، اور اُس میں بہت کم فرق آیا ہے۔ لیکن اِس پر بھی شہنائی سے جو دُھنیں اور گت بجاتے ہیں، اُن پر لکھنؤ کی موسیقی کا جو کچھ اثر پڑا ہے، وہ سنتے ہی نظر آ جاتا ہے۔

ترھئی اور قرنا ہندوستان کے بہت پُرانے قومی باجے ہیں، جن کو فوجوں کے ساتھ زیادہ خصوصیت تھی۔ ترھئی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ اور اُن کے ورود کے ابتدائی دور میں رواج پا گئی۔ مگر قرنا خاص ایرانی باجا ہے اور اُس کی آواز میں کچھ ایسا رُعب وداب ہے کہ میدانِ جنگ میں رُعب بٹھانے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اِن دونوں باجوں کا بھی لکھنؤ کے جلوسوں میں رواج ہے۔ لیکن مستقل باجے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ فوجی دستوں یا پلٹنوں کے ساتھ ایک ترھئی نواز یا قرنا نواز رہا کرتا ہے، جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا باجا بجا کے، اپنے گروہ کی موجودگی کی اطلاع دے دیا کرتا ہے۔ اِن دونوں باجوں کے مقابل ہندوؤں کا قدیم باجا نرسنگھا ہے جو اکثر ہندوؤں کے مذہبی جلوسوں کے ساتھ بجا کرتا ہے۔ یہ باجے دہلی سے آئے، اور جیسے تھے ویسے ہی رہے اور شاید ان میں ترقی کی گنجایش بھی نہیں ہے۔

بگل اور ڈنکا جو فی الحال لکھنؤ کے شادی کے جلوسوں میں نظر آیا کرتا ہے، وہ در اصل اگلے اور پچھلے باجوں کا ایک مبتذل مجموعہ ہے۔ ڈنکے سے مراد وہ نقارہ ہے جو اگلے دنوں فوجوں اور زبردست فاتحوں کے ساتھ گھوڑے پر رہا کرتا تھا، اور اُس پر چوب پڑتے ہی لوگوں پر ایسا رُعب پڑتا کہ بڑے بڑوں کے کلیجے دہل جایا کرتے تھے۔ بگل یا بیوگل انگریزی فوج کا وہ باجا ہے جس کے ذریعے سے فوج کو حسبِ ضرورت نقل و حرکت اور دوسرے کاموں کا حکم دیا جاتا۔ لہٰذا اب ڈنکے کے ساتھ بگل کو شریک کرکے ایک نیا جوڑ بنا لیا گیا جو شادی کے جلوسوں کے ساتھ نظر آیا کرتا ہے۔ مگر چوں کہ یہ کرایے کے اور بہت ہی مبتذل حالت کے لوگ ہوتے ہیں، اِس لیے اِن کا لباس، اِن کے گھوڑے، اور خود ان کی صورتیں ایسی ذلیل و خوار ہوتی ہیں کہ ان سے بجائے رونق کے، اور ابتذال اور ایک

شرم ناک منظر پیدا ہوجاتا ہے۔

اب سب کے آخر میں اور سب سے زیادہ ترقی پذیر باجا، انگریزی باجا ہے۔ یہ خالص انگریزوں کا لایا ہوا ہے جو اُن سے پیشتر مطلقاً نہ تھا۔ لکھنؤ میں خدا جانے کیوں، مگر اِس کے بجانے والے صرف مہتر ہی ہیں، جو پاخانے صاف کرنے کے علاوہ اِس کام کو بھی کرتے ہیں۔ غالباً اِس کی وجہ یہ ہو کہ ابتداءً ہندو مسلمان دونوں گروہوں کو عیسائیوں سے ایسی سوشل نفرت تھی کہ اگر وہ کسی برتن کو ہاتھ لگا دیتے تو ہمیشہ کے لیے چھوت ہو جاتا۔ اور اِس باجے کو انگریزوں سے سیکھنا اور اُسے منہ لگانا پڑتا، اِس لیے سوا مہتروں کے اور کسی کو اس کے اختیار کرنے کی جُرأت نہ ہوئی۔ بہ ہر حال اب قریب قریب یہ مہتروں کا لازمی پیشہ ہو گیا ہے۔

چوں کہ اِس کام کو یہاں ایک ایسے گروہ نے اختیار کیا جو سب سے زیادہ ذلیل وخوار ہے، اور جسے موسیقی سے بالکل مس نہیں، اِس لیے امید نہ تھی کہ اس فن میں یہاں ذرا بھی ترقی ہو سکے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ مہتروں ہی میں ترقی کا شوق پیدا ہوا، اور چونکہ شہر کی سوسائٹیوں میں ہندوستانی موسیقی کی دُھنیں پھیلی اور مذاق میں سرایت کی ہوئی تھیں، اس لیے مہتروں کو مجبور ہونا پڑا کہ اس مغربی ارغنون میں اپنی دُھنوں کو ادا کریں۔ انگریزوں یا انگریزی بجانے والے فوجی سپاہیوں سے انھوں نے صرف یہ حاصل کیا تھا کہ انگریزی باجوں کا بجانا آجائے یا دو چار مغربی موسیقی کی دُھنیں سیکھ لی ہوں گی۔ لیکن اب انھوں نے ہندوستانی دُھنوں میں مروجہ چیزوں کو بجانا شروع کیا تو روز بہ روز اس میں ترقی ہی کرتے گئے۔

انگریزی باجا ہیں نے ہر جگہ سُنا ہے اور سب جگہ وہی انگریزی کی چیزیں بجائی جاتی ہیں جن کو انھوں نے اپنے انگریزی بینڈ ماسٹروں سے سیکھ لیا ہے۔ یہ کہیں نہ نظر آیا کہ اس باجے کو، بجانے والوں نے ہندوستانی موسیقی کے سانچے میں ڈھال لیا۔

ہو۔ یہ بات اگر غور سے دیکھیے تو لکھنؤ ہی میں نظر آئے گی کہ جن غزلوں یا ٹھمریوں کو روشن چوکی والے شہنائی سے ادا کر رہے ہیں، انھیں چیزوں کو انگریزی باجے والے اپنے باجوں سے ادا کر رہے ہیں۔ اور ایسی خوبی سے کہ خواہ مخواہ سننے کو جی چاہتا ہے۔

انگریزی باجے کے بینڈ، مہتروں کی مستعدی سے لکھنؤ میں سیکڑوں قائم ہو گئے ہیں، جن میں سے بعض ایسے ہیں کہ اُن میں پچیس پچیس تیس تیس بجانے والے ہوتے ہیں، اور بعض میں چھ سات یا چار ہی پانچ۔ اُنھوں نے گوروں کی وردیوں میں ہندوستانی مذاق کے مطابق تصرّف کر کے، اپنے لیے رنگ رنگ کی وردیاں بھی بنالی ہیں۔ اور اگر وہ وردیاں صاف اور نئی ہوں، تو اُن کو پہن کے جب وہ برات کے ساتھ ارگن بجا بجاتے ہوئے چلتے ہیں تو بہت اچھے اور بہت شان دار معلوم ہوتے ہیں۔

وردی کی خصوصیت اِنھی لوگوں میں ہے۔ اور قسم کے باجے والوں کو کبھی اِس کا خیال نہ آیا کہ اپنے لیے کوئی وردی ایجاد کریں۔ وہ نہایت ہی ذلیل اور کثیف کپڑے پہنے ہوا کرتے ہیں۔ مگر انگریزی بینڈ والے مہتروں نے اپنے لیے طرح طرح کی وردیاں ایجاد کر کے اپنی شان بڑھالی ہے اور ہندوستانی موسیقی کو انگریزی ارغنون میں شامل کر کے، لوگوں میں اپنی قدر بھی زیادہ کرلی ہے۔

(۴۸)

انسانی معاشرت میں سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم کھانا پینا ہے۔ اور کسی گروہ اور قوم کے ترقی کرتے وقت، سب سے پہلے شوق، اپنی خوش مذاقی اور جدّتوں کا اظہار دسترخوان پر کرتا ہے۔ اسی لیے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باورچی خانے اور دسترخوان کے متعلق لکھنؤ کے مشرقی دربار نے کیا رنگ دکھایا اور کیا کیا جدّت طرازیاں کیں۔ اور اس فن میں یہاں کے لوگوں نے کس درجے تک ترقی کی۔

اَوَدھ کے تمدّن کی تاریخ شجاع الدّولہ سے اور اُن کے بھی آخر عہد سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی اُس وقت سے جب کہ وہ بکسر کی لڑائی میں شکست کھا کے اور انگریزوں سے نیا معاہدہ کر کے خاموش بیٹھے اور فوجی سرگرمیوں کی طرف سے بے توجہی ہوئی۔ اُس زمانے میں اُن کے مہتمم باورچی خانہ حسن رضا خاں عرف مرزا حسنو تھے، جو ایک دہلی کے آئے ہوئے معزز و شریف گھرانے سے تھے۔ صفی پور ضلع انّاؤ کے ایک شیخ زادے مولوی فضل عظیم جو لکھنؤ میں طالب علمی کو آئے تھے، خوش قسمتی سے مرزا حسنو کے گھر میں اُن کی رسائی ہو گئی۔ اور اُن کے ساتھ ہی مل کے اور کھیل کود کے بڑے ہوئے تھے۔ اِن کو انھوں نے اپنی طرف سے نائب مہتمم باورچی خانہ مقرر کرا دیا تھا۔ اور اِن کا معمول تھا کہ خاصے کے خوانوں کو درست کر کے اور ان میں اپنی مہر لگا کے نوّابی ڈیوڑھی میں لے جاتے۔ اور بہو بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی کی مخصوص مہریوں دھنیا، بنیا اور منیا کے حوالے کر دیتے محض اس غرض کے لیے کہ یہ مہریاں اِن کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہونے دیں، مولانا نے اِن مہریوں سے بھائی چارا کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ مہریاں بہت ہی نازک موقعوں پر اِن کے کام آئیں۔

نوّاب شجاع الدّولہ کا معمول تھا کہ محل کے اندر اپنی بی بی بہو بیگم صاحبہ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ مہریاں خوانوں کو بیگم صاحب کے سامنے لے جا کے کھولتیں اور دسترخوان پر کھانا چُنا جاتا۔

نوّاب اور بیگم کے لیے ہر روز چھے باورچی خانوں سے کھانا آیا کرتا: اوّل مذکورۂ بالا اصلی نوّابی باورچی خانے سے، جس کے مہتمم مرزا حسنو تھے اور مولوی فضل عظیم خاصے کے خوان خود لے کے ڈیوڑھی میں حاضر ہوتے۔ اِس باورچی خانے میں دو ہزار روپیے روز کی پخت ہوتی۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ باورچیوں اور دیگر ملازموں کی تنخواہوں کے علاوہ ساٹھ ہزار روپیے ماہوار یا سات لاکھ بیس ہزار روپیے سالانہ کی رقم فقط الوانِ نعمت

اور غذاؤں کی قیمت میں صرف ہوتی تھی۔ دوسرے، سرکاری چھوٹے باورچی خانے سے جس کے مہتمم پہلے تو مرزا حسن علی مہتمم توشہ خانہ تھے، لیکن بعد ازاں وہ عنبر علی خاں خواجہ سرا کے سپرد ہو گیا تھا۔ اس میں تین سو روپے روز یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے ہر سال کھانوں کی تیاری میں صرف ہوتے۔ تیسرے، خود بہو بیگم صاحبہ کے محل کے اندر کا باورچی خانہ، جس کا مہتمم بہار علی خاں خواجہ سرا تھا۔ چوتھے، نواب بیگم صاحبہ یعنی شجاع الدولہ کی والدۂ محترمہ کے باورچی خانے سے۔ پانچویں، مرزا علی خاں کے باورچی خانے سے۔ اور چھٹے، نواب سالار جنگ کے باورچی خانے سے۔ آخر الذکر دونوں رئیس، بہو بیگم صاحبہ کے بھائی اور شجاع الدولہ بہادر کے سالے تھے۔

اُس عہد کے یہ چھے باورچی خانے، شاہی باورچی خانے کے ہم پلّہ تھے۔ اور جن میں روز پُرتکلف اور لذیذ کھانے، فرماں روائے وقت کے خاصے کے لیے تیار کیے جاتے۔ ایک دن کسی کھانے میں، جو بڑے سرکاری باورچی خانے سے آیا تھا، خاص نوّاب صاحب کے سامنے ایک مکھی نکل آئی۔ نوّاب نے برہم ہو کے دریافت کیا کہ یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟ دھنیا نے خیال کیا کہ اگر سرکاری باورچی خانے کا نام لیتی ہوں تو مولانا بھائی کی قضا آجائے گی، بولی: حضور! یہ کھانا نوّاب سالار جنگ بہادر کے یہاں سے آیا ہے۔

نوّاب شجاع الدّولہ کے بعد دربار، فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل ہو آیا اور نوّاب آصف الدّولہ نے مرزا حسن رضا خاں کو سرفراز الدولہ خطاب دے کے، خلعتِ وزارت سے سرفراز کیا تو داروغگیِ باورچی خانہ کو اپنی شان کے خلاف خیال کر کے، انھوں نے مولوی فضل عظیم صاحب کو مستقل مہتمم باورچی خانۂ سرکاری مقرر کرا دیا۔ مگر مولوی فضل عظیم صاحب پہلے جس طرح خاصے کے خوان لے کے بہو بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوا کرتے تھے، اُسی طرح اب لکھنؤ میں نوّاب آصف الدّولہ بہادر کی ڈیوڑھی پر

حاضر ہونے لگے اور اپنے دیگر اعزّہ کو بھی بلا کے اپنے کام میں شریک کر لیا۔ جن میں اُن کے سگے بھائی مولوی فائق علی اور چچا زاد بھائی غلام عظیم اور غلام مخدوم زیادہ پیش پیش تھے۔ اور باری باری چاروں بھائی ڈیوڑھی پر خاصہ لے جایا کرتے۔

آصف الدّولہ بہادر کے بعد وزیر علی خاں کے چند روزہ عہد میں تفضّل حسین خاں وزیر ہوئے تو انھوں نے اِن برادرانِ صفی پور کو ہٹا کے، ایک اپنے آوردے غلام محمد عرف بڑے مرزا کو مہتمم باورچی خانہ مقرّر کر دیا۔

اِن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کو اپنے ابتدائی عہد ہی میں ایسے بڑے بڑے زبردست اور شوقین کے باورچی خانے نصیب ہو گئے جن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نہایت ہی اعلا درجے کے باورچی تیار ہوں، غذاؤں کی تیاری میں تکلّفات بڑھیں، جدّت طرازیاں ہوں، اور جو صاحبِ کمال باورچی دہلی اور دیگر مقامات سے آئے ہوں، وہ یہاں کی خراد پر چڑھ کے، اپنے ہُنر میں خاص قسم کا کمال اور اپنے تیار کیے ہوئے کھانوں میں نئی طرح کی نفاست اور خاص قسم کی لذّت پیدا کریں۔

یہ معمول ہے کہ جو کام جس شخص کے ذریعے سے ہوتا ہے، وہ اس میں کچھ نہ کچھ ترقّی ضرور کرتا ہے اور اُس کا شوقین بن جاتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں کھانے کے ابتدائی شوقین بھی وہی رؤسا تسلیم کیے جاتے ہیں جن کے باورچی خانوں کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خود حسن رضا خاں سرفراز الدّولہ کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کھانا کھلانے کے وہ نہایت ہی شائق تھے۔ اور جب اُن کا یہ مذاق دیکھ کے، اعلا ترین سرکاری باورچی خانہ اُن کے سپرد ہو گیا، تو انھیں اپنے شوق کے فن میں ایجاد و اختراع کا کہاں تک موقع نہ ملا ہوگا؟

اور اِسی کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ یوں تو اس سرزمین میں کھانے کے شوقین صدہا رئیس پیدا ہو گئے، مگر نواب سالار جنگ کے خاندان کو آخر تک الوانِ نعمت کی

ایجاد و ترقی میں خاص شہرت ہوئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خود نوّاب سالار جنگ کا باورچی، جو صرف اُن کے لیے کھانا تیار کیا کرتا تھا، بارہ سَو روپے ماہ وار تنخواہ پاتا تھا۔ جو تنخواہ آج بھی کسی بڑے سے بڑے ہندوستانی دربار میں کسی باورچی کو نہیں ملتی۔ خاص اُن کے لیے وہ ایسا بھاری پُلاو پکاتا کہ سوا اُن کے اور کوئی اُسے ہضم نہ کر سکتا۔ یہاں تک کہ ایک دن نوّاب شجاع الدّولہ نے اُن سے کہا: تم نے کبھی ہمیں وہ پُلاو نہ کھلایا، جو خاص اپنے لیے پکوایا کرتے ہو؟ - عرض کیا: بہتر ہے، آج حاضر کروں گا۔ باورچی سے کہا: جتنا پُلاو روز پکاتے ہو، آج اُس کا دُونا پکانا۔ اُس نے کہا: میں تو صرف آپ کے خاصے کے لیے نوکر ہوں، کسی اور کے لیے نہیں پکا سکتا: کہا: اے نوّاب صاحب نے فرمایش کی ہے، ممکن ہے کہ میں اُن کے لیے نہ لے جاؤں؟ اُس نے کہا: کوئی ہو، میں تو اور کسی کے لیے نہیں پکا سکتا۔ جب سالار جنگ نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے کہا: بہتر، مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جا کے اپنے سامنے کھلائیں اور چند لقموں سے زیادہ نہ کھانے دیں۔ اور احتیاطاً آب دار خانے کا انتظام بھی کر کے اپنے ساتھ لے جائیں۔

سالار جنگ نے یہ شرطیں قبول کیں، آخر باورچی نے پُلاو تیار کیا اور سالار جنگ خود لے کے پہنچے اور دسترخوان پر پیش کیا۔ شجاع الدّولہ نے کھاتے ہی بہت تعریف کی اور رغبت کے ساتھ کھانے لگے۔ مگر دو ہی چار لقمے کھائے تھے کہ سالار جنگ نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: بس، اِس سے زیادہ نہ کھائیے۔ شجاع الدّولہ نے حیرت سے اُن کی صورت دیکھی اور کہا: اِن چار لقموں میں کیا ہوتا ہے؟ اور یہ کہہ کے زبردستی دو ایک لقمے اور کھا ہی لیے۔ اب پیاس کی شدّت ہوئی۔ سالار جنگ نے اپنے آب دار خانے سے، جو ساتھ گیا تھا، پانی منگوا منگوا کے پلانا شروع کیا۔

بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے تشنگی موقوف ہوئی اور سالار جنگ اپنے گھر آئے۔
آج کل کے مذاق میں یہ غذا کی کوئی خوبی نہیں سمجھی جا سکتی۔ مگر اُس زمانے میں اور پُرانے مذاق کے کھانے والوں کے نزدیک اب بھی غذا کی خوبی کا اصلی معیار یہی ہے کہ غذائیں بہ ظاہر نفیس و لطیف ہوں مگر اصل میں اس قدر قوی اور معدے پر گراں ہوں کہ ہر معدہ برداشت نہ کر سکے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو مختلف صورتوں میں دکھا کے ایسا بنا دیا جائے کہ دستر خوان پر ظاہر بیں تو یہ نظر آئے کہ بیسیوں قسم کے الوانِ نعمت موجود ہیں مگر چکھیے اور غور کیجیے تو وہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ مثلاً معتبر ذرائع سے سنا جاتا ہے کہ دہلی کے شاہ زادوں میں سے مرزا آسمان قدر، فرزندِ مرزا اخرم بخت، جو لکھنؤ میں آکے شیعہ ہوئے اور چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد بنارس میں جا کے قیام پذیر ہو گئے۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں واجد علی شاہ نے اُن کی دعوت کی تو دستر خوان پر ایک مُربّا لا کے رکھا گیا، جو صورت میں نہایت ہی نفیس و لطیف اور مرغوب معلوم ہوتا تھا۔ مرزا آسمان قدر نے اُس کا لقمہ کھایا تو چکرائے۔ اِس لیے کہ وہ مُربّا نہ تھا، بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا جس کی صورت رکاب دار نے بعینہٖ مربّے کی سی بنا دی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر انھیں ندامت ہوئی اور واجد علی شاہ خوش ہوئے کہ دہلی کے ایک معزز شاہ زادے کو دھوکا دے دیا۔

دو چار روز بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ اور واجد علی شاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکا دیا جائے گا، مگر اِس ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اِس لیے کہ آسمان قدر کے باورچی شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ گو دستر خوان پر صدہا الوانِ نعمت اور قسم قسم کے کھانے چُنے ہوئے تھے، پلاؤ تھا، زردہ تھا، بریانی تھی، قورمہ تھا، کباب تھے، ترکاریاں تھیں، چٹنیاں تھیں، اچار تھے،

روٹیاں تھیں، پراٹھے تھے، شیرمالیں تھیں، غرض کہ ہمہ نعمت موجود تھی، مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھا تو شکر کا۔ چاول تھے تو شکر کے۔ اچار تھا تو شکر کا اور روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں تمام برتن، دسترخوان، اور سلفچی، آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کے ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکا کھاتے تھے۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے خاصے پر چھے مقاموں سے کھانے کے خوان آیا کرتے تھے۔ مگر یہ اُنھی تک منحصر نہ تھا۔ اُن کے بعد بھی یہ طریقہ جاری رہا کہ اکثر معزز اُمرا خصوصاً اعزّاے شاہی کو یہ عزت دی جاتی کہ وہ خاصے کے لیے خاص خاص قسم کے کھانے بلاناغہ بھیجا کرتے۔

چنانچہ ہمارے دوست نواب محمد شفیع خاں صاحب بہادر نیشاپوری کا بیان ہے کہ اُن کے نانا، نواب آغا علی حسن خاں صاحب کے گھر سے، جو نیشاپوریوں میں سب سے زیادہ نام ور اور ممتاز تھے، بادشاہ کے لیے روغنی روٹی اور میٹھا گھی جایا کرتا۔ روغنی روٹیاں اس قدر باریک اور نفاست سے پکائی جاتیں کہ موٹے کاغذ سے زیادہ گندہ نہ ہوتیں۔ اور پھر یہ ممکن نہ تھا کہ چتیاں پڑیں اور نہ یہ مجال تھی کہ کسی جگہ پر کچی رہ جائیں۔ میٹھا گھی بھی ایک خاص چیز تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا۔

دہلی میں بریانی کا زیادہ رواج ہے اور تھا۔ مگر لکھنؤ کی نفاست نے پلاؤ کو اُس پر ترجیح دی۔ عوام کی نظر میں دونوں قریب قریب بلکہ ایک ہی ہیں مگر بریانی میں مسالے کی زیادتی سے، سالن ملے ہوئے چاولوں کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پلاؤ میں اتنی لطافت، نفاست اور صفائی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بریانی اُس کے سامنے ملغوبہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ معمولی قسم کے

پلاؤ سے بریانی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پُلاؤ خشکہ معلوم ہوتا ہے، جو عیب بریانی میں نہیں ہوتا۔ مگر اعلا درجے کے پُلاؤ کے مقابل بریانی، نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بہت ہی لدّھڑ اور بدنما غذا ہے۔ بس یہی فرق تھا جس نے لکھنؤ میں پلاؤ کو زیادہ مروّج بنادیا۔

پلاؤ یہاں کہنے کو تو سات طرح کے مشہور ہیں۔ اُن میں سے بھی صرف گلزار پلاؤ، نور پلاؤ، کوکو پلاؤ، موتی پلاؤ، اور چنبیلی پلاؤ کے نام ہمیں اس وقت یاد ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے اعلا درجے کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے تھے۔ محمد علی شاہ کے بیٹے مرزا عظیم الشان نے ایک شادی کے موقع پر سمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی، جس میں خود فرماں روائے وقت واجد علی شاہ بھی شریک تھے، اُس دعوت میں دسترخوان پر نمکین اور میٹھے کل ستر قسم کے چاول تھے۔

غازی الدّین حیدر بادشاہ کے عہد میں نوّاب سالار جنگ کے خاندان سے ایک رئیس تھے، نوّاب حسین علی خاں۔ انھیں کھانے کا بڑا شوق تھا۔ خصوصاً پلاؤ کا۔ ان کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے اور وہ ایسی نفاست اور لطف کے ساتھ تیار کیے جاتے کہ شہر بھر میں اُن کی شہرت ہوگئی۔ یہاں تک کہ رؤسا و عمائد میں سے کوئی اُن کے مقابلے کی جرأت نہ کرسکتا۔ خود بادشاہ کو اُن پر رشک تھا۔ اور کھانے کے شوقینوں میں وہ "چاول والے" مشہور ہوگئے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں باہر کا ایک باورچی آیا، جو پستے اور بادام کی کھچڑی پکاتا۔ بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا۔ پستے کی دال تیار کرتا، اور اس نفاست سے پکاتا کہ معلوم ہوتا نہایت عمدہ، نفیس، اور پھریری ماش کی کھچڑی ہے۔ مگر کھائیے تو اور ہی لذّت تھی۔ اور ایسا ذائقہ جس کا مزہ زبان کو زندگی بھر نہ بھولتا۔

نوّاب سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک صاحب کمال باورچی صرف

چاولوں کی گُلھتی پکاتا، مگر ایسی گُلھتی جو شاہی دسترخوان کی زونق۔ فرماں روائے وقت کو نہایت ہی مرغوب تھی۔ اور شہر کے تمام رئیسوں کو اُس کا ایک لقمہ مل جانے کی تمنا تھی۔

مشہور ہے کہ نوّاب آصف الدّولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا۔ پوچھا گیا: کیا پکاتے ہو؟ کہا: صرف ماش کی دال پکاتا ہوں۔ پوچھا: تنخواہ کیا لوگے؟ کہا: پان سَو روپے۔ نوّاب نے نوکر رکھ لیا۔ مگر اُس نے کہا: میں چند شرطوں پر نوکری کروں گا۔ پوچھا: وہ شرطیں کیا ہیں؟ ۔کہا: جب حضور کو میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو، ایک روز پہلے سے حکم ہو جائے اور جب اطلاع دوں کہ تیار ہے، تو حضور اُسی وقت تناول فرمالیں۔ نوّاب نے یہ شرطیں بھی منظور کرلیں۔ چند ماہ کے بعد اُسے دال پکانے کا حکم ہوا۔ اُس نے تیاّر کی اور نواب کو خبر کی۔ انھوں نے کہا: اچھا دسترخوان بچھاؤ، میں آتا ہوں۔ دسترخوان بچھا، مگر نوّاب صاحب باتوں میں لگے رہے۔ اُس نے جاکے پھر اطلاع دی کہ خاصہ تیاّر ہے۔ نوّاب کو پھر آنے میں دیر ہوئی اُس نے سہ بارہ خبر کی اور اس پر بھی نوّاب صاحب نہ آئے، تو اُس نے دال کی ہانڈی اٹھا کے ایک سوکھے پیڑ کی جڑ میں اُنڈیل دی اور استعفا دے کے چلا گیا۔ نوّاب کو افسوس ہوا۔ ڈھونڈھوایا مگر اس کا پتا نہ لگا۔ مگر چند روز بعد دیکھا تو جس درخت کے نیچے دال پھینکی گئی تھی، وہ سرسبز ہو گیا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس واقعے میں مبالغہ ہے جس نے اسے خلافِ قیاس ہونے کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ البتہ ہو جاتا ہے کہ دربار میں باورچیوں کی کس درجہ قدر ہوتی تھی اور کوئی صاحبِ کمال باورچی آجاتا تو کس فیاضی سے روک لیا جاتا۔

امیروں کا یہ ذوق و شوق دیکھ کے باورچیوں نے بھی طرح طرح کی جدت طرازیاں شروع کردیں۔ کسی نے پلاؤ انار دانہ ایجاد کیا۔ اس میں ہر چاول آدھا یاقوت کی طرح

سرخ اور جلادار ہوتا اور آدھا سفید، مگر اس میں بھی شیشے کی سی چمک موجود ہوتی جب دسترخوان پر لا کے لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلیٹ میں ابلق رنگ کے جواہرات رکھے ہوئے ہیں۔ ایک اور باورچی نے نورتن پلاؤ پکا کے پیش کیا جس میں نورتن کے مشہور جواہرات کے مثل، نو رنگ کے چاول ملا دیے، اور پھر رنگوں کی صفائی اور آب و تاب، عجیب نفاست اور لطف پیدا کر رہی تھی۔ اسی طرح کی خدا جانے کتنی ایجادیں ہوگئیں جو تمام گھروں اور باورچی خانوں میں پھیل گئیں۔

کھانے کے شوقین اگلے رئیسوں میں سے ایک نواب مرزا خاں نیشاپوری تھے جو کہتے ہیں کہ چودہ ہزار ماہوار کے وثیقہ یاب تھے۔ اچھا کھانے کے شوق میں انھوں نے وہ کمال دکھایا اور ایسے اچھے اچھے باورچی جمع کر لیے کہ شہر میں اُن کے دسترخوان کی دھوم تھی۔ دوسرے مرزا حیدر تھے۔ یہ بھی نیشاپوری اور ایسے محترم رئیس تھے کہ تمام نیشاپوری اِن کو اپنا سرتاج اور بزرگ مانتے۔ اُن کی شان یہ تھی کہ جس کی دعوت میں جاتے، اُن کا آب دار خانہ، گلوریوں کا سامان، اور سو ڈیڑھ سو حقے اُن کے ساتھ جاتے۔ اُن کی اِس وضع سے اکثر متوسط الحال لوگوں کو بڑی مدد مل جاتی۔ کسی نہ کسی طرح خوشامد درآمد کر کے اُن سے دعوت قبول کرا لیتے اور اُن کے قبول کر لینے کے یہ معنی تھے کہ محفل میں حقوں، گلوریوں اور پانی کا انتظام اُن کے ذمے ہوگیا۔ اور پھر کیسا انتظام، جو کسی بڑے سے بڑے رئیس کے بھی امکان سے باہر تھا۔

کھانا تیار کرنے والے تین گروہ ہیں: پہلے، دیگ شو، جن کا کام دیگوں کا دھونا اور باورچیوں کی ماتحتی میں مزدوری کرنا ہے۔ دوسرے، باورچی، یہ لوگ کھانا پکاتے ہیں اور اکثر بڑی بڑی دیگیں تیار کر کے اُتارتے ہیں۔ تیسرے، رکاب دار۔

یہی لوگ اِس فن کے اعلا درجے کے ماہر اور صاحبِ کمال ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ علی العموم چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں اور بڑی دیگیں اتارنا اپنی شان اور مرتبے سے ادنا کام خیال کرتے ہیں ۔ اگرچہ اکثر باورچی بھی چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں، مگر رکاب داروں کا کام فقط چھوٹی ہانڈیوں تک محدود تھا ۔ یہ لوگ میوہ جات کے پھول کترتے، کھانا نکالتے اور لگانے میں سلیقہ، نفاست، اور تکلّف ظاہر کرتے ۔ جو کھانوں اور قابوں میں جو پلاؤ یا زردہ نکالا جاتا، اُس پر میوہ جات اور دیگر طریقوں سے گل کاریاں کرتے اور نقش و نگار بناتے ۔ نہایت نفیس اور لطیف مربّے اور اچار تیار کرتے اور کھانوں میں اپنی طبیعت داری سے صدہا قسم کی صنعتیں دکھاتے ۔

غازی الدین حیدر پہلے شاہِ اودھ کو پراٹھے پسند تھے ۔ اُن کا رکاب دار ہر روز چھے پراٹھے پکاتا ۔ اور فی پراٹھا پانچ سیر کے حساب سے ٣٠ سیر گھی روز لیا کرتا ۔ ایک دن وزیرِ سلطنت معتمد الدولہ آغا میر نے شاہی رکاب دار کو بلا کے پوچھا: ارے بھئی، یہ تیس سیر گھی کیا ہوتا ہے؟ کہا: حضور! پراٹھے پکاتا ہوں ۔ کہا: بھلا میرے سامنے تو پکاؤ ۔ اُس نے کہا: بہت خوب ۔ پراٹھے پکائے ۔ جتنا گھی کھپا کھپایا، اور جو باقی بچا، پھینک دیا ۔ معتمد الدّولہ آغا میر نے یہ دیکھ کے حیرت اور اور استعجاب سے کہا: "پورا گھی تو خرچ نہیں ہوا؟" اُس نے کہا: اب یہ گھی تو بالکل تیل ہوگیا، اِس قابل تھوڑے ہی ہے کہ کسی اور کھانے میں لگایا جائے ۔ وزیر سے جواب تو نہ بن پڑا مگر حکم دے دیا کہ آیندہ سے صرف پانچ سیر گھی دیا جایا کرے ۔ فی پراٹھا ایک سیر بہت ہے ۔ رکاب دار نے کہا: بہتر، میں اتنے ہی گھی میں پکا دیا کروں گا ۔ مگر وزیر کی روک ٹوک سے اس قدر ناراض ہوا کہ معمولی قسم کے پراٹھے پکا کے بادشاہ کے خاصے پر بھیج دیے ۔ جب کئی دن یہی حالت رہی تو بادشاہ نے شکایت کی کہ یہ پراٹھے اب کیسے آتے ہیں؟ رکاب دار نے عرض کیا: حضور!

جیسے پر اٹھے نوّاب معتمد الدّولہ بہادر کا حکم ہے، پکاتا ہوں۔ بادشاہ نے اس کی حقیقت پوچھی تو اُس نے سارا حال بیان کر دیا۔ فوراً معتمد الدولہ کی یاد ہوئی۔ انھوں نے عرض کیا: جہاں پناہ! یہ لوگ خواہ مخواہ کو لوٹتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کے جواب میں دس پانچ تھپّڑ اور گھونسے رسید کیے، خوب ٹھونکا، اور کہا: تم نہیں لُوٹتے ہو! تم جو ساری سلطنت اور سارے ملک کو لوٹے لیتے ہو، اس کا خیال نہیں۔ یہ جو تھوڑا سا گھی زیادہ لے لیتا ہے اور وہ بھی میرے خاصے کے لیے، یہ تمھیں نہیں گوارا ہے؟ بہ ہر حال معتمد الدولہ نے توبہ کی، کان اُمیٹھے، تو خلعت ہوا، جو اس بات کی نشانی تصوّر کی جاتی کہ آج جہاں پناہ نے دستِ شفقت پھیرا ہے، اور اپنے گھر آئے، پھر اُنھوں نے کبھی اس رکاب دار سے تعرّض نہ کیا اور وہ اُسی طرح ۔۳ سیر گھی روز لیتا رہا۔

(۲۹)

نوّاب ابو القاسم خاں ایک شوقین رئیس تھے۔ اُن کے وہاں بہت بھاری پلاو پکتا۔ ۳۴ سیر گوشت کی یخنی تیار کر کے مقطّر کر لی جاتی اور اُس میں چاول دم کیے جاتے۔ اور پھر اس لطف کے ساتھ کہ لقمہ مُنہ میں رکھتے ہی معلوم ہوتا کہ سب چاول خود ہی گھل کے حلق سے اتر گئے۔ پھر اُس کے ساتھ اس درجہ لطافت کہ مجال کیا جو ذرا بھی محسوس ہو سکے کہ اس میں کسی قسم کی گرانی ہے۔ اتنی ہی یا اس سے زیادہ قوت کا پلاو واجد علی شاہ کی خاص محل صاحبہ کے لیے روز تیار ہوا کرتا تھا۔

ممدوحِ بالا معزول شاہِ اودھ کے ہم راہ مٹیا برج میں ایک رئیس تھے، جن کا منشی السّلطان بہادر خطاب تھا۔ بڑے وضع دار اور نفیس مزاج شوقینوں میں تھے، کھانے کا بے حد شوق تھا اور اگرچہ کئی صاحبِ کمال باورچی موجود تھے، مگر انھیں جب تک

دو ایک چیزیں خود اپنے ہاتھ سے نہ پکا لیتے، کھانے میں مزہ نہ آتا۔ آخر اُن کے اچھے کھانے کی یہاں تک شہرت ہوئی کہ واجد علی شاہ کہا کرتے: "اچھا تو منشی السلطان کھاتے ہیں، میں کیا اچھا کھاؤں گا۔" بچپن میں چھے سات برس تک مٹیا برج میں، مَیں اُنھی کے ساتھ رہا۔ اور اُنھی کے ساتھ دسترخوان پر شریک ہوتا رہا۔ میں نے اُن کے دسترخوان پر تیس چالیس قسم کے پلاو اور بیسیوں قسم کے سالن کھائے، جن میں سے بعض ایسے تھے کہ پھر کبھی کھانا نہ نصیب ہوئے۔ انھیں حلوا سوہن کا بھی بڑا شوق تھا۔ جس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا۔

آخر زمانے میں اور غدر کے بعد، لکھنؤ میں حکیم بندہ مہدی مرحوم کو کھانے اور پہننے کا بے حد شوق تھا۔ اور بڑے بڑے دولت مند اور شوقین لوگوں کو یقین ہے کہ جیسا کھانا اُنھوں نے کھایا اور جیسا کپڑا اُنھوں نے پہنا، اُس زمانے میں بہت کم کسی کو نصیب ہو سکا۔ ہمارے ایک معمّر و معزّز دوست فرماتے ہیں کہ "ہمارے خاندان سے حکیم صاحب موصوف سے بہت ربط و ضبط تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے ہمارے والد اور چچا کو بلا بھیجا کہ ایک پہلوان کی دعوت ہے، آپ بھی آ کے لطف دیکھیے۔ وال تشریف لے گئے اور میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ وہ پہلوان روز صبح کو بیس سیر دودھ پیتا ہے۔ اُس پر ڈھائی تین سیر میوہ یعنی بادام اور پستے کھاتا ہے اور دوپہر اور شام کو ڈھائی سیر آٹے کی روٹیاں اور ایک متوسّط درجے کا بکرا کھا جاتا ہے۔ اور اسی غذا کے مناسب اُس کا نان و نوش بھی تھا۔ وہ ناشتے کے لیے بے تاب تھا اور بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ کھانا جلدی منگوائیے۔ مگر حکیم صاحب جان بوجھ کے ٹال رہے تھے۔ یہاں تک کہ بھوک کی شدت نے اُسے بے تاب کر دیا اور اب وہ ناراض ہو کے اُٹھنے لگا۔ تب حکیم صاحب کھانا بھیجنے کا وعدہ کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر اور ٹالا اور جب دیکھا کہ اب

وہ بھوک کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا، تو مہری کے ہاتھ ایک خوان بھیجا جس کی صورت دیکھتے ہی پہلوان صاحب کی جان میں جان آئی۔ مگر جب اُسے کھولا تو ایک چھوٹی تشتری میں تھوڑا سا پلاو تھا جس کی مقدار چھٹانک بھر سے زیادہ نہ ہوگی۔ پُرخور مہمان کو یہ چاول دیکھ کے بڑا طیش آیا جو اُس کے ایک لقمے کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ قصد کیا کہ اُٹھ کے چلا جائے، مگر لوگوں نے سمجھا بجھا کے روکا، اور اُس نے مجبوراً وہ تشتری اُٹھا کے مُنہ میں اُنڈیل لی اور بغیر مُنہ چلائے نگل گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اُس نے پانی مانگا۔ اور اُس کے پانچ منٹ بعد پھر پانی پیا اور ڈکار لی۔ اب اندر سے کھانے کے خوان آئے، دسترخوان بچھا، خود حکیم صاحب بھی آئے، کھانا چُنا گیا۔ اور وہی پُلاو جس میں سے ایک لقمہ پہلے بھیجا گیا تھا، اُس کی پلیٹ جس میں کوئی ڈیڑھ پاو چاول ہوں گے، حکیم صاحب کے سامنے لگائی گئی۔ حکیم صاحب نے اُس پلیٹ کو اُس پہلوان کے سامنے پیش کیا اور کہا: دیکھیے، یہ وہی پلاو ہے یا کوئی اور؟ اُس نے قبول کیا کہ وہی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا: تو اب کھائیے، مجھے افسوس ہے کہ اس کی تیاری میں دیر ہوئی، اور آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔ پہلوان نے کہا: مگر اب مجھے معاف فرمائیے، میں اُسی پہلے لقمے سے سیر ہو گیا، اور اب ایک چاول بھی نہیں کھا سکتا۔ ہزار اصرار کیا گیا مگر اُس نے قطعاً ہاتھ روک لیا اور کہا: کھاؤں کیونکر، جب پیٹ میں جگہ بھی ہو۔ حکیم صاحب نے وہ چاول لے کے سب کھا لیے اور اس سے کہا: بیس بیس سیر اور تیس تیس سیر کھا جانا انسان کی غذا نہیں، یہ تو گائے بھینس کی غذا ہوئی۔ انسان کی غذا یہ ہے کہ چند لقمے کھائے مگر اُن سے قوت و توانائی وہ آئے جو بیس تیس سیر غلہ کھانے میں بھی نہ آسکے۔ آپ اُس ایک لقمے میں سیر ہو گئے ہیں۔ کل پھر آپ کی دعوت ہے، کل آکے بتائیے گا کہ اس ایک لقمے سے آپ کو ویسی ہی قوت و توانائی محسوس ہوئی جیسی کہ بیس سیر دودھ اور سیروں میوے

اور گوشت اور غلّے سے حاصل ہوتی تھی، یا اُس سے کم ؟ ۔ اور ہم سب کو بھی حکیم صاحب نے دوسرے دن مدعو کر دیا۔ دوسرے دن اُس پہلوان نے آکے بیان کیا کہ مجھے زندگی بھر ایسی توانائی اور چونچالی نہیں نصیب ہوئی جیسی کہ کل سے آج تک رہی۔

شاہی خاندان کے لوگوں میں سے آخر عہد میں نوّاب محسن الدولہ اور نوّاب ممتاز الدولہ دسترخوان اور باورچی خانے کے شوق اور کمال میں بے نظیر مانے جاتے۔ اور اُنھی کا باورچی تھا جو حکیم بندہ مہدی صاحب کے لیے یہ پلاو تیار کیا کرتا تھا۔ اُنھی دنوں ملکہ زمانیہ کی ایک بڑی سرکار قائم تھی اور اُن کا باورچی خانہ مشہور تھا جس میں روزانہ تین سو روپے کی پخت ہوتی۔ اُسی عہد میں شہزادے یحییٰ علی خاں کی سرکار میں عالم علی نام ایک باورچی نوکر تھا، وہ مسلّم مچھلی ایسی بے مثل پکاتا تھا کہ تمام رئیسوں میں مشہور تھی۔ اور دوسری سرکاروں کے باورچیوں نے ہزار کوشش کی، مگر وہ بات نہ پیدا کر سکے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں محمود نام ایک ولایتی شخص نے آکے فرنگی محل میں باورچی کی دُکان کھولی اور اُس کی نہاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شاہزادے تک اس کی نہاری کی قدر کرتے۔ قدردانی نے اُس کا حوصلہ بڑھایا اور اس نے شیرمال ایجاد کی جو آج تک لکھنؤ کا سرمایۂ ناز ہے۔ روٹیوں کی بہت سی قسمیں مشہور اور مختلف شہروں میں مروّج ہیں۔ ایران سے مسلمان خمیری روٹیاں کھاتے اور ہندوستان کی سرزمین میں تنور گاڑتے ہوئے آئے تھے، مگر اُس وقت تک سادی روٹیاں تھیں، جن میں گھی کا لگاو نہ ہوتا۔ ہندوؤں کو پوریاں تلتے دیکھ کے مسلمانوں نے توے کی روٹیوں میں گھی کا جز دے کے پراٹھے ایجاد کیے۔ اور پھر اُن میں متعدد پرتیں اور تہیں دینا شروع کیں۔ پھر اُسی پراٹھے میں پہلی ترقی یہ ہوئی کہ باقرخانی کا رواج ہوا، جو ابتداءً امرا کے دسترخوان کی بہت تکلفی روٹی تھی۔

لکھنؤ میں محمد و نے باقر خانی پر بہت ترقی دے کے شیر مال پکائی جو مزے، بو باس، نفاست اور لطافت میں باقر خانی اور تکلفی روٹیوں کے تمام اصناف سے بڑھ گئی۔ شیر مال آج تک سوا لکھنؤ کے اور کہیں نہیں پکتی۔ اور پکتی بھی ہے تو ایسی نہیں پک سکتی۔ چند ہی روز میں شیر مال کو ایسی عام مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ لکھنؤ کی نیشنل روٹی قرار پا گئی۔ یہاں تک کہ جس دعوت میں شیر مال نہ ہو وہ مکمل نہیں سمجھی جاتی۔

شیر مال کی ایجاد نے محمد و کی اس قدر قدر بڑھائی کہ شاہی مجالس اور تقریبوں کے لیے اُسے بعض اوقات ایک ایک لاکھ شیر مالوں کا آرڈر ایک دن میں ملا۔ اور اُس نے بھی ایسا کافی انتظام کر رکھا تھا کہ جتنی شیر مالیں مانگی جاتیں، مہیا کر دیتا۔ محمد و کا جانشین ان دنوں علی حسین تھا جو کئی مہینے ہوئے مر گیا۔ مگر اُس کی دُکان سے آج بھی جیسی اعلا درجے کی شیر مالیں مل سکتی ہیں، اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

شیر مال سے بھی زیادہ مزے دار نان جلیبی ہوتی ہے، جو خاص اہتمام سے پکوائی جاتی ہے۔ اور وہی رکاب دار اسے تیار کر سکتے ہیں جو واقف ہیں۔ اور باورچیوں کو دعوا ہے کہ لکھنؤ کے باورچیوں سے اچھی نان جلیبی کوئی نہیں پکا سکتا۔ پراٹھوں میں لکھنؤ اُسی درجے پر ہے جو دوسرے شہروں کو حاصل ہے۔ اس میں بہ ظاہر کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے اچھے نان بائی بہت اعلا درجے کے پراٹھے پکاتے ہیں۔ اور سیر بھر آٹے میں پورا سیر بھر گھی کھپا دیتے ہیں۔ مگر میں نے اپنے زمانۂ قیامِ دہلی میں کئی بار مشہور نان بائیوں سے پراٹھے پکوائے۔ بے شک اُنھوں نے گھی بہت خرچ کر دیا۔ مگر چوں کہ آٹے کے اندر گھی نہیں دیا تھا، اس لیے وہ اُسی وقت تک کھانے کے قابل تھے جب تک کہ تازے کھائیے

جائیں۔ ٹھنڈے ہوتے ہی چمڑے ہو گئے۔

روٹی کو توڑ کے اور اُس میں گھی شکر ملا کے مَل دینا، ایک عام اور معمولی غذا ہے جس کا اکثر فاتحوں اور نیازوں میں زیادہ رواج ہے۔ مگر شاہی باورچی خانے کے یہاں کے باورچی ایسا لطیف ملیدہ تیار کرتے جو بعض فرماں رواؤں کو نہایت ہی مرغوب تھا۔ اور تعریف یہ تھی کہ منہ میں لقمہ لیتے ہی شربت بن جائے اور معلوم ہو کہ چبانے یا منہ چلانے کی مطلق ضرورت نہیں۔

اسی روٹی کے سلسلے میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ صرف دودھ کی پوریاں پکائی جانے لگیں، جن میں آٹے کا بالکل جُز نہ ہوتا۔ صرف دودھ کے جُبن میں، گندھے ہوئے میدے کی شان پیدا کرلی جاتی)۔ اور آخر میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ دودھ کی گلوریاں اور دیگر اقسام کی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ اسی طرح خالص دودھ کی پنجیری دسترخوانوں پر آتی جو بہت ہی نفیس و لطیف غذا اور امرا کو بہت پسند تھی

لیکن مسلمانوں کی نیشنل ڈش یعنی قومی غذا پلاؤ اور قورمہ ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت انھی چیزوں میں دکھائی گئی۔ پلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ پھر بھی بعض باتیں باقی رہ گئیں۔ دولت مند اور شوقین امیروں کے لیے مرغ، مشک و زعفران کی گولیاں کھلا کھلا کے تیار کیے جاتے۔ یہاں تک کہ اُن کے گوشت میں ان دونوں چیزوں کی خوش بو سرایت کر جاتی اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا۔ پھر اُن کی یخنی نکالی جاتی۔ اور اس یخنی میں چاول دم دے دیے جاتے۔

موتی پلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا چاولوں میں آب دار موتی ملے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے موتیوں کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق، انڈے کی زردی میں خوب حل کیے جاتے۔ پھر اُس حل شدہ مرکب کو مرغ کے نرخرے میں بھر کے، نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر باریک

دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا۔ اور اُسے خفیف سا جوش دے کے، چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کردی جاتی، اور سڈول، آب دار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کردیے جاتے۔ بعض رکاب دار پنیر کے موتی بناتے اور اس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔ بہرحال ایسی ایسی جدتیں عمل میں آتیں کہ اور کہیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہوتیں۔ بعض رکاب داروں نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے اور خوب احتیاط سے اِس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے، پلیٹ میں بٹھا دیں۔ چاولوں کی صورت دانے کی کردی۔ اور معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے سامنے پلیٹ میں چڑیاں بیٹھی دانہ چُگ رہی ہیں۔ پھولے ہوئے سموسے، جن میں سے توڑتے ہی، لال نکل کے اُڑ جاتے، حیدر آباد دکن میں غالباً لکھنؤ کے رکاب دار پیر علی نے آکر تیار کیے جو سرکاری ڈنروں میں میز پر آئے۔ اور معزز انگریزوں اور لیڈیوں کو بہت محظوظ کیا۔ اِس کی ایجاد سب سے پہلے نصیر الدین حیدر کے دسترخوان پر ہوئی تھی۔ مگر چڑیوں والا مذکورۂ بالا پلاؤ اس سے بہ درجہا زیادہ دل چسپ صنعت تھا۔

ایک رکاب دار نے یہ صنعت دکھائی کہ دسترخوان پر بڑے بڑے سیر سیر بھر کے انڈے اُبلے ہوئے اور تلے ہوئے پیش کیے، جن میں سفیدی اور زردی اُسی نسبت اور وضع سے قائم تھی جو معمولی انڈوں میں ہوا کرتی ہے۔ بعض رکاب داروں نے بادام کا سالن پکایا جو بعینہٖ سیم کے بیجوں کے مثل، اور مزے اور لطافت میں اس سے بڑھا ہوا تھا۔ وزیرِ سلطنت روشن الدولہ کے باورچی نے کچے بھٹوں کے لچھے اِس نفاست سے کاٹے کہ کہیں ٹوٹنے نہ پائے اور اُن کا رایتا ایسا اعلا درجے کا بنایا کہ جس نے چکھا، اُش اُش کر گیا۔

ہمارے معجز رقم خوش نویس منشی شاکر علی صاحب نے چاول پر قُل ھُوَاللّٰہُ

لکھ کے بے مثل کمال دکھایا ہے۔ مگر یہاں کے ایک باورچی نے شاہی میں خشخاش کے دانوں میں چاروں طرف کٹھل کے سے خار پیدا کیے اور انھیں خاص ترکیب سے پکا کے دسترخوان پر پیش کیا تھا۔

پیر علی، لکھنؤ کا مشہور رکاب دار، جو حضور نظام کے باورچی خانے میں ملازم تھا، ایک نہایت قیمتی اور لذیذ ارہر کی دال پکایا کرتا، جو اگلے فرماں روایانِ لکھنؤ کے باورچی خانوں میں پکا کرتی تھی، اور سلطانی دال کے نام سے مشہور تھی۔

بعض رکاب دار مسلّم کریلے ایسی نفاست اور صفائی سے پکاتے کہ دیکھیے تو معلوم ہوتا کہ انھیں بھاپ بھی نہیں لگی ہے، ویسے ہی ہرے اور کچے رکھے ہیں مگر کاٹ کے کھائیے تو نہایت ہی پُر لطف اور لذیذ ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ آج ہی کل کے زمانے میں ہمارے مکرّم دوست سیّد علی اوسط صاحب کو پیش آیا۔ اُن کا بیان ہے کہ موجودہ خاندانی رؤسائے لکھنؤ میں سے نواب علی نقی خاں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ رات کا کھانا ذرا انتظار کر کے کھائیے گا، میں کچھ بھیجوں گا۔ رات کو حسبِ وعدہ کھانے کے وقت اُن کا آدمی ایک خوان لے کے آیا۔ میں نے وفورِ شوق سے خوان اپنے سامنے منگوا کے کھلوایا، تو اُس میں صرف ایک پلیٹ تھی اور اُس پر ایک کچا کدو رکھا ہوا تھا۔ دیکھ کے طبیعت نہایت منغّص ہوئی۔ انتہا یہ کہ پاس سے میں نے ماما سے کہا: اِسے لے جا کے رکھو، کل پکا لینا۔ مگر شاہ زادے صاحب کے آدمی نے ہنس کے کہا: اِسے کاٹ کے یوں ہی کھائیے، پکانے کی ضرورت نہیں۔ اب میں نے جو اُسے کاٹا تو عجیب لذیذ اور مزے کی چیز نظر آئی، اور ایسا کبھی نہیں کھایا تھا۔

رکاب داروں نے، سچ یہ ہے، کہ اِس قسم کی صنعتوں میں یہاں عجیب

عجیب کمال دکھائے تھے۔ پیر علی رکاب دار مٹھائی کا انار بناتا تھا جس میں اوپر کا چھلکا، اندر کے دانے، اُن کی ترتیب اور ان کے بیچ کے پردے، سب اصلی حلوا ہوتے۔ دانوں کی گٹھلیاں، بادام کی ہوتیں۔ ناشپاتی کے عرق کے دانے ہوتے۔ دانوں کے بیچ کے پردے اور اوپر کا چھلکا دونوں شکر کے ہوتے۔

علی العموم رکاب دار مربے اور اچار وغیرہ اور طرح طرح کی مٹھائیاں تیار کرتے، جن میں صدہا قسم کی ترکیبیں اور عجیب عجیب صنعتیں اور نفاستیں دکھائی جاتیں۔ آم کا مربا سب نے کھایا ہے، مگر یہاں رکاب دار مسلّم ہری کیریوں کا مربا تیار کرتے اور اُن میں ویسے ہی سبز چھلکے اپنی اصلیت پر قائم رہتے۔ بس یہ معلوم ہوتا کہ تازی کیریاں ابھی توڑ کے لائی اور شیرے میں ڈال دی گئی ہیں۔

(۳۰)

مذکورۂ بالا تمام تکلفات نے دعوتوں اور حصّوں کے لیے جو کھانے علی العموم منتخب کر دیے تھے، اُن کے مجموعے کا نام تورا تھا۔ جن میں لازمی طور پر حسبِ ذیل غذائیں ہوتیں:۔

(۱) پلاو (۲) مزعفر (۳) تنجن (۴) شیرمال (۵) سفیدہ (میٹھے چاول جن میں زعفران کا رنگ نہ دیا گیا ہو (۶) بورانی کے پیالے (۷) شیر برنج کے خوانچے (۸) قورمہ (۹) تلی ہوئی اروبیاں گوشت میں (۱۰) شامی کباب (۱۱) مربا (۱۲) اچار یا چٹنی۔ اکثر جگہ تورے میں ان میں سے بعض چیزیں کم و بیش بھی کر دی جاتیں۔ مگر لکھنؤ میں علی العموم یہی کھانے مقبول تھے اور دعوتوں اور حصّوں میں ان کے سوا اور کوئی چیز کم ہوتی تھی۔ دعوتوں میں یہ چیزیں دسترخوان پر ہر شخص کے سامنے جُدا جُدا پلیٹوں میں چُنی جاتیں۔ اور کہیں بھیجنا ہوتا تو یہی تورا لکڑی کے خوانوں میں

رکھ کے اہتمام سے بھیجا جاتا۔

انگریزوں میں رواج ہے کہ میز، پھولوں، گل دستوں اور طرح طرح کی زینتوں سے آراستہ کی جاتی ہے۔ اِس کا اس قدر نمونہ یہاں بھی تھا کہ امیروں، نوابوں اور شاہزادوں میں جو تورے تقسیم ہوتے، ان میں کھانوں کے درمیان میں کاغذ کے پھولوں کا ایک گل دستہ بھی رکھ دیا جاتا، جس کو عوام اور اوسط درجے کے لوگوں نے فضول سمجھ کے ترک کر دیا۔

جن معزز سرکاروں اور اعلا درجے کی ڈیوڑھیوں میں کھانا جاتا، اُن کے رُتبے اور درجے کے مطابق تورے میں انواعِ نعمت کا شمار بھی بڑھ جاتا۔ بادشاہ کے محل میں خاص جہاں پناہ کے لیے ایک سو ایک خوانوں کا تورا جاتا، جس کی لاگت کا اندازہ پانچ سو روپیے کا تھا۔ فرماں روایانِ اودھ میں واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ بڑے ثقہ اور متقی و پرہیزگار فرماں روا تھے۔ مناہی سے بچتے، اوامرِ شریعت کی پوری پابندی کرتے، اور کوئی کام بغیر جناب قبلہ و کعبہ کی اجازت کے نہ کرتے۔ اُنھوں نے جوشِ اِتقا میں ملک کا روپیا اپنی ذات پر صرف کرنا حرام تصوّر کیا۔ اور اپنے تمام اعزّہ سے خواہش کی کہ ہمیں دعوت میں بجائے کھانے کے تم لوگ نقد روپیا بھیج دیا کرو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پانچ سو روپے بھیج دیا کرتے۔ مگر اُن کے ساتھ خوش نودیِ مزاج کے لیے ایک تورا بھی ضرور بھیجا جاتا، جس کے لیے اِس کی پابندی نہ تھی کہ ایک سو ایک خوان ہوں۔

خوانوں کی شان عام سوسائٹیوں میں یہ تھی کہ لکڑی کے خوان، اُن پر رنگین تیلیوں کا گنبد نما جھابا۔ اُس پر ایک سفید کپڑے کا کسنا، جو چوٹی کے اوپر باندھ دیا جاتا۔ اور شاہی باورچی خانے اور معزز امرا میں دستور تھا کہ اُس بندھن پر لاکھ

لگا کے مُہر بھی کر دی جاتی تاکہ درمیان میں کسی کو تصرف کا موقع نہ ملے۔ پھر اُس کسنے کے اوپر نہایت پُر تکلف رنگین اور اکثر ریشمی خوان پوش ہوتا۔ یہ خوان پوش بڑی سرکاروں میں لازمی طور پر اطلس اور کمخواب یا زربفت کے ہوتے۔ اور کبھی فقط لچکا ٹانک دیا جاتا یا کارچوب کا کام ہوتا۔

ممکن ہے کہ یہ طریقہ دربارِ مغلیہ میں بھی جاری ہو اور وہیں سے لکھنؤ میں آیا ہو، مگر ہم نے اِن تکلفات کو جس اعلا پیمانے پر لکھنؤ میں دیکھا، دہلی میں نہیں دیکھا۔ یہاں کھانے پینے کے ادنا ادنا معاملے میں یہ تکلفات لازمی اور طبیعتِ ثانیہ ہوگئے ہیں۔ کسی معمولی شخص کے لیے بھی فقط پانی مانگا جائے تو خدمت گار نہایت نفاست کے ساتھ گلاس کو تھالی میں رکھ کے اور اُس پر سرپوش ڈھانک کے لائے گا، اور ادب سے پیش کرے گا۔

اِس شوق، اس نفاست اور اِن تکلفات نے سو ہی برس کے اندر لکھنؤ میں ایسے باکمال باورچی پیدا کر دیے جن کی ہندوستان کے ہر شہر اور ہر دربار میں شہرت اور قدر تھی۔ اور میں نے ہندوستان کے تمام مسلمان درباروں اور ریاستوں میں، جہاں گیا، لکھنؤ ہی کے باورچیوں کو پایا، جن کو خاص اُمرا اور والیانِ ملک کے مزاج میں دخل تھا اور اُن کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اب حیدرآباد دکن، بھوپال اور رام پور میں بڑے بڑے صاحبِ کمال باورچی موجود ہیں، لیکن اگر آپ ان کی اصلیت کا پتا لگائیں، اُن کے خاندان کا پتا لگائیں، اور اُن کی ترقی کی تاریخ پر غور کریں تو یہی ثابت ہوگا کہ باورچی یا تو وہ لکھنؤ کے ہیں، یا لکھنؤ سے آئے ہوئے باورچیوں کی نسل سے ہیں، یا کسی لکھنوی باورچی کے شاگرد ہیں۔

ہم باورچی خانے کا حصہ ختم کر چکے، مگر ابھی مٹھائیوں کا ذکر باقی ہے۔ مٹھائیوں کا بنانا، ہندو حلوائیوں کا کام ہے۔ اور انھیں کی مٹھائیوں سے عام پبلک آشنا

ہوتی ہے۔ لیکن مٹھائیاں تیار کرنے میں مسلمان رکاب داروں کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ رکاب دار عوام کی ضرورتوں کو نہیں پورا کر سکتے، اس لیے کہ یہ ہندو حلوائیوں کا حصّہ ہے۔ رکابدار خاص امیروں اور شوقین اور نفاست پسند امیروں کے لیے مٹھائیاں تیار کرتے ہیں، جو بے نظیر اور بہت ہی لذیذ ہوتی ہیں۔

حلوائی لکھنؤ میں دو طرح کے ہیں؛ مسلمان حلوائی اور ہندو حلوائی۔ مسلمان حلوائیوں کی شان یہ ہے کہ اگر عام قسم کی مٹھائی لی جائے تو اُن کی دکان کی چیز ہندو حلوائیوں کی دکانوں سے اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر فرمائش کر کے ان سے خاص قسم کی تکلفی مٹھائی بنوائیے تو ہندو حلوائیوں کی مٹھائی سے بہت زیادہ اچھی اور بہت ہی نفیس و لذیذ ہوتی ہے۔ لیکن علی العموم لکھنؤ میں جلیبیاں، امرتیاں اور بالوشاہی بہت اچھی بنتی ہیں۔

مٹھائیوں میں یہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ کون اصلی ہندوؤں کی ہے اور کون مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ لیکن ناموں اور مذاق پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلوا خالص عربی چیز ہے جو عرب سے ایران ہوتا ہوا ہندوستان میں آیا اور اپنا نام بھی ساتھ لیتا آیا۔ لیکن بہ ظاہر یہ عام فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں تفریق ہے۔ تر حلوا جو عموماً حلوائیوں کے وہاں ملتا ہے، اور پوریوں کے ساتھ کھایا جاتا ہے، وہ خالص ہندو چیز ہے جسے وہ موہن بھوگ بھی کہتے ہیں۔ مگر حلوا سوہن کی چار قسمیں؛ پپڑی، جوزی، حبشی، اور دودھیا، یہ خالص مسلمانوں کی معلوم ہوتی ہیں۔ جدید عربی مذاق کے حلوے جو جنوبی ہند خصوصاً مدراس میں مروّج ہیں، ان کا پتا نہیں۔ وہ واقعی خالص عربی حلوے ہیں جو براہِ راست عرب سے ہندوستان میں آ گئے۔

مگر ہندو حلوائیوں کی اکثر مٹھائیاں بھی مسلمانوں ہی کے زمانے کی ایجاد

معلوم ہوتی ہیں مثلاً برفی کا نام بتا رہا ہے کہ اُسے فارسی و عجمی مذاق نے ایجاد کیا۔ بالوشاہی، خرمے، نکتیاں، گلاب جامن، دربہشت، وغیرہ بھی عہدِ اسلام کی ایجادیں ہیں۔

جلیبی کو عربی میں زلابیہ کہتے ہیں، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلابیہ ہی سے بگڑ کے جلیبی کا لفظ بنا ہے۔ اس لیے یہ بھی اُنھی عربی و فارسی مٹھائیوں میں شامل کرنے کے قابل ہے۔ پیڑا خالص ہندی مٹھائی ہے اور امرتیاں بھی ہندی ہیں۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ میں ایجاد ہوئی۔ فی الحال اِن مٹھائیوں کے اعتبار سے لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جو درجہ بلندی ہند کے تمام ممتاز شہروں کو حاصل ہے، وہی لکھنؤ کو بھی حاصل ہے۔ بلکہ یہ عجیب تماشا نظر آتا ہے کہ لکھنؤ میں تو آگرے اور پنجاب کے حلوائی زیادہ مشہور ہیں، اور دوسرے شہروں میں مجھے یہ نظر آیا کہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے حلوائیوں کو زیادہ نمود حاصل ہے۔ دراصل اس کو کسی دُکان کے چل جانے سے تعلق ہے۔ اس لیے کہ جس حلوائی کی دُکان جس قدر زیادہ چل جاتی ہے، اُسی قدر اُسے مٹھائیوں میں ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

حلوائیوں کی نسبت اصلی فیصلہ یہ ہے کہ ہندو حلوائیوں کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ مٹھائیوں کے جتنے قدردان ہندو ہیں، مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کو شاید گوشت خوری کی وجہ سے علی العموم نمکین کھانوں کا زیادہ شوق ہے۔ بہ خلاف اِن کے ہندو، مٹھائیوں کے زیادہ شوقین ہیں۔ وہ فقط مٹھائیوں سے پیٹ بھر لیتے ہیں جو مسلمانوں سے غیر ممکن ہے۔ اور ہندوؤں کی رغبت کی وجہ سے متھرا، بنارس اور اجودھیا جو ہندوؤں کے مذہبی مرکز ہیں، مٹھائیوں کے اقسام اور مزے کے اعتبار سے دوسرے شہروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مگر حلوا سوہن کے بنانے میں مسلمان رکاب داروں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے بھی شہرت حاصل کی۔ آخر زمانے میں یہاں کے مشہور خوش نویس، منشی ہادی علی صاحب نے پپڑی حلوا سوہن میں خاص نام وری حاصل کی۔ وہ سیر بھر سمنک میں پچیس تیس سیر گھی کھپا دیتے اور اس کی ٹکیوں پر عجیب عجیب قسم کے خوب صورت طغرے بناتے جن سے حلوا سوہن بنانے کے ساتھ خوش نویسی اور نقاشی کے کمالات بھی ظاہر ہوتے۔

اس کے بعد میں نے مٹیا برج (کلکتہ میں) منشی السلطان بہادر کو جو لکھنؤ کے ایک رئیس زادے تھے، اپنی آنکھوں سے بار ہا دیکھا کہ چھٹانک بھر سمنک میں دو ڈھائی سیر گھی کھپا دیتے، جو فی سیر چالیس سیر کے قریب پڑا۔ اُن کا پپڑی حلوا سوہن بہ جائے زرد کے، دھوئے کپڑے کے مانند اُجلا اور سفید ہوتا۔

(۳۱)

باورچی خانے اور کھانوں کی ایجاد و ترقی کے متعلق ہم کافی درجے تک لکھ چکے ہیں۔ لیکن اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ یہاں اور عموماً ایشیائی ممالک میں خوش مزگی پیدا کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش اہمیت کے ساتھ کی جاتی تھی کہ لطافتِ ذوق کے ساتھ غذاؤں میں اعلا درجے کی روح افزا خوشبوئیں پیدا ہوں، رنگ نفیس اور دل کش رہے۔ صورت نظر فریب اور شوق دلانے والی ہو۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام شہروں میں جہاں لوگوں کو اچھا کھانے کا شوق ہے، ان تمام امور کی کوشش کی جاتی ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ سب جگہ سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ کسی جگہ کھانے کا سچا ذوق چند امیروں اور مخصوص لوگوں تک محدود رہا ہے مگر یہاں قریب قریب ہر شخص میں ایک صحیح ذوق

پیدا ہوگیا۔ اچھے باورچی ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ معزّز اور شریف گھرانوں کی عورتوں میں رکاب داروں سے زیادہ نفاست مزاجی اور ذوق کی خوش سلیقگی پیدا ہوگئی۔ کوئی معزز خاندان نہیں ہے جس کی محترم بیگموں میں سے ہر ایک کھانا پکانے میں اچھا سلیقہ نہ رکھتی ہو، اور اُسے کسی اچھی غذا کے تیار کرنے میں دعوا نہ ہو۔

دودھ، دہی کا ہر جگہ رواج ہے۔ لکھنؤ میں اِن دونوں چیزوں کے علاوہ بالائی کی تیاری میں زیادہ توجّہ ہوئی۔ اِس لیے کہ دودھ کا لطیف ترین حصّہ اِس میں آجاتا ہے۔ انگریزی میں اِسی کو "کریم" کہتے ہیں، جس کا رواج یورپ میں کثرت سے ہے۔ مگر وہاں کریم اس کا نام ہے کہ دودھ تھوڑی دیر رکھا رہے اور جب دُہنیت کا سفید اور لطیف حصّہ اوپر آجائے تو کاچھ کے الگ کر لیا جائے۔ یہاں دودھ کا یہ لطیف حصہ، ہلکی آگ پر رکھ کے اور جما کے الگ کیا جاتا ہے۔ اور بڑی نفاست سے اس کی تہ پر تہ جما دی جاتی ہے۔ بالائی کی تہوں کو نفاست اور خوش نمائی سے جمانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ و نادر ہی کسی اور شہر کے لوگوں کو آتا ہوگا۔

اِس کو پُرانی زبان میں ملائی کہتے ہیں۔ آصف الدّولہ بہادر نواب اودھ کو یہ اِس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے اُن کے لیے تیار کی جاتی۔ انھوں نے اس کا نام ملائی کے عوض بالائی رکھ دیا۔ اِس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔ اہلِ لکھنؤ کو اپنے فرماں روا کا یہ تصرف بہت پسند آیا اور بالائی کا لفظ زبانوں پر اِس قدر چڑھ گیا کہ اب لکھنؤ میں سوا دیہاتیوں یا ہندو جُہلا کے، سب لوگ بالائی ہی کہتے ہیں اور ملائی کا لفظ کسی مہذب شخص کی زبان پر باقی نہیں رہا۔

اِس پر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں اعتراض

کردیا اور انصاف کو ذوقِ سلیم پر محوّل فرمایا جس معیار سے اُن کے مذاق میں "ملائی" کا لفظ بالائی سے زیادہ لطیف و فصیح ہے۔ کسی لفظ کو محض اپنے مذاق کے اعتبار سے غیر فصیح کہہ دینا، میرے نزدیک ایک بے معنی سی چیز ہے۔ اس لیے کہ ہر جماعت کو وہی الفاظ اپنے ذوق میں اچھے معلوم ہوتے ہیں جو اُن لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوں اور اُن کے لہجے اور محاورے سے مانوس ہو گئے ہوں۔ جن شہروں کے لوگ ملائی کہتے ہیں، اُن کو بے شک بالائی کا لفظ گراں گزرتا ہوگا، اور اُن کی زبان سے ناآشنا ہوگا۔ مگر جس شہر میں لوگ بالائی کہتے ہیں اور یہی لفظ اُن کے محاورے میں شامل ہو گیا ہے، اُن کو جو فصاحت بالائی میں نظر آتی ہے، ملائی میں ممکن نہیں۔ اُن کو ملائی جاہلوں اور گنواروں کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ فصاحت و لطافتِ زبان کا اندازہ کسی خاص ذوق یا کسی منطق سے نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ اہلِ زبان مان لیے جاتے ہیں، فقط اُن کا ذوق اور محاورہ معیار قرار پا جاتا ہے اور سب کو بغیر کسی منطق و دلیل کے اُن کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اردو کے لیے اب دہلی و لکھنؤ دونوں اہلِ زبان کے مستند اسکول سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا دونوں مسلّم الثبوت معیارِ سخن ہیں۔ چاہے ایک کا لفظ دوسرے کو غیر مانوس ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنؤ کی زبان کو سچّا اور مستند معیار ہی نہ تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے اور غالباً یہ جھگڑا طے بھی ہو چکا ہے۔ بہرحال اگر دونوں شہر معیار مانے جائیں تو ملائی اور بالائی بجائے خود دونوں صحیح ہیں۔ ملائی، اہلِ دہلی کے نزدیک اور بالائی، اہلِ لکھنؤ کے نزدیک۔ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

کھانے کے پکانے سے زیادہ یا اسی کے برابر ضرورت کھانوں کے نکالنے میں اچھا سلیقہ دکھانے اور نکال لینے کے بعد اُس کے آراستہ کرنے اور سجنے کی ہے۔ یورپ کا موجودہ مذاق یہ ہے کہ میز خوب آراستہ کی جاتی ہے، اُس پر جا بجا گلدستے

لگائے جاتے ہیں، اور بعض جگہ تکلّف کے لیے کچے چاولوں کو مختلف رنگوں میں رنگ کے اُن سے میز پر حروف اور نقش و نگار بنا دیے جاتے ہیں۔ ظروف بھی نہایت صاف ستھرے، قیمتی اور اکثر چاندی کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ مگر خاص کھانے کی سجاوٹ کا انگریزی باورچیوں یا خانساماؤں کو چنداں خیال نہیں ہوتا۔ بہ جز شادیوں کے کیک کے، جو امرا اور لارڈوں کے عروسی ڈنروں میں عجیب تکلفات سے بُرجوں یا خوب صورت عمارتوں کی وضع میں بنا کے، دعوتِ ولیمہ کی میز پر لگا دیے جاتے ہیں۔

اِس کے خلاف، ہندوستان میں دسترخوان کی آراستگی کی طرف تو کم توجّہ کی جاتی ہے، مگر خود کھانے اعلا درجے کی نفاست سے نکال کے سجے جاتے ہیں۔ اُن پر چاندی سونے کے ورق لگائے جاتے ہیں، پستے اور بادام کی ہوائیوں سے نقش و نگار اور رنگ رنگ کے پھول بنائے جاتے ہیں، کھوپرے کے ورق کاٹ کاٹ کے نہایت ہی موزوں ترتیب سے اُن پر آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اس فن میں رکاب داروں کو خاص کمال حاصل ہے۔ بلکہ اُن کا کام یہی ہے کہ جس خوبی سے غذاؤں کو تیار کریں اُس سے زیادہ خوش نمائی سے اُن کو سجیں اور ہر پلیٹ کو ایک گل دستہ بنا دیں۔

لکھنؤ میں یہ تکلفات اہلِ پیشہ باورچیوں اور رکاب داروں سے شروع ہو کے شرفا کے عام گھروں میں پہنچ گئے۔ اور خاتونوں اور بیگموں کو اس میں ایسا اچھا سلیقہ ہو گیا کہ جو خوبی پلیٹوں اور قابوں کے سجنے میں اکثر وہ دکھاتی ہیں، خود رکاب داروں سے بھی ممکن نہیں۔ اگرچہ یہ خاص اُنھی کا ہنر ہے۔ یورپ کے محقّقین نے طے کر دیا ہے کہ عورتیں فنونِ لطیفہ سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، خصوصاً کسی چیز کے سجنے اور آراستہ کرنے میں اُن کو بالطبع مردوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اِس کا ثبوت ہندوستان میں لکھنؤ کی اُن عورتوں کی طبیعت داری سے مل سکتا ہے جو کھانوں کے

سجنے میں کمال دکھا دیا کرتی ہیں۔

ہندوستان کے عروسی کے کیک جن کا ابھی ذکر ہو چکا، چوبھے ہیں، جو عموماً رسم کے طریق سے شادیوں میں دولھا دلھنوں کے سامنے لگائے جاتے ہیں۔ اُن کو اکثر گھروں کی خاتونیں ایسی نفاست مزاجی اور ذہانت وطبّاعی سے آراستہ کرتی ہیں کہ جی چاہتا ہے، بیٹھے انھیں دیکھا کیجیے۔

کھانے کے ساتھ ہی آب دار خانے کی ترقیوں کو بھی بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ آب دارخانہ، بادشاہوں اور امیروں کے پانی کے انتظام کا نام ہے۔ اگلے دنوں برف نہ تھی، اور بعض موسموں میں ٹھنڈا پانی ملنا نہایت ہی دشوار ہوتا تھا۔ اِس کے لیے اُن دنوں خاص قسم کے انتظام کیے جاتے تھے۔ پانی کورے گھڑوں میں بھر کے رکھا جاتا۔ نازک اور نفیس آب خورے پینے کے لیے موجود رہتے۔ گھڑوں اور آب خوروں پر سرخ کپڑا چڑھا دیا جاتا اور وہ تر رکھا جاتا، اِس لیے کہ ہوا لگنے سے بھیگا کپڑا خوب ٹھنڈا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ گرم ہوا اور لُو بھی جتنی زیادہ گرم ہوتی، اُتنا ہی زیادہ کپڑے کو ٹھنڈا کر دیتی۔ اور کپڑے کی ٹھنڈک اندر کے پانی کو ٹھنڈا کرتی۔ اکثر جھجھریاں اور صراحیاں بلکہ گھڑے بھی مُنہ پر کپڑا باندھ کے کسی درخت کی ٹہنیوں میں اُلٹے لٹکا دیے جاتے۔ ہوا کا اندر نفوذ نہ ہونے کی وجہ سے پانی نہ گرتا، اور خوب ٹھنڈا ہو جاتا۔ برسات میں جب یہ تدبیر بھی کام یاب نہ ہوتی تو اکثر گھڑے بھر کے کنووں کے اندر لٹکا دیے جاتے، جہاں اُن میں خوب خنکی پیدا ہو جاتی۔

اِس کے علاوہ سب سے بڑا انتظام یہ تھا کہ جست کی نازک صراحیاں موجود رہتیں اور وہ ناندوں میں شورا اور پانی ڈال کے اُس میں پھرائی جاتیں۔ اِس تدبیر سے تھوڑی دیر میں پانی میں برف کی سی خنکی پیدا ہو جاتی اور اُس کی ٹھنڈک نہایت ہی لطیف و خوش گوار ہوتی۔ اِس تدبیر کو، صراحیوں کا جھلنا کہتے تھے۔

بعد کے زمانے میں برف کے فراہم کرنے کی بھی ایک معقول اور دیرپا تدبیر نکال لی گئی تھی۔ چلّوں کے جاڑوں میں جب سردی خوب شدت پر ہوتی، کھیتوں اور کھلے میدانوں میں رات کو گلی رکابیوں اور پیالوں میں گرم گرم پانی بھر کے رکھ دیا جاتا جو صبح کو جما ہوا ملتا۔ اس برف کو اسی وقت فوراً زمین کے اندر گہرے کھتّوں میں جو پہلے سے کُھدے تیار رہتے، دفن کر دیتے اور اُن میں وہ برف جب تک دبی رہتی، اپنی حالت پر قائم رہتی۔ بہرحال اس طریقے سے اتنی برف بنا کے کھتّوں میں بھر دی جاتی کہ سال بھر کے لیے کافی ہوتی اور اُسی میں سے ہر روز نکال لی جاتی۔ مگر یہ برف اس قدر صاف نہ ہوتی کہ پانی میں ملائی جائے بلکہ شورے کی طرح اس میں نمک اور شورا ملا کے صراحیاں جھلی جاتیں۔ یا برف کی قفلیاں جمائی جاتیں۔

مگر یہ انتظام خاص بادشاہوں یا اُن کے ہم رتبہ امیروں تک محدود رہتا۔ غریب لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتے۔ غربا اور متوسط درجے کے لوگ انھی اوّل الذکر تدبیروں سے کام لے کے پانی ٹھنڈا کرتے۔ اور یہ اہتمام اس قدر عام ہو گیا تھا کہ تھوڑا بہت ہر گھر میں رہتا۔

بہ ہر تقدیر، لکھنؤ میں پانی کے لیے یہ اہتمام اُن دنوں ہوا کرتا اور نفاست مزاجی نے یہ تکلفات پیدا کر دیے تھے کہ مٹی اور جست کی صراحیوں اور ایسے ہی آبخوروں پر اکثر سرخ شال باف (ٹول) کا کپڑا چڑھا ہوتا۔ اور ٹول پر روپہلا گوٹا خوب صورتی سے لپیٹ کے، اُن میں ایسا لطف پیدا کر دیا جاتا کہ پینا درکنار، اُس کے ظروف دیکھ کے آنکھوں میں خنکی پیدا ہو جاتی۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ آب دار خانے کا یہ انتظام جو میں نے بیان کیا ہے، پورا پورا دہلی میں تھا بھی یا نہیں۔ غالباً وہاں ضرور ہو گا۔ اور وہیں سے یہ سب چیزیں لکھنؤ میں آئی ہوں گی۔ مگر میں نے اس اہتمام اور سامان کو جس تکمیل کے ساتھ اور

جس تعمیم سے لکھنؤ کے لوگوں میں دیکھا تھا، دہلی میں نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ وہاں بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں آ کے، مٹی کے ظروفِ آب کی لطافت و نفاست اور نزاکت بہت بڑھ گئی۔ اس لیے کہ یہاں کی مٹی کی عمدگی کی وجہ سے جیسے نازک و خوش نما اور خوش قطع ظروفِ گلی لکھنؤ میں بن سکتے ہیں اور کہیں نہیں بن سکتے۔ دہلی والوں کے پاس جست کی صراحیاں ایسی ہی ہوں گی، مگر ایسی مٹی کی صراحیاں وہاں کسی کو نصیب نہیں ہو سکیں۔ اُن ظروفِ گلی کا حال ہم آیندہ مناسب موقع پر بیان کریں گے۔

بادشاہوں کے ساتھ، جہاں وہ جائیں، باورچی خانہ اور آب دار خانہ بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن یہاں آب دار خانے کا اہتمام دوسرے اُمرا کے وہاں بھی اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت سے اُمرا تھے جو اپنا آب دار خانہ اپنے ساتھ رکھتے۔ چنانچہ مرزا حیدر صاحب کا آب دار خانہ اور بھنڈی خانہ اس فیاضی کے اصول پر قائم تھا کہ وہ جس شادی کی محفل میں جاتے، ساری محفل کو پانی اور حقّہ پلانے کا انتظام انھی کے سپرد ہو جاتا اور اُن کی شرکتِ محفل بہت سے لوگوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور رحمتِ الٰہی بن جاتی۔

(۳۲)

اب ہم اِس دربار اور لکھنؤ کے لباس پر بحث کرنا چاہتے ہیں، جو دراصل نہایت ہی دل چسپ بحث ہے۔ ہندوستان کے لباس کی تاریخ نہایت تاریکی میں ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے پیش تر ہندوستان میں جہاں تک پتا لگایا جائے اور قدیم مورتوں اور رالوز وغیرہ کی تصویروں پر غور کیا جائے، یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں سیے ہوئے کپڑے کا رواج نہ تھا۔ عورت

اور مرد دونوں بے سی ہوئی چادروں، ساریوں اور دھوتیوں سے بدن ڈھانکتے تھے۔ عرب سیاح جو فاتحانِ اسلام سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئے تھے، انھوں نے سندھ سے لے کے بنگالے تک ہر ساحلی شہر اور قریب کے اندرونی علاقوں میں یہاں کے لوگوں کو اسی وضع میں پایا۔

پہلے عرب مسلمان جو یہاں پہنچے، وہ اگرچہ کُرتے، تہمت اور عبائیں پہنتے تھے، مگر لباس و وضع میں انھیں یہاں کے لوگوں پر کچھ زیادہ فوقیت نہیں حاصل تھی۔ لباس میں ترقی اُس وقت سے شروع ہوئی جب ساسانی معاشرت اختیار کر کے، بغداد کے عباسی دربار نے شرفائے عرب کے لیے پاجامے، عبا و قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیے۔ جو لباس کہ کلیتہً یا زیادہ تر ساسانی دربار کے امرا و اعیان کی وضع سے ماخوذ تھا۔ چند ہی روز میں یہی لباس ان تمام مسلمانوں کا ہو گیا جو مصر سے دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور آخر وہ اِس لباس کو لیے ہوئے ہندوستان میں آئے۔ تصویروں میں جو لباس عہدِ اوّلیں کے مسلمان تاج دارانِ ہند کا نظر آتا ہے، وہ قریب قریب وہی ہے جو عجمی و عباسی اُمرا و فرماں رواؤں کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کے سلاطین، ہندو راجاؤں کی تقلید میں جواہرات بہت زیادہ پہنا کرتے تھے۔

دہلی میں دربارِ مغلیہ کا آخری لباس جو ہمیں معلوم ہو سکا، یہ تھا کہ سر پر پگڑی، بدن میں نیمہ، جامہ، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ، پانو میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا، اور کمر میں جامے کے اوپر پٹکا۔ بس یہی دہلی کے قدیم شرفا کی وضع تھی جس میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہوا تھا، اور اگر ہوا بھی ہو تو اتنا نہ تھا کہ ہم کو نظر آ سکے۔

اِس لباس میں نیمے سے مراد کُہنیوں تک کی آدھی آستینوں کا شلوکا تھا

اور سینے پر سامنے اُس میں گھنڈیاں لگائی جاتیں (کذا)۔ اس کو نیچے پہن کے، اُس کے اوپر جامہ پہنا جاتا جو عجمی قبا میں ترمیم کر کے بنایا گیا تھا۔ اُس میں گریبان نہ ہوتا بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو "پردہ" کہلاتے، ترچھے ایک دوسرے پر آکے، سینے کو ڈھانک لیتے سینے کا بالائی حصّہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے، اُسی طرح کھلا رہتا جیسے آج کل انگریزی کوٹوں میں کھلا رہتا ہے۔ اور جس طرح فی الحال قمیص، سینے کے اوپر والے حصّے کو چھپاتا ہے، اسی طرح اُن دنوں نیمہ اس کو ڈھانکے رکھتا۔ سینے پر جامے کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا، نیچے رہتا۔ اور داہنے پہلو پر بندوں سے باندھ دیا جاتا اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا جو اوپر بائیں پہلو میں باندھا جاتا۔ پھر اُس میں کمر کے پاس سے دامنوں کے عوض ایک اسکرٹ سی جوڑ دی جاتی جو ٹخنوں کے اوپر تک لٹکتی رہتی۔ اس میں بہت سی چنٹ دی جاتی۔ اور اس کا گھیر بہت بڑا ہوتا۔ جامے کی آستینیں آدھی کلائی تک بے سلی اور کھلی رہتیں اور وہ دونوں جانب لٹکا کرتیں اس کے نیچے سیدھی سادی تنگ مُہریوں کا پائجامہ ہوتا جو اُمرا میں مشروع اور گلبدن کا ہوا کرتا۔ پھر جامے کے اوپر کمر میں پٹکا باندھ لیا جاتا۔

دو تین صدی پیشتر ہمارے بزرگوں اور ہندوستان کے امیروں اور تمام شریفوں کا یہی لباس تھا۔ ٹوپیوں، پگڑیوں اور پائجاموں میں جو ترمیمیں ہوئیں اُن کا مفصّل و مشرح حال ہم بعد کو بیان کریں گے۔ سردست ہم درمیانی حصّہ جسم کے لباس کا ذکر کرتے ہیں، جو سچ پوچھیے تو اصلی لباس ہے اور اُسی سے انسان کی وضع قطع متشخص و معین ہوتی ہے۔ یہی اُس دور کا درباری لباس تھا اور یہی لباس پہنے ہوئے نوّاب بُرہان الملک منصور جنگ اور شجاع الدّولہ، دلّی سے اودھ میں آئے تھے۔ جامہ عموماً باریک ململ کا ہوتا جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہایت نفیس، باریک اور سبک بنا کرتی اور ساری دنیا میں مشہور تھی۔

ڈھاکے کی ململ اور جامدانی، عالی مرتبہ امیروں اور بادشاہوں کے لیے مخصوص تھی۔

اِس کے بعد ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے بالابر ایجاد ہوا جس میں گول گریبان بالکل کھلا رہتا۔ اس لیے کہ سینے کے ڈھانکنے کے لیے نیمہ کافی تھا جو اُس کے نیچے پہنا جاتا۔ وہ چینٹ اور گھیر اس میں سے نکال دیا گیا۔ اور اس ضرورت سے کہ دامن آگے کی طرف نہ کھلیں، داہنے دامن میں ایک چوڑی کلی لگا دی جاتی۔ یہی کلی اُس کلی کا نقشِ اوّلیں ہے جو فی الحال شروانیوں میں بائیں جانب نیچے لے جا کے بند سے باندھی یا ہُک سے اٹکائی جاتی ہے۔ بالابر بھی دہلی ہی کی ایجاد ہے۔

اسی بالابر پر ترقی کر کے دہلی ہی میں انگرکھا ایجاد کیا گیا، جس میں دراصل جامہ اور بالابر دونوں کو ملا کے ایک نئی قطع پیدا کی گئی۔ اس میں سینے پر چولی، قبا سے لی گئی۔ مگر سینہ کھلا رکھنے کی جگہ ایک گول اور رلمبوترا گریبان بڑھایا گیا جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما کنٹھا لگایا جاتا۔ اور وہ بائیں طرف گردن کے پاس گھنڈی تکمے سے اٹکا دیا جاتا۔ چولی نیچے رہتی، جس میں پہلے داہنی طرف کا پردہ نیچے بغل میں بندوں سے باندھ دیا جاتا۔ اور پھر اوپر بند ہونے جس سے دونوں طرف کے پردے سینے کے نیچے بیچوں بیچ میں لا کے باندھ دیے جاتے۔ اس میں بائیں جانب تھوڑا سا سینہ کھلا رہتا۔ چولی نیچی رہتی اور نیچے دامن اگرچہ قبا کے سے ہوتے مگر پرانے جامے کی یادگار میں دونوں پہلوؤں پر بغلوں کے نیچے چینٹ ضرور رکھی جاتی۔

یہ پُرانا انگرکھا تھا جو دہلی کے آخری دَور میں رواج پا چکا تھا اور وہاں سے سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد اس انگرکھے میں زیادہ چُستی اور قطع داری پیدا کی گئی۔ چولی خوب گول اونچی اور کھنچی ہوئی چست ہو گئی۔ بغلوں کی چینٹ بالکل نکل گئی۔ دامنوں میں بجائے موڑ کے ٹانک دینے کی

سنجافی گوٹ لگائی گئی۔ پھر اُس کے بعد نوّاب زادوں اور شوقین وضع داروں نے ایک کمرتوئی کے عوض جو چولی کے نیچے بند لگانے کی جگہ پر ہوتی، پلیٹوں کی وضع سے تین تین کمرتوئیاں لگائیں۔ جابجا گوٹ اور کمرتوئیوں کے پاس کٹاؤ کا کام بنایا۔

دہلی میں انگرکھے کے ایجاد ہونے کے بعد تیمہ چھوٹ گیا تھا اور بائیں جانب سینے کا کھلا رہنا معیوب نہ تھا، بلکہ وضع داری خیال کیا جاتا۔ لکھنؤ میں اس کے نیچے، نیمے کے عوض شلوکا ایجاد ہوا۔ جس میں آگے کی طرف بوتام لگائے جاتے۔ اس لیے کہ اب یورپ کے بوتام یہاں پہنچ گئے تھے۔ شلوکوں میں خاص وضع داریاں دکھائی جاتیں۔ نازک مزاج لوگ جالی یا باریلیٹ کے چُست شلوکے پہنتے، جن میں کچے سوت سے نقش ونگار کاڑھے جاتے۔ بعض لوگ رنگین شلوکے پہنتے۔ اس لیے کہ اُس کے بیل بوٹے اور اُس کا رنگ، تنزیب کے سپید انگرکھے کے نیچے سے اپنی جھلک دکھا کے خاص لطافت اور خاص نفاست پیدا کرتے۔

دوسری ترمیم بالابر میں دربار کے لکھنؤ آنے کے بعد یہ ہوئی کہ چپکن کے نام سے ایک چُست قبا ایجاد ہوئی۔ اس میں ویسا ہی گول گریبان رکھا گیا اور اس میں انگرکھے کی طرح سینے پر پردہ بھی لگایا گیا۔ مگر وہ پردہ داہنی جانب قوس نما صورت میں بوتاموں سے اٹکایا جاتا۔ اس میں داہنی جانب گلے کے پاس سے بوتاموں کی ایک خوش نما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی تک آتی اور اُس کے مقابل دوسری جانب کی قوس میں اصلی قبا میں سی دیا جاتا۔ اس میں بھی بالابر کی طرح چوڑی کلی اوپر لگائی جاتی، جو بغل کے نیچے بائیں طرف بوتام یا گھنڈی سے اٹکا دی جاتی۔ یہ چپکن جو شالی یا کسی اور بھاری کپڑے کی ہوتی اور جاڑوں کے موسم کے لیے زیادہ موزوں تھی، ایک زمانے میں یہاں اہلِ دربار اور خاصتہً اہلِ کار

باریابانِ دربار کا معززِ لباس تھی۔ اُسے انگریزوں نے بہت پسند کیا اور اپنے ملازموں کو ایک مدت تک وہی پہناتے رہے۔

سب کے بعد لکھنؤ کے بالکل آخری عہد میں چپکن اور انگرکھے دونوں کے ترتیب دینے سے اچکن ایجاد ہوئی۔ اس میں انگرکھے اور چپکن کا سا گریبان قائم رکھا گیا، جو بیچ سے سیدھا کاٹ کے آدھا دونوں جانب سی دیا جاتا۔ اور سلائی کی جگہ پر سنجافی گوٹ کے ذریعے سے گریبان کی گولائی اور قطع برقرار رکھی جاتی۔ بیچ کے چاک میں جو گلے سے لے کے سیدھا کوڑی تک آتا، بوتام لگا دیے جاتے۔ وہ بالابر کی کلی جو اوپر لگائی جاتی تھی، اس میں نیچے کر دی گئی تاکہ دامن بھی نہ کھلیں اور بالابر کی کلی کے اوپر کی طرف لگانے سے جو بدمذاقی ظاہر ہوتی تھی، دُور ہو جائے۔ اچکن کا نیچے کا حصہ بالکل چپکن اور انگرکھے کا سا ہوتا۔ شوقین لوگ اس میں بھی ویسی ہی دردامن گوٹ اور اسی طرح کی تین تین کرتوئیاں لگاتے اور کٹاؤ کا کام بناتے۔

یہ آخری ایجاد اچکن لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس کا رواج شہر سے گزر کے دیہاتوں میں بھی شروع ہوا۔ اور آناً فاناً سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ یہی اچکن، حیدرآباد پہنچ کے تھوڑی ترمیم کے بعد شروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی سی کر دی گئیں۔ گریبان جو گوٹ لگا کے سینے پر نمایاں کیا جاتا تھا، نکال ڈالا گیا۔ قطع و بُرید میں انگریزی کوٹ کی وضع دامنوں وغیرہ میں بھی اختیار کی گئی اور وہ لباس ایجاد ہو گیا جو آج کل ہندوستان کے ہندو مسلمان تمام لوگوں کا قومی لباس کہے جانے کے قابل ہے۔ لکھنؤ والوں نے بھی چند روز بعد جب اپنی پُرانی ایجاد میں حیدرآباد کی مناسب اصلاح دیکھی تو اسے بہت ہی پسند کیا۔ اور تھوڑے ہی زمانے میں شروانی کا رواج ہر شہر اور قریے کی طرح لکھنؤ میں بھی ہو گیا۔

انگرکھے کے نیچے جو شلوکا پہنا جاتا تھا، اس کے عوض پہلے ڈھیلا اور اونچا کرتا اختیار کیا گیا اور چند روز بعد مغربی اثر نے کرتا چھڑا کے انگریزی قمیص کو رواج دیا،

جس میں کف اور کالر ہوتے ہیں۔ قمیص اور کالر کے رواج نے شروانی کے تکلفات اور بڑھائے یعنی لازمی ہوگیا کہ سفید کالر اوپر نکلا رہے اور شروانی کا اوپر کا سرا گلے پر تنگ سے اٹکا کے، قمیص کے اُس بالائی بوتام کے نیچے رہے۔ جس میں کالر لگایا جاتا ہے۔ آستینیں اتنی رہیں کہ کفوں کا کسی قدر حصّہ نکلا رہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں اور متوسّط طبقے والوں کا لباس دوسرے شہروں کی طرح فی الحال لکھنؤ میں بھی یہی شروانی ہے۔ مگر اس کو لکھنؤ سے خصوصیت نہیں۔ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع کا خاتمہ اچکن پر ہوگیا۔ جو اب قریب قریب بالکل متروک ہوگئی ہے۔

(۳۴)

درمیانی حصّۂ جسم کے لباس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب اُس جزوِ لباس کی طرف توجّہ کرتے ہیں جو سر کے لیے مخصوص ہے۔ اور اسی لباس کی ہندستان میں زیادہ عزّت و حرمت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح سر سارے جسم میں ممتاز ہے، اسی طرح اس کے لباس کو بھی زیادہ ممتاز ہونا چاہئے۔ قدیم الایام سے ہندوستان میں پگڑی باندھنے کا رواج چلا آتا ہے۔ اگرچہ عربی و عجمی بھی عمامے باندھے ہوئے یہاں آئے اور اُن کی حکومت قائم ہوجانے کی وجہ سے یہاں کی پگڑیوں میں بہت کچھ تغیّر ہوگیا، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں پگڑی نہ تھی۔

ابتدائی دَور کے مسلمان فرماں رواؤں کے عمامے بڑے بڑے تھے، اور اسی لحاظ سے اُن تمام معزّزین و اُمرا اور دولت مندوں کی پگڑیاں بھی غالباً بڑی بڑی ہوں گی جن کے نیچے قدیم ترکی وضع کی نوک دار مخروطی ٹوپیاں ہوتیں جو افغانستان میں آج تک مروّج اور موجود ہیں۔ اور انھی سے لے کے ہماری ہندوستانی فوج کی وردیوں میں شامل کی گئی ہیں۔

سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں پگڑیاں روز بہ روز چھوٹی ہونے لگیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سرد ممالک میں جس طرح سردی کی مضرت سے بچنے کے لیے، جوں جوں زمانہ گزرتا ہے، لباس وزنی اور گندہ ہوتا جاتا ہے، ویسے ہی گرم ملکوں میں سبک، ہلکا اور مختصر ہوتا رہتا ہے۔ اگلے مسلمان فاتح جیسے بھاری اور موٹے کپڑے پہنے ہوئے یہاں آئے ہوں گے، اُن کے وزنی ہونے کا اندازہ تو ہم فقط قیاس سے کر سکتے ہیں، مگر انگریزوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ اُن کا اور اُن کی عورتوں کا لباس روز بہ روز کس قدر سبک، ہلکا اور مختصر ہوتا جاتا ہے۔

اسی اُصول کے مطابق یہاں پگڑیاں روز بہ روز ہلکی اور چھوٹی ہوتی گئیں اور ملک کا یہ رجحان دربار کی وضع پر بھی اثر کرتا گیا۔ دربارِ مغلیہ کے آخر عہد میں اُمرا اور منصب داروں کی پگڑیاں بہت ہلکی ہو گئی تھیں۔ اور اسی اختصار پسندی نے یہ بات پیدا کی کہ پگڑیوں کی صدہا قطعیں ہو گئیں اور اکثر اُمرا نے اپنے لیے خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کر لیں۔

پگڑیوں کے اختصار نے ترکی کُلاہ کو ترک کرا دیا اور یہ حالت ہو گئی کہ کسی کی پگڑی کے نیچے ٹوپی ہوتی ہی نہ تھی۔ اور بعض پہنتے بھی تھے تو کسی بہت ہی باریک کپڑے کی ذرا سی ٹوپی جو پھونک میں اُڑ جائے۔ ان ٹوپیوں کی نسبت ہمیں وثوق کے ساتھ نہیں معلوم ہے کہ کس وضع کی ہوتی تھیں۔ غالباً اِن ٹوپیوں کی قطع اُن ٹوپیوں کی قطع سے ملتی ہوئی ہو گی جو اب مشائخ اور فقرا کے سروں پر ہوتی ہیں یعنی ایک چھے سات اُنگل کی چوڑی پٹی کا سر کے برابر ایک حلقہ بنایا جائے اور اوپر کی جانب چنٹ دے کے وہ سمیٹ دیا جائے۔

لیکن چند روز میں ضرورت محسوس ہوئی کہ گھر میں اور بے تکلفی کی صحبتو

میں پگڑی اُتار کے رکھ دی جایا کرے۔ لیکن ننگے سر رہنا چوں کہ معیوب ہے، اس لیے کسی قسم کی ٹوپی سر پر ضرور ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لیے دہلی میں تاج کی وضع سے لے کے ایک کمرخی ٹوپی ایجاد ہوئی، جس میں اُس گول حلقے کے اوپر جو سر میں پہنا جاتا تھا، چار کونے نکلے رہتے۔ اس وضع کی ٹوپی اب بھی بعض بعض اُمرا و شاہ زادگانِ دہلی کے سروں پر نظر آجایا کرتی ہے۔ یہ ٹوپی صحیح معنوں میں چوگوشیہ کہلاتی تھی۔ چند روز کے اندر اس ٹوپی میں بھی ترمیم و تنسیخ کا عمل شروع ہوا اور دہلی ہی میں وہ کمرخی کونے نکال کے، ایک گول قبہ نما ٹوپی ایجاد ہوگئی۔ جس میں چار پان ایسی قطع سے کاٹ کے جوڑے جاتے کہ ایک لمبوترا قبہ سر پر نظر آتا۔ یہی ٹوپی پہنے ہوئے لوگ لکھنؤ میں آئے اور اُس وقت سے اِس میں دربارِ لکھنؤ کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہاں پہلی ترمیم یہ ہوئی کہ پانوں کے جوڑوں پر لمبی صُراحیاں بنائی گئیں۔ اور اُن صراحیوں کے درمیان خوش نما چاند قائم کیے گئے۔ یہ چاند اور صراحیاں اس طرح بنائی جاتیں کہ باریک ترتیب کے پانوں میں تین سکھ کی صراحیاں اور چاند کاٹ کے اندر کی طرف ٹانک دیے جاتے جو اوپر نمایاں ہو کے ٹوپی میں ایک اچھی نفاست صفائی اور سادگی پیدا کرتے۔ یہ ٹوپی یہاں بہت پسند کی گئی۔ عام لوگوں نے یکایک پگڑی باندھنا چھوڑ دیا اور ہر مہذب و شایستہ آدمی کے سر پر یہی ٹوپی نظر آنے لگی۔

عام مقبولیت نے اس کی قطع اور درست کی۔ لمبوترا پن موقوف ہو کے نہایت مناسب گولائی پیدا کی گئی اور لکڑی اور تانبے کے قالب ایجاد ہوئے تاکہ اُن پر کھینچ کے یہ چوگوشیہ ٹوپیاں (جو دہلی والی پُرانی کمرخی ٹوپیوں کا نام اپنے ساتھ لیتی آئی تھیں) خوب قبے دار اور گول کر لی جائیں۔

اتنے میں نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا جب کہ لکھنؤ میں مذہبِ شیعہ کو

خوب فروغ تھا۔ اور مذہب، سیاست، تمدن اور معاشرت ہر چیز میں اپنے مذاق کے مطابق اصلاحیں کر رہا تھا۔ خلفاے اربعہ کی مخالفت اور پنج تن کی محبت نے، لکھنؤ کی درباری معاشرت نے (کذا) چار کے عدد کو برا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا جس کا اثر ٹوپی پر یہ پڑا کہ بربناے بعض مستند روایات، خود جہاں پناہ کی ہدایت کے مطابق اس چوگوشیہ ٹوپی میں چار کے عوض پانچ پان کر دیے گئے جس کی وجہ سے اس میں پانچ صراحیاں اور پانچ پان ہو گئے اور نام بھی بجاے چوگوشیہ کے پنج گوشیہ قرار دیا گیا۔ لیکن اصل ٹوپی میں جو ترمیم ہوئی تھی وہ تو اس قدر مستقل ہو گئی کہ چار پانوں کی ٹوپیاں بالکل فنا ہو گئیں۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ کبھی ان میں فقط چار پان ہوا کرتے تھے۔ مگر چوگوشیہ کا نام نہ مٹ سکا، آج تک باقی ہے اور زبانوں پر وہی ہے۔ اگرچہ بعض لوگ پنج گوشیہ بھی کہتے ہیں مگر زیادہ لوگ ایسے ہی ہیں جو اس پانچ پانوں والی ٹوپی کو آج تک چوگوشیہ کہتے ہیں۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے یہ پانچ پانوں والی ٹوپی ابتداءً خاص اپنے لیے ایجاد کی تھی اور اُن کی زندگی میں رعایا میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کو پہنے۔ مگر اہل شہر کو یہ وضع اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی امرا و اعلا نے اسی کو اختیار کر لیا اور لکھنؤ کے تمام مہذب و شایستہ لوگوں کے سروں پر یہی گول قُبّہ نما ٹوپی نظر آتی تھی۔

چند روز بعد جاڑوں کی ضرورت سے اسی قسم کی نہایت نفیس کام دار ٹوپیاں ایجاد ہو گئیں جن میں پانچوں پانوں میں زر لفت یا زری لوبی کی زمین پر دوسرے رنگ کی ریشمی زمین دے کے، فیتوں سے چاند اور صراحیاں بنائی جاتی تھیں۔ اور تمام وضع دار لوگوں کے سروں پر جاڑوں کے موسم میں ان کے سوا

اور کوئی ٹوپی نہ ہوتی۔ اس کے بعد جب چکن کا رواج ہوا تو موسم گرما کے لیے اسی کام کی چوگوشیہ ٹوپیاں ایسی اعلا درجے کی نفیس و خوش نما بننے لگیں جو سال سال بھر کی محنت میں تیار ہوتیں اور دس دس بارہ بارہ روپے تک ان کی قیمت پہنچ گئی۔

اسی زمانے میں دہلی کے ایک شاہ زادے وارد لکھنؤ ہوئے جن کی دربار اور سوسائٹی نے بڑی عزت کی۔ وہ دو پلڑی ٹوپی پہنا کرتے تھے جس میں سر کے لمبان کے مناسب دو لمبے پلّے بیضاوی صورت میں کاٹ کے جوڑ دیے جاتے تھے۔ اُن کی یہ سادی ٹوپی اکثر لوگوں کو پسند آئی۔ اس لیے کہ وہ نسبتاً زیادہ سادی اور تیاری کے اعتبار سے آسان تھی۔ بہت سے لوگوں نے یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ اور عوام میں اس کا اس قدر رواج ہوا کہ آج بھی دو پلڑی ہندوستان کی قومی ٹوپی ہے۔ وہ شاہ زادے یہاں کے لوگوں میں "دو پلڑی ٹوپی والے شاہ زادے" مشہور ہو گئے اور کروڑوں خلقت کے سر اُن کی ایجاد اور تراش کے آج تک زیر بار ہیں۔

یہاں تک کہ شاہی کے آخری دور میں اسی دو پلڑی سے لے کے، یہاں ایک بہت چھوٹی پتلی ٹوپی ایجاد ہوئی، جس میں آگے پیچھے دونوں طرف دو نوکیں نکلی ہوتیں۔ یہ نکّے دار ٹوپی کہلاتی تھی۔ اور اس قسم کی بھاری کام کی ٹوپیاں خاص شاہ زادوں، صاحبِ دولت رئیسوں، اعزّائے شاہی اور اعلا درجے کے نواب زادوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔

الحاصل، غدر کے زمانے تک اہلِ لکھنؤ میں دو ہی طرح کی ٹوپیوں کا رواج تھا: اوّل چوگوشیہ جو مہذب اور ثقہ لوگوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور دوسری دو پلڑی جو شاہ زادوں سے لے کے ادنا طبقے والوں تک تھوڑے تھوڑے تغیرِ وضع کے ساتھ مروّج تھی اور آج عام لباس ہے۔

غالباً غازی الدین حیدر یا نصیر الدین حیدر کے زمانے ہی سے ایک گول

ٹوپی کا بھی خاص لوگوں میں رواج ہوگیا جو مندیل کہلاتی۔ اس کی قطع ڈفلی کی سی ہوتی اور اکثر کارچوب کے کام کی پسند کی جاتی۔ دولت مندوں اور بعض نواب زادوں نے اس کو زیادہ موقر و متین تصور کر کے اختیار کیا اور اسے یہ خصوصیت دی گئی کہ بادشاہ اور شاہ زادوں کے سامنے بغیر پگڑی باندھے یا کارچوب کی مندیل پہنے، کوئی شخص نہ جا سکتا تھا۔ غرض مندیل کو دربار میں جگہ دی گئی۔ اسی مندیل سے ماخوذ وہ گول ٹوپی تھی جس کے اوپر کے کونے ذرا گولائی لیے ہوتے اور جنرلی ٹوپی کہلاتی۔ یہ عموماً سیاہ مخمل کی ہوتی۔ اور اس پر سچے سنہرے کلابتون کا سچا کام ہوتا۔ اصل میں یہ ٹوپی سرکار انگریزی کی فوج میں گوروں کو دی گئی تھی اور بظاہر اس میں وردی کی شان بھی تھی۔ مگر انگریزوں کی تقلید کا غالباً پہلا نمونہ یہی تھا کہ یہ فوجی اور جنرلی ٹوپی، شاہ زادوں اور خاندانی امیروں کے لباس میں داخل ہوگئی۔

آخری شاہِ اودھ واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لیے ایک نئی اور عجیب قسم کی درباری ٹوپی ایجاد کی۔ اس میں کاغذ کا مقوا دے کے، گول حلقہ سادے اطلس یا کارچوبی کام کا بنایا جاتا، جو پیشانی پر زیادہ اونچا ہوتا۔ اس میں اوپر کی طرف تنزیب، گرنٹ یا جالی کی ایک بڑی سی جھولی بنا کے جوڑ دی جاتی۔ اور پہننے میں وہ جھولی پیچھے گدی تک لٹکتی اور سر کے پچھلے حصے پر پڑی رہتی۔ اس درباری ٹوپی کا نام بادشاہ نے عالم پسند رکھا تھا اور اکثر عوام اُسے جھولا کہتے۔ مگر یہ اس قدر غیر مقبول اور ناپسندیدہ وضع تھی کہ واجد علی شاہ کی زندگی میں بھی ان کے دربار کے باہر اُن لوگوں کے سروں پر بھی نظر نہ آسکتی، جن کو وہ عطا ہوئی تھی۔ اور اُن کے بعد تو اس قدر مٹ گئی کہ آج کل کے لوگوں نے شاید اُسے کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا۔

غدر کے بعد لکھنؤ میں یکایک ٹوپیوں کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم

شروع ہوگیا۔ چند روز تک تو چوگوشیہ، دوپلڑی اور مندیلوں یا پگڑیوں کے سوا سر کا کوئی لباس نہ تھا۔ اِس کے بعد یکایک چوگوشیہ ٹوپی کا رواج چھوٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اب اس کے لیے صرف چند پُرانے وضع دار سر رہ گئے ہیں۔ اِن ٹوپیوں سے جو سر خالی ہوگئے، اُن میں سے اکثر نے دوپلڑی اختیار کی۔ لیکن بعض جدتیں تلاش کرنے لگے۔ چند روز تک میرٹھ کی سوزن کار مندیل نما ٹوپیوں کا دَور رہا۔ اِس کے بعد انگریزوں کی نائٹ کیپ یا کشمیر کی اونی لمبی چندوے دار ٹوپیاں مروّج ہوئیں پھر ان کی وضع سے ماخوذ کرکے گرنٹ یا سٹین کی پتلی پتلی ٹوپیاں اختیار کی گئیں جو مختصر ہوتے ہوتے دوپلڑی کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ اب انگریزی عہد کی وضع داریاں شروع ہوئیں اور سر کے لیے اُن کے لباس سے ملتا جُلتا لباس ڈھونڈھا جانے لگا۔ بعض بزرگوں نے تو ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے بلا تامّل ہیٹ یا انگریزوں کی نائٹ کیپ پہننا شروع کر دی۔

لیکن اب ترکی ٹوپی کا دور شروع ہوگیا تھا۔ اس ٹوپی کو سیّد احمد خاں مرحوم نے اختیار کیا تھا۔ اور مسلمان جنٹلمین کے لیے کوٹ پتلون میں اس کا جوڑ لگایا تھا۔ اس وجہ سے ابتداءً یہ ٹوپی نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ نیچریوں کی ٹوپی اِس کا نام پڑ گیا۔ اخباروں میں اس پر ہزاروں پھبتیاں کہی گئیں مگر سر سیّد کے استقلال نے اِسے مروّج کر ہی کے چھوڑا۔ اُن کی زندگی ہی میں لاکھوں آدمی اِسے پہننے لگے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ میں بھی آپہنچی۔ بہتوں نے علےٰ رغم المخالفین یہاں بھی اُسے پہننا شروع کر دیا۔ لیکن اندر ہی اندر اُس کی طرف لوگوں کا رجحان اِس قدر بڑھا کہ اب سارے ہندوستان میں اکثر تعلیم یافتہ اور مہذّب مسلمان اِسی ٹوپی کا استعمال کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں معزز تعلیم یافتہ اور شائستہ شیعہ ہندوستان کے تمام شہروں

سے شاید زیادہ ہیں اور ان میں اس بات کی تحریک بہ مقابل سُنّیوں کے بڑھی ہوئی ہے کہ ہر بات میں اپنے آپ کو متمائز کریں اور اپنے شعائر و اوضاع جداگانہ قرار دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح اہلِ سنّت، دولتِ عثمانیہ کے طرف دار ہیں شیعہ، دولتِ قاچاریۂ ایران کے پیرو و جانب دار ہیں۔ لہٰذا جب لکھنؤ میں ترکی ٹوپی کا رواج بڑھنا شروع ہوا جو ترکوں کی ٹوپی ہے، تو وضع دار شیعوں کو خیال ہوا کہ بجائے ترکی ٹوپی کے، دربارِ عجم کی کلاہ یا پاخ کو اپنے لیے اختیار کریں۔ یہ تحریک پورا کام کر گئی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ جو مسلمان اپنی پُرانی ٹوپیوں کو چھوڑ کر نئی ٹوپی اختیار کرتے ہیں، وہ اگر سُنّی ہیں تو ترکی ٹوپی پہننے لگتے ہیں اور اگر شیعہ ہیں تو ایران کی پرشین کیپ کو اختیار کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں فریقوں میں بعض ایسے روشن خیال بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کی اس اندرونی اعتقادی تفریق کو مٹانا چاہتے ہیں اور باوجود سُنّی ہونے کے ایرانی یا باوجود شیعہ ہونے کے ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ کم ہیں۔ مسلمانانِ شہر کے جدید المذاق لوگوں کی عام وضع یہی ہے کہ شیعہ، ایرانی اور سُنّی، ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہ باہمی تفریق دیکھ کے ہندو تعلیم یافتہ لوگوں نے علی العموم گول مندیل نما فلٹ کیپ اختیار کر لی جس کو بعض مسلمان بھی پہنتے ہیں۔ مگر ہندو انگریزی دانوں کی وضع میں بہ کثرت داخل ہو جانے کی وجہ سے انگریزوں نے اس کا نام "بابو کیپ" رکھ دیا ہے۔ مگر عوام ہندو ہوں یا مسلمان، شیعہ ہوں یا سُنّی، دو پلڑی ہی پہنتے ہیں۔

غدر کے بعد جو زمانہ گزرا، یہ لکھنؤ کی سوسائٹی کے لیے عظیم الشان کون و فساد کا زمانہ تھا۔ معاشرت اور اخلاق و عادات کے ساتھ لوگوں کے لباس اور وضع میں بھی تغیر ہونے لگا۔ اور تعلیم یافتہ جماعت میں کثرت سے ایسے

لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنی معاشرت کے ساتھ اپنی وضع بھی بالکل چھوڑ دی نہ اُن کی ٹانگوں میں پائجامہ رہا، نہ پنڈے پر انگرکھا، نہ پانو میں چڑھواں جوتا رہا۔ نہ سر پر ٹوپی یا پگڑی۔ بلکہ ایک ہی جست میں وہ ساتوں سمندر پھاند کے ہندوستان سے انگلستان میں کود پڑے اور کوٹ پتلون، بوٹ اور ہیٹ اُن کا لباس ہو گیا۔ لیکن آبادی کے غالب گروہ نے اپنی وضع برقرار رکھنا چاہی۔ تاہم بغیر اس کے کہ وہ محسوس کریں، اُن میں بھی تغیّر ہوا۔ اور انگرکھے کے عوض شروانی اُن کا قومی لباس بن گئی۔ لیکن سر کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تک کوئی ایسی ٹوپی نہیں منتخب ہو سکی جس کو سب بلا تامل اختیار کر لیں۔

اِس کون و فساد اور ردّ و بدل کے زمانے میں لکھنؤ میں بیسیوں ٹوپیاں پیدا ہوئیں، جو یا خود یہیں کی ایجاد تھیں یا کسی اور قوم یا مقام سے ماخوذ تھیں ان میں سے جو چند روز تک ٹھہر سکیں اُن پر لکھنؤ کے اصلی مذاق نے بہت کچھ تصرّف بھی کیا۔ مگر آخر کو ترک ہو گئیں۔ اہلِ لکھنؤ کا طبعی رجحان اِس جانب ہے کہ ہر چیز حتی الامکان نازک، نفیس، چھوٹی، چُست اور سبک ہو۔ ہر وضع و لباس میں ان لوگوں نے اِسی مذاق کا تصرّف کیا۔ اور اکثر ٹوپیوں میں بھی اِس قسم کا تصرّف ہوا۔ مگر ترکی ٹوپی، ایرانی ٹوپی، اور ہیٹ میں یہ لوگ مطلق تصرّف نہ کر سکے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ٹوپیاں دوسری قوموں سے بنی بنائی لی جاتی ہیں اور باہر سے آتی ہیں۔ اور اسی تصرف نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ ان ٹوپیوں میں سے ایک بھی، باوجودیکہ بہ کثرت مروّج ہو گئی ہیں لکھنؤ کے مذاق سے جدا ہونے کے باعث یہاں کا قومی لباس نہ بن سکے گی۔ اور ٹوپی کا مسئلہ تا حال موجدانِ لباس کی مجلس میں زیرِ غور و تجویز ہے۔

---

(۳۴)

اگرچہ ہندوستان خصوصاً لکھنؤ میں سر کا قومی لباس ٹوپی ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں کی نزاکت پسندی نے پگڑی کو فنا کر دیا۔ دربار میں علی العموم پگڑیوں کا رواج تھا۔ وہ دہلی کی باوقعت امیرانہ دستاریں تو بے شک یہاں نہیں باقی رہیں اور امرا و اعزّائے شاہی کے سروں پر فقط ٹوپیاں رہ گئیں۔ مگر دربار کے لیے پگڑیاں آخر عہد تک مخصوص تھیں اور عام ملازمین کا اخلاقی فرض تھا اور اب بھی بڑی وسیع حد تک ہے کہ آقا کے سامنے جائیں تو سر پر پگڑی باندھ کے جائیں۔

خود حکمرانوں کے سروں پر پرانی دستار نوّاب سعادت علی خاں کے زمانے تک رہی۔ نوّاب برہان الملک، نوّاب شجاع الدولہ اور نوّاب آصف الدّولہ کے سروں پر وہی دہلی کے عہدہ دارانِ سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی جس پر بڑے درباروں کے موقعوں پر جواہرات کی کلغیاں، مرصّع جیغے اور سرپیچ لگا لیے جاتے۔ مگر فی نفسہٖ وہ دستاریں سادی اور سفید ہوتی تھیں مگر نوّاب سعادت علی خاں کے سر پر ہمیں ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے۔ جس کو اہلِ لکھنؤ اپنی زبان میں شملہ کہتے تھے۔ یہ شملہ یہاں اس طرح بنایا جاتا کہ بھر او میں کپڑے کا ایک چوڑا اور پتلا گردا گرد حلقہ سر کی ناپ کے برابر بنایا جاتا جو بیچ میں خالی اور کھلا رہتا۔ پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پتلی پتلی بہت لمبی بتی بنا کے اس کے بیسیوں پیچ اس کپڑے کے حلقے پر نیچے اور اوپر برابر لپیٹ کے ٹانکے دیے جاتے۔ اس حلقے میں اوپر کی جانب ایک چوڑی پٹّی ویسے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی۔ تاکہ وہ اس حلقے کو نیچے اترنے سے روکے رہے۔ مگر اس سے پوری چندیا ڈھنک نہ سکتی تھی، اس لیے اس کے نیچے کوئی

معمولی دوپلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی ضرور رہتی۔ یہ تھا لکھنؤ کا اصلی شملہ جس کو پہلے پہل نواب سعادت علی خاں نے پہنا۔ اور غالباً وہ وسطِ ہند کے ہندو اور مسلمان درباروں کی اُن پگڑیوں سے ماخوذ تھا جو کسی باریک رنگین کپڑے کی صد ہا گز کی بتیوں کو خاص ترتیبوں سے لپیٹ کے بنائی جاتی تھیں۔ نواب سعادت علی خاں نے اس شملے کو خود ہی نہیں پہنا بلکہ معززینِ دربار اور عمائدِ سلطنت اور وزرا کو بھی وہی عطا ہوا۔

غازی الدین حیدر کو دولتِ انگلشیہ نے بادشاہ بنا کے تاج پہنا دیا جو دراصل ہندوستان اور ایشیا کا تاجِ شاہی نہ تھا بلکہ ایک قسم کا یورپ کا تاج تھا۔ اُس وقت سے فرماں روایانِ لکھنؤ نے شملے یا دستار کو بالکل چھوڑ دیا اور اُن کے ساتھ تمام شاہ زادوں، نواب زادوں اور عمائدِ شہر نے بھی پگڑی کو خیرباد کہہ دی۔ شاہ زادے خاص موقعوں پر تو تاج، مگر علی العموم مسالے دار بھاری کام کی نکّے دار ٹوپیاں پہنتے۔ اور انھی کی تقلید شہر کے دیگر معززین بھی کرتے۔ لیکن عہدہ دارانِ سلطنت، وزرا اور اہل کاروں کو حکم تھا کہ شملہ پہن کے سلاطین و وزرا کے دربار میں آئیں۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے امجد علی شاہ کے عہد تک تمام عہدے داروں کے سر پر وہی شملہ رہا کرتا تھا جس کی تصویر اپنے ناظرین کو ہم نے لفظوں میں دکھا دی ہے۔ واجد علی شاہ نے جب اپنے دربار کی مخصوص ٹوپی عالم پسند (جھولا) ایجاد کی تو معمول ہو گیا کہ جن لوگوں کو زیادہ تقرّب حاصل ہوتا اور "دولہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے، اُن کو عالم پسند بھی عطا ہوتی۔ ان کا فرض تھا کہ عالم پسند پہن کے دربار میں آئیں۔ اُن سے کم درجے کے باریابانِ حضور، جو کسی کارخانے یا محکمے کے داروغہ ہوتے، اُن کو داروغگی کے خطاب کے ساتھ شملہ عطا ہوتا۔ اور وہی پرانا شملہ پہن کے حاضر

ہوتے جو پہلے پہل نواب سعادت علی خاں کے سر پر لوگوں کو نظر آیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو حکم تھا کہ کسی قسم کی پگڑی باندھ کے دربار میں آئیں اور پگڑی نہ ہو تو ٹوپی اتارلیں۔ اہل کاروں کے جس شملے کا ہم نے ذکر کیا ہے، اُسی قسم کا شملہ غالباً مرشد آباد کے دربار میں بھی تھا اور اِسی کا اثر تھا کہ آج سے پچاس برس پہلے ہم کلکتہ ہائی کورٹ کے بنگالی وکیلوں کو اِسی طرح کا شملہ پہنتے دیکھتے تھے۔ لیکن وہ شملہ دربارِ اودھ کے شملوں سے سبک اور ہماری نظر میں ذرا اوچھا ہوتا۔

اب پگڑی کو سوا عہدے داروں کے، تمام خوش باش لوگوں اور معززینِ شہر نے مطلقاً ترک کر دیا تھا لیکن اِس پر بھی دربار میں اور نیز عوام میں پگڑی کی جو عزّت دلوں میں قائم تھی اور ہے، اُس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ شادیوں کے موقع پر ادنا اور اعلا طبقے میں دولھا کے سر پر پگڑی ہی ہوا کرتی ہے۔ اور لکھنؤ کے شرفا میں تو عموماً بھاری کمخاب کے شملے کا رواج ہے۔

یہاں کے دربار نے مذکورہ پگڑیوں کے علاوہ ملازمین کے مختلف طبقوں کے لیے جُدا جُدا وضعوں کی پگڑیاں بھی مخصوص کر دی تھیں۔ اہلِ قلم یعنی محرّروں کے لیے اِسی مذکورہ شملے کی سی سفید ململ کی پگڑی مخصوص تھی۔ دربار کے ہرکارے اور چوب دار بھی اِسی قطع کی پگڑیاں پہنتے (اس لیے کہ وہ پگڑیاں باندھی نہیں بلکہ ٹوپی کی طرح پہنی جاتی تھیں) فرق یہ تھا کہ ہرکاروں کی پگڑیاں سرخ ہوتیں اور چوب داروں کی سفید بُرّاق جن پر آگے داہنی جانب مقیش کا ایک پھول بھی ٹنکا ہوتا۔ ہرکاروں کی پگڑیوں سے ملتی جلتی پگڑیاں کہاروں کی ہوتیں۔ اُن کی پگڑیوں میں داہنی جانب کی کور پر چاندی کی مچھلیاں ٹنکی ہوتیں اور جسم پر سُرخ بانات کے ڈھیلے ڈھالے چُغے ہوتے۔

اِن کے علاوہ تمام فوجوں اور معزز لوگوں کے خدمت گاروں میں بھی

پگڑیوں کا رواج تھا جو اپنی وضع پر جدا اور خود روسی ہوتیں۔
سب سے زیادہ معزز و محترم عمامے علما کے تھے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر پگڑیوں کے سلسلے میں ہم علمائے کرام و مقتدایانِ امّت کے عماموں کے ساتھ پورے زیِّ علما سے بحث کریں۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کے دو فرقوں کے علما ہیں: اول علمائے اہلِ سنّت۔ دوسرے مجتہدین و افاضلِ شیعہ۔ اِن دونوں کی وضع جُدا گانہ ہے۔ سنّیوں کو تقدّس اور تفاہت کی شان اہلِ عرب کے لباس میں نظر آتی ہے اور شیعوں کو علمائے فارس و عجم کی وضع میں۔ اِسی مذاق و رجحان کے مطابق دونوں گروہوں کے علما کا لباس بھی ہے۔
آں حضرت صلعم کے عہدِ مبارک میں عربوں کا عمامہ صرف اس قدر تھا کہ کوئی مختصر سا کپڑا سر پر پیٹ لیا جائے، جس کو نہ کسی قطع داری سے علاقہ تھا اور نہ وضع داری سے۔ مگر جب خلفائے عباسیہ کے عہد میں عراق مستقرِ خلافت قرار پایا تو عجمی و ساسانی لباس، عمائد و اکابرِ عرب کی وضع میں داخل ہوگیا۔ بہرحال جو بڑے بڑے شان دار عمامے اور طیلسان وغیرہ عہدِ خلافت کے علمائے عرب نے اختیار کیے، ان کو عربی لباس مشکل سے کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے علمائے اہلِ سنّت نے اگلے دنوں وہ عربی لباس چھوڑ کے دہلی کی درباری وضع اختیار کرلی تھی اور اس وضع داری کے ساتھ اس لباس کو نباہا کہ آج ہندوستان کے سارے ابنائے وطن نے اسے چھوڑ دیا، مگر وہ ابھی تک اس پر قائم ہیں۔
چناں چہ آج تک علمائے فرنگی محل کی اصلی وضع یہ ہے کہ ایک سیدھا گول عمامہ باندھتے ہیں، جس کی بندش میں بالکل اِس کی کوشش نہیں کی جاتی کہ پیشانی پر محراب کی قطع پیدا ہو۔ جسم میں اگلے زمانے کا جامہ ہوتا ہے جو سب جگہ بالکل خواب و خیال ہوگیا۔ پائنچوں چوڑے اور عرض کے پائنچوں کا ٹخنوں

سے اونچا پایجامہ ہوتا ہے اور گلے میں ایک پتلا سادو پٹا پڑا ہوتا ہے۔ اِس وضع میں ہمارے دو ایک بزرگانِ فرنگی محل آج بھی جمعے کی نماز پڑھانے کو آتے ہیں۔ مگر گھروں میں وہ معمولی سادی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی، لمبا کرتا جس میں گریبان کا چاک بیچ میں ہو، یا انگرکھا اور عرض کے پائنچوں کا پائجامہ پہنتے ہیں۔ فی الحال حدیث العہد علمائے فرنگی محل نے اب اس وضع کو چھوڑ کے علمائے حرمین اور مقتدایانِ شام و مصر کی وضع اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ جیسے آخر میں مولانا شبلی نعمانی نے بھی قومی اور سرکاری درباروں کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان بزرگوں کا جوتا بھی اگلے دنوں گھتیلا تھا مگر اب یا تو زیرپائیاں ہیں اور یا لکھنؤ یا دہلی کا چڑھواں جوتا۔

علمائے شیعہ کی وضع اِس سے بالکل جدا ہے۔ وہ اوّل تو سر پر دو پلڑی ٹوپی پہنتے ہیں، مگر عام لوگوں کے خلاف اُس کی سیون بجائے آگے سے پیچھے کی طرف رہنے کے، آڑی یعنی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ اُس پر بلند اونچے قبے کا عمامہ اہلِ عجم کے عمامے کی بندش سے ملتا ہوتا ہے۔ بدن میں لمبا کرتا، مگر اُس کے گریبان کا چاک بجائے اِس کے کہ سینے کے بیچ میں ہو، بائیں شانے کے پاس ہوتا ہے۔ اگلے دنوں علمائے شیعہ کے کرتوں میں گریبان کی جگہ دونوں شانوں پر ہوا کرتی تھی مگر یہ وضع اب متروک ہو گئی ہے۔ جو علما ایران و کربلا ہو آئے ہیں، وہ کرتے کے اوپر اگلی طیلسان پہنتے ہیں جو یہاں قبا کہلاتی ہے پاؤں میں چوڑے پائنچوں کا پائجامہ ہوتا ہے۔ اور علی العموم کفشیں پہنتے ہیں، جن کا ذکر جوتوں کے بیان میں آئے گا۔

(۳۵)

سر اور درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا حال تفصیل و وضاحت سے ہم بیان کر چکے۔ اب اسفل جسم کے لباس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دیگر زوائد لباس اور مختلف گروہوں کی خاص خاص وضعوں کا اور ان کے بعد عورتوں کے لباس کا تذکرہ کریں گے۔

نشیبی حصۂ جسم کے لیے عربوں میں سوا تہمت کے کچھ نہ تھا۔ عربی تہمت اور ہندوؤں کی دھوتی دونوں بے سی ہوئی بٹلی چادریں ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ تہمت صرف کمر میں لپیٹ کے اٹکا لیا جاتا ہے۔ دھوتی ہندوستان کی مختلف قوموں میں خاص خاص بندشوں سے باندھی جاتی ہے۔ اس کا ایک سرا نیچے سے پھیر دے کے پیٹھ کے نیچے گھرس لیا جاتا ہے اور دوسرے کو بعض لوگ کمر میں لپیٹ لیتے ہیں بعض چنٹ دے کے اور اوپر سے ناف کے پاس گھرس کے آگے لٹکا لیتے ہیں عربوں کے تہمت نے بعد کے زمانے میں یہ ترقی کی کہ اُس کے دونوں سرے سی کے ایک حلقہ بنا لیا جاتا ہے اور اُس میں دونوں پانو ڈال کے اور کمر کے پاس اسے سمیٹ کے بندش کر دی جاتی ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت اور اُس سے مدتوں پیشتر عربوں کا قومی لباس زیریں یہی تھا۔ امیر و غریب بادشاہ و وزیر سب تہمت باندھتے۔ فرق اس قدر تھا کہ اُمرا و متکبّرینِ عرب اپنی نخوت اور اپنے غرور کا اظہار اس طرح کرتے کہ یہ تہمت بہت نیچا اور زمین سے ملا ہوا ہوتا جس میں سارے پانو چھپ جاتے۔ اس کے دونوں سرے زمین پر لٹکتے اور رگڑتے ہوئے چلتے۔ چونکہ اس وضع میں کبر و نخوت کی بو آتی اور جو شخص ایسا تہمت باندھ کے نکلتا، دوسروں کو اپنے سامنے ذلیل و حقیر خیال کرتا، اس وجہ سے اسلام نے اس وضع کی سخت ممانعت کی۔

حکم دے دیا کہ ازار (تہمت) ٹخنوں سے نیچی نہ رہے۔ علما نے اسی حکم کی بنا پر فی الحال یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ پائجامہ یا ٹانگوں کا کوئی لباس ٹخنوں سے نیچا نہ ہو۔ حالاں کہ پائجامہ نہ اُن دنوں تھا اور نہ اِس حکم میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ نیچی اور زمین پر لوٹتی ہوئی ازار باندھنے سے جو کبر و نخوت کا خیال اُمرائے عرب میں پیدا ہوتا تھا، ہندوستان کے نیچے پائجامے پہننے والوں میں ہرگز نہیں ہوتا۔

حضرت رسول خدا صلعم کے زمانے ہی میں پائجامہ دیگر ممالک و اقوام سے عرب میں پہنچ گیا تھا اور بعد کے زمانے میں بغداد کے دربار کا اور اُن عربوں کا جو عرب سے نکل کے دیگر ممالک میں متوطن ہو گئے تھے، قومی لباس بن گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے دھوتی کے سوا پائجامہ نہ تھا۔ مسلمان فاتح اسے اپنے ساتھ ہندوستان میں لائے۔ جن میں ملے ہوئے چند ایسے عابد و زاہد اور مقتدایانِ دین تھے جو سنتِ نبوی کی پیروی میں تہمت ہی باندھے ہوئے اس سرزمین پر آگئے۔ تہمت چونکہ سنت ہونے کی وجہ سے ایک خالص دینی لباس تھا، اِس لیے بے نفس اور دین دار مسلمانوں یا طالب علموں ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ مگر پائجامہ یہاں کی سوسائٹی میں اِس قدر عام ہو گیا کہ مسلمان درکنار ہندوؤں اور یہاں کی دوسری قوموں میں اس کا رواج ہو گیا۔

لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ مسلمانوں کا پہلا اور اصلی پائجامہ کس وضع کا تھا؟ غالباً وہ تنگ مہری کا اٹنگا پائجامہ جو شرعی پائجامہ کہلاتا ہے اور اتقیائے اہلِ سنت میں مروّج ہے، مسلمانوں کا پہلا پائجامہ ہے۔ یہی بغداد میں مروّج تھا۔ اسی کا رواج ایران و ترکستان میں ہوا۔ اور اسی کو پہنے ہوئے مسلمان ہندوستان میں آئے۔

ہندوستان کے آخری عہد میں اِس کی قطع میں اتنا تغیر ہوا کہ پائنچے یا مُہری پنڈلی سے لپٹی رہتی۔ مگر اوپر کا گھیر قریب قریب اتنا ہی ہوتا جتنا کہ پُرانے شرعی پائجامے کا تھا۔ چند روز بعد مہری کسی قدر لمبی اور نیچی ہوگئی مگر ٹخنوں سے آگے نہیں بڑھی۔ دہلی کے آخر عہد تک وہاں اور سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا یہی پائجامہ تھا۔ اگرچہ ادنا طبقے کے مسلمان، ہندو عوام کی آمیزش سے دھوتیاں باندھتے تھے اور معزز درجے کے ہندو اپنے گھروں میں چاہے دھوتیاں باندھے رہیں، مگر مہذب صحبتوں میں آتے تو پائجامہ پہن کے آتے۔

انھی دنوں کابل اور قندھار میں دو متضاد قسموں کے پائجامے مروّج تھے۔ کابل والوں کا پائجامہ نیچے مہری کے پاس تنگ اور اوپر گھیر کے پاس اتنا ڈھیلا ہوتا کہ نیچے کا جسم ایک بہت بڑے جھول دار غبارے میں غائب ہو جاتا۔ اور ایک ایک پائجامے میں ایک ایک اور دو دو تھان خرچ ہو جاتے۔ یہ آج بھی افغانیوں کی ٹانگوں میں نظر آسکتا ہے۔ بخلاف اس کے قندھار والے ایسا پائجامہ پہنتے جس کے اوپر کا گھیر تو زیادہ نہ ہوتا مگر دونوں پائنچے کلیاں جوڑ جوڑ کے اتنے بڑے اور اتنے گھیر کے بنا دیے جاتے کہ جب تک انسان اُن کو گھرس نہ لے، ریا ہاتھ سے سنبھالے نہ رہے، چلنا دشوار تھا۔

دربارِ دہلی میں بہ کثرت قندھاری آ آ کے فوج میں نوکر ہوئے۔ وہ لوگ چوں کہ بڑے بہادر سمجھے جاتے، اِس لیے یہاں کے عام سپہ گروں میں اُن کی وضع و لباس اور عادات و خصائل رواج پانے لگے۔ اور یہ اُنھی کی برکت اور اُنھی کی صحبت کا اثر تھا کہ دہلی میں بانکے بڑے بڑے کلیوں دار پائنچوں کے پائجامے پہنتے۔ دہلی کے آخر عہد میں بانکوں کی وضع داری و شجاعت اس قدر پسندیدہ ہوگئی کہ صدہا شریف زادوں نے بانکوں میں داخل ہو کر اُن کی وضع اختیار کر لی۔

اور شرفا جن میں اکثر اپنی اصلی وضع پر تھے اور بہت سے بانکے بنے ہوئے تھے، لکھنؤ میں آئے۔

لکھنؤ میں آکے یک بہ یک ایک ڈھیلا عرض کے پائنچوں کا پاجامہ پیدا ہوگیا۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے زمانے تک تو اس کا پتا نہیں چلتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر یا اُن کے فرزند نصیر الدین حیدر کے زمانوں میں جب کہ یہاں لباس و معاشرت میں تغیر ہو رہا تھا، اسی بانکوں کے کلیوں دار پائجامے سے مختصر کر کے یہ پائجامہ بنا لیا گیا۔ جو اتنا ڈھیلا تھا کہ ایک ایک پائجامے میں ایک ایک تھان صرف ہو جائے اور نہ تنگ اور چُست مہری والے پرانے پائجامے کی طرح اتنا تنگ کہ پائنچے اوپر چڑھانا غیر ممکن ہو۔ یہ نیا پائجامہ ہلکا پھلکا اور ہندوستان کی گرمیوں میں نہایت آرام دہ تھا چند ہی روز میں امرا و مہذب لوگوں میں اس قدر مقبول ہوگیا کہ سوا اُن لوگوں کے جو بانکپن کا دعوا رکھتے تھے، تمام اہلِ فضل و علم، زہاد و اتقیا اور سارے شرفا و امرا کی وضع میں یہی پائجامہ داخل تھا۔

اب لکھنؤ میں صرف دو پائجامے تھے، ایک تو وہی بانکوں کا کلیوں دار پائجامہ دوسرا عرض کے پائنچوں کا پاجامہ، جو سارے شہر کے مہذب لوگوں کی وضع میں داخل ہوگیا تھا اور اس شان کے ساتھ کہ اکثر مہذب و تعلیم یافتہ لوگ بھی گلبدن، اور مشروع کا سلواتے اور اُس کے پائنچوں میں چوڑی گوٹ لگائی جاتی۔ بانکوں والے اوّل الذکر پاجامے کو خود نصیر الدین حیدر نے اپنی وضع میں داخل کر لیا۔ ان کو انگریزی لباس کا بھی شوق تھا۔ اس لیے یا کوٹ پتلون پہنتے یا کلیوں دار پاجامہ جس کو فی الحال پنجاب والے غرارے دار پاجامہ کہتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر کو یہ پاجامہ اس قدر عزیز تھا کہ انگریزوں کی گون کے مشابہ

دیکھ کے انھوں نے اسے اپنے محل کی بیگموں کو بھی پہنانا شروع کیا۔ اور محل کی وضع میں داخل ہو جانے کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی تمام عورتیں اسی کو پہننے لگیں جس کا ذکر عورتوں کے لباس کے بیان میں آئے گا۔

شاہی میں اودھ کی فوج فتح پنجاب کے موقع پر انگریزوں کے ساتھ جا کے سکھوں سے لڑی تھی۔ سکھ لوگ ایک نئی قسم کا اور بہی ترچھی کاٹ کا تنگ اور چُست پائجامہ پہنتے تھے جو گھٹنا کہلاتا ہے۔ بہت سے پنجاب جانے والوں نے اس وضع کو بہت پسند کیا اور گھروں میں واپس آئے تو وہی آڑی کاٹ کے گھٹنے پہنے تھے۔ یہاں کے اکثر لوگوں نے یہ پائجامہ بہت پسند کیا اور یکایک ایسا رواج ہوا کہ لکھنؤ کے تمام بانکے ترچھے شوقین اور امیرزادے گھٹنا پہننے لگے۔ جو خوب چُست اور خوب کھنچا ہوتا اور گٹے پر اُس کی شکنوں کی بہت سی چوڑیاں رکھی جاتیں۔

لکھنؤ میں یہی تین پائجامے تھے کہ انگریزی ہو گئی۔ بڑے پائنچوں کا کلیوں دار پائجامہ تو بانکوں اور اسلحہ کے ساتھ سارے مردوں میں سے فنا ہو گیا۔ نصیرالدین حیدر کی عنایت سے فقط عورتوں میں باقی ہے۔ مردوں میں فقط دو پائجامے تھے یعنی عرض کا پائجامہ اور گھٹنا۔ یا سنی اہل اتقا میں سے بعض بعض پرانا شرعی پائجامہ پہن لیا کرتے۔ انگریزی دور نے پہلا اثر یہ کیا پائجاموں کی وضع قطع تو وہی رہی مگر اطلس، گلبدن اور مشروع کے یا رنگین سوتی پائجامے مردوں سے بالکل چھوٹ گئے۔ چند روز بعد علی گڈھ کالج کے سوشل اسکول سے انگریزی پتلون کی نقل کے پائجامے ایجاد ہوئے جو نہ اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ پنڈلی سے لپٹے رہیں اور نہ اتنے ڈھیلے کہ پائنچا اوپر تک چڑھا لیا جا سکے۔ انگریزی تعلیم پانے والوں اور سارے ہندوستان کے اکثر شریف زادوں میں اب اسی پائجامے کا رواج بڑھتا جاتا ہے

اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ جو تہذیب جدید کے مَلأ اعلیٰ تک پہنچ گئے ہیں، اپنا سارا لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون پہننے لگے ہیں۔ لیکن لکھنؤ میں آج بھی بعض گنتی کے ایسے ثقہ لوگ نظر آسکتے ہیں جو پُرانی قطع کے عرض کے پائجامے پہنتے ہیں اور اپنی وضع نہیں چھوڑتے۔

(۳۶)

انگرکھے یا چکن وغیرہ کے اوپر اگلے دنوں دوشالے کا رواج زیادہ نظر آتا ہے۔ اور یہی شاہی درباروں سے خلعت میں عطا ہوا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ شالی رومال اوڑھنے کا بھی ایک معمولی حد تک رواج تھا۔ یہی دونوں چیزیں دہلی سے لکھنؤ میں آئیں۔ مگر لکھنؤ میں زیادہ رواج رومال اوڑھنے کا تھا۔ جاڑوں میں اکثر شالی رومال اور سردی کے اوقات میں دوشالا اوڑھا جاتا۔ لکھنؤ میں دربار قائم ہونے کے بعد جب گرمیوں کے لیے لباس میں نفاست و لطافت اور سبکی کو ترقی ہونے لگی تو بار لیٹ اور چکن کے رومال ایجاد ہوئے۔ اور تمام سفید پوش شریفوں کا یہ لباس ہو گیا کہ سر پر قالب چڑھی چکن کی چوگوشیہ ٹوپی، بدن میں انگرکھا، پانو میں عرض کے پائنچوں کا پائجامہ، اور کندھے پر ہلکا چکن یا جالی کا رومال۔ شرفائے لکھنؤ کی یہ پہلی عام وضع تھی جس کو میر انیس مرحوم کا خاندان انھی اگلے تکلفات کے ساتھ آج تک نباہ رہا ہے۔

لباس میں سب سے آخری اور بڑی اہم چیز جوتا ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں جوتے کا مطلق رواج نہ تھا۔ اس لیے کہ چمڑے کے استعمال سے ہندو لوگ مذہباً احتراز کرتے تھے۔ بلکہ جوتے کے عوض یہاں لکڑی کی کھڑاویں پہنی جاتیں جو آج کل کے بعض فقیروں اور مرتاض رشیوں کے علاوہ قدیم راجاؤں میں بھی مروج تھیں۔ مسلمان اپنے ساتھ یہاں مخیط لباس کے ساتھ چمڑے کے جوتے بھی لائے۔ مسلمانوں کا پہلا جوتا عربوں میں فقط ایک چمڑے کا تلا تھا۔ جو تسمے یا بندھنوں سے

کے ذریعے سے پانو میں اٹکالیا جاتا۔ عجمیوں اور رومیوں کا، چمڑے کا موزہ، جوتے سے پہلے عرب میں پہنچ گیا تھا۔ پھر جب عربی دربار شام و عراق یعنی روم کے آغوش میں قائم ہوئے تو چمڑے کے جوتوں کا رواج شروع ہوا۔ مگر وہ پہلے جوتے بظاہر سیدھی سادی زیر پائیاں تھے۔ انھی کو پہنے ہوئے مسلمان ہندوستان میں آئے۔

دہلی کے امرا اور بادشاہ اگلے دنوں اپنی تصویروں میں اونچی ایڑی کی کفش نما جوتیاں پہنے نظر آتے ہیں۔ دہلی کے آخر عہد میں چڑھواں جوتا ایجاد ہوا۔ جس کی ابتدائی وضع یہ تھی کہ آدھا پنجہ اور گٹے سے نیچے تک پانو اُس میں چھپ جاتا۔ اس کے سرے پر چوڑی نوک پنجے پر جھکا کے بٹھا دی جاتی۔ یہ پہلا دلی وال جوتا تھا جس کا پچاس سال پیش تر زیادہ رواج تھا۔ اِس کے بعد سلیم شاہی جوتا نکلا۔ جو غالباً جہاں گیر کے زمانے میں ایجاد ہوا۔ اِس کی نوک آگے نکلی اور اٹھی ہوئی ہوتی اور نوک کا تھوڑا سا باریک سرا اوپر موڑ دیا جاتا۔ ایجاد کے بعد اس پر کلابتون کا مضبوط کام بننے لگا۔ جو بالکل سچا اور قیمتی ہوتا۔ اگرچہ یہ کام دلّی وال اور سلیم شاہی دونوں وضع کے جوتوں پر بنایا جاتا، مگر سلیم شاہی جوتے کا بہت زیادہ رواج ہوا اور اُس نے چند روز میں پرانے دلّی وال کو مٹا دیا۔ اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اب جب کہ انگریزی وضع قطع نے ہمارے سارے لباس اور ہماری تمام چیزوں کو مٹا دیا، وہ آج تک باقی اور مقبول عام ہے۔ اور اکثر ہندوستانی وضع پسند کرنے والے وضع دار ہماری بنے ہماری لباس پر اُسی کو پہنتے ہیں۔ اور فی الحال لکھنؤ میں بھی بہت سے لوگ اِس کو پہنتے ہیں۔

مگر لکھنؤ میں بہ عہدِ شاہی ایک نئی قطع کا خوردنوکا جوتا ایجاد ہوا۔ جس کو یہاں کے وضع داروں نے ابتداءً بہت پسند کیا تھا۔ اس میں نوک بالکل نہ

ہوتی۔ بلکہ جو نوک دتی والی اور سلیم شاہی میں اوپر نکالی جاتی، اس میں سینے کے بعد الٹ کے اندر کر دی جاتی۔ نوک کے پاس فقط ایک ذرا سا اُبھار رہتا۔ یہ جوتے لال نری کے نہایت ہی سبک اور صاف بنائے جاتے اور نفاست و سبک باری کے اگلے مذاق نے اُس کو یہاں تک سبک کیا کہ بعض موچیوں کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ پیسوں بھر سے زیادہ نہ ہوتا۔ اگرچہ عوام اور دیہاتیوں کے لیے اسی وضع کے چمرودھے جوتے اتنے بھاری ہوتے کہ سیر سیر ڈیڑھ ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہوتے اور پھر کڑوا تیل پلا پلا کے اور بھاری کر لیے جاتے۔

تھوڑے دنوں بعد لکھنؤ میں اس خرد نوکے جوتے کی آرائش و زیبائی کی طرف توجہ ہوئی۔ پہلے جاڑے گرمیوں کے خشک موسم کے لیے کاشانی مخمل کے اور برسات کے لیے کیمخت کے بننا شروع ہوئے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بانات کا جوتا نہایت ہی نفیس، سادہ، سبک، اور خوش نما ہوتا۔ کیمخت سبز زنگاری رنگ کا ہوتا، جو گھوڑے یا گدھے کی کھال سے بنتا اور اس میں کٹھل کے خاروں کی طرح دانے ابھار کے پیدا کیے جاتے اور تعریف یہ تھی کہ برسات میں چاہے کتنا ہی بھیگے اس کے رنگ روپ میں فرق نہ آتا۔ خود کیمخت کے بنانے کا فن اگرچہ باہر سے آیا تھا مگر لکھنؤ میں اس کے بہت سے کارخانے جاری ہو گئے اور سب جگہ سے اچھا بننے لگا۔

چند روز بعد جوتوں کی آرائش میں اور ترقی ہوئی اور سلمے ستارے کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے۔ جن میں منقش کے پھندنے لگا کے عجیب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی جاتی۔ اس کے بعد جب جھوٹا سلما اور کلابتون آیا تو جھوٹے کام کے چڑھوّیں جوتے بننے لگے جو بہت سستے داموں میں عجب بہار دکھایا کرتے۔

لیکن چڑھوّیں کے ساتھ ہی ساتھ یہاں ایک گھتیلا جوتا مروّج تھا۔ جو دراصل پُرانے کفش نما جوتوں سے ماخوذ تھا اور عالی مرتبہ امیروں اور اکثر اعلا طبقے کے شریفوں میں علی العموم پہنا جاتا تھا۔ دراصل یہی ہندوستان کا پُرانا قومی جوتا تھا اور اسی کی یادگار حیدر آباد کی چپّل اور دیگر مقامات کے دیسی جوتے ہیں۔ اور یہی اگلے اہلِ دربار اور وطنی بزرگانِ سلف کے پانو میں نظر آتا ہے۔ گھتیلے میں اتنی ترقی ہوئی کہ اُس کی نوک بجاے مختصر رہنے کے ہاتھی کی سونڈ کی طرح بہت بڑھا کے اور پھیلا کے پنجے کے اوپر ایک بڑے حلقے کی صورت میں لپیٹ دی گئی۔ یہ جوتا اودھ کے اگلے بادشاہوں اور وزرا و امرا سب کے پانو کی زینت ہوا کرتا۔ چڑھوّیں جوتے نے ایجاد ہونے کے بعد اس کی جگہ لینا شروع کی۔ یہاں تک کہ غدر ہوتے ہوتے گھتیلا فقط عورتوں کے پانو میں رہ گیا جن کے نازک پانو کا وہ عام لباس تھا اور مردوں کی پوشاک سے وہ بالکل خارج ہو گیا۔ لیکن کفشیں اپنی اصلی صورت پر آج تک باقی ہیں جو شیعیانِ علیؑ کے اتقیا و صلحا خصوصًا مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہیں۔

گھتیلے جوتوں، کفشوں اور اُن پر جو کارچوبی کام بنایا جاتا ہے، اُس نے مسلمانانِ لکھنؤ میں دو خاص پیشے پیدا کر دیے جن پر بہت سے لوگوں کی معاش کا دارومدار ہو گیا۔ پہلے تو مسلمان موچی، جن کی یہاں ایک مستقل قوم اور برادری ہے۔ یہ لوگ سوا گھتیلے جوتے بنانے کے اور کسی قسم کا جوتا بنانا اپنی شرافت کے خلاف جانتے ہیں۔ لکھنؤ میں ان لوگوں کے بہت سے گھر تھے اور سب سچے مسلمان، سفید پوش اور بہ مقابل دوسرے ادنا طبقے والوں کے ممتاز تھے۔ اور اگلے دنوں نہایت فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ لیکن اب قدیم وضع و لباس کے بدلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مردوں کے بعد عورتوں نے بھی گھتیلا جوتا بالکل چھوڑ دیا۔ اور بازار جو اعلا درجے

کے گھیتلے جوتوں سے بھرا رہتا تھا، اُس میں اب اگر کسی دُکان پر اس وضع کا ایک آدھ جوڑا مل بھی جاتا ہے تو بہت ہی ذلیل و حقیر، پُرانا، ماند اور میلا ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان موچیوں کا گروہ بالکل تباہ ہو گیا۔ اُن کے بیسیوں گھر اجڑ گئے۔ اور جو باقی ہیں، قعرِ فنا کے بالکل کنارے ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کی وضع داری کی داد دینا چاہیے کہ لُٹ گئے اور تباہ ہو گئے مگر یہ نہ گوارا کیا کہ گھیتلے جوتوں کے عوض سلیپر یا بوٹ بنائیں۔ اور رفتارِ زمانہ کا ساتھ دے کے، پہلے سے زیادہ ترقی کریں۔

دوسرا گروہ، اہلِ حرفہ، جو اُن کی جوتیوں کے صدقے میں پیدا ہوا، جوتوں کی چھوٹی اوکھیاں بنانے والوں کا ہے۔ اوکھی، کارچوبی کام کے اُن مختلف قطع کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو زنانے یا مردانے جوتوں پر لگائے جاتے ہیں۔ اوکھیاں یہاں بہت ہی نفیس، زرق برق، اعلا درجے کی ایسی نفیس بنتی تھیں جیسی کہیں نہ بن سکتی تھیں۔ اور اُن کی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ اُکھی کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا

بہ ہر حال، گھیتلے جوتوں کے فنا ہونے سے ان دونوں گروہوں کو نقصان پہنچا۔ اب گھیتلے کے عوض عورتوں میں عموماً سلیپروں کا اور خاص گھرانوں یا خاص موقعوں کے لیے تمام شریف بیبیوں میں اعلا درجے کے پمپ شوز کا رواج ہے۔ دولت مند گھرانوں میں گھیتلا جوتا چھوڑ کے ٹاٹ بافی (یعنی کارچوبی کام کے) بوٹ پہننا شروع کیے تھے۔ اُن کے چند ہی روز بعد چمڑے کے بوٹ جو بغیر کھولے پانو سے اتر سکیں، پہنے جانے لگے۔ اور اب تو علی العموم پمپ شوز اور جن لوگوں نے پوری انگریزی وضع اختیار کر لی ہے، اُن کی بیگمیں تو ہر قسم کے لیڈیز شوز پہننے لگی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں عورتوں کے عام لباس کو

بھی بیان کر کے ہم وضع ولباس کی بحث کو ختم کردیں۔

ہندوستان میں عورتوں کا قدیم لباس صرف ایک بے سی ہوئی لمبی چادر تھی، جو آدھی کمر سے لپیٹ کے باندھ لی جاتی اور آدھی کندھے یا سر پر ڈال کے اوڑھ لی جاتی۔ اس کے ساتھ سینے کا ایک لباس بھی ہندوؤں کے پرانے زمانے سے چلا آتا ہے جو بلندیِ ہند میں، انگیا، اور جنوبی ہند میں چولی کہلاتا ہے۔ یہ لباس سری کرشن جی کے زمانے میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجود تھا۔ آخر زمانے میں چولی اور انگیا کی تفریق یوں ہوئی کہ دکھن میں ایک جھول دار پٹی ہے پیچھے سے آگے کی طرف لا کے دونوں چھاتیوں کے درمیان میں گرہ دے کے، یا بوتام لگا کے کس دی جاتی ہے اور دونوں چھاتیاں اس جھول میں کسی قدر ابھار کے ساتھ دبی اور کسی رہتی ہیں۔ یہی دکھن کی چولی ہے۔ بہ خلاف اس کے بلندیِ ہند میں انگیا یوں بنتی ہے کہ پستانوں کے مناسب ناپ کے کپڑے کی دو کٹوریاں بنائی جاتی ہیں جو دو تین انگل تک باہم سی کے جوڑ دی جاتی ہیں۔ اور ان کے بالائی کونوں پر جالی کی دو چھوٹی چھوٹی آستینیں لگا دی جاتی ہیں۔ اور ان آستینوں کے نیچے دونوں پہلوؤں پر دو دو بند لگا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح تیار کر کے اور دونوں ہاتھوں کو آستینوں میں ڈال کے یہ انگیا پہن لی جاتی ہے۔ آستینیں بہت ہی چھوٹی آدھے بازوؤں سے بھی کم رہتی ہیں۔ اور چھاتیوں کی کٹوریوں میں ڈال کے پیٹھ پر بند کھینچ کے نیچے اوپر دو بندشیں دے دی جاتی ہیں۔ بخلاف چولی کے، انگیا چھاتیوں کو اصل سے زیادہ ابھار کے نمایاں کر دیتی ہے۔

بہرحال یہ پرانا ہندو لباس ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ مرورِ زمانہ سے اس میں کیا اصلاحیں یا ترقیاں ہوئیں۔ بادی النظر میں انگیا زیادہ ترقی یافتہ اور بعد کی اصلاح معلوم ہوتی ہے۔

اس کے سوا ہندو زمانے میں عورتوں کا اور کوئی لباس نہیں معلوم ہوتا۔ سیے ہوئے کپڑے اور کرتا یا پائجامہ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ مسلمانوں کی عورتیں ملک عجم سے عرض کے ڈھیلے پائنچوں کے پائجامے پہنے ہوئے یہاں آئیں۔ جو ٹخنوں پر چنٹ دے کے باندھ دیے جاتے تھے۔ چند روز بعد وہ پائجامے، تنگ مُہری کے گھٹنے ہوگئے۔ جن کا گھیرا اوپر سے ڈھیلا ڈھالا ہوتا۔ رفتہ رفتہ اُن میں کھنچاو کا شوق بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اوپر کا گھیر بھی کم ہوگیا اور پائنچوں کی مُہریاں تو اس قدر تنگ ہوگئیں کہ پہننے کے بعد کس کے سی لی جاتیں اور اتارتے وقت مُہری کے ٹانکے توڑنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ جیسے پائجامے آج بھی بہت سے شہروں میں مروّج ہیں۔

لکھنؤ میں مسلمان بیگموں کی وضع ابتداً تو یہی تنگ مُہری کا کھنچا ہوا پائجامہ، سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینوں کی کھنچی ہوئی انگیا، اور پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لیے ایک عجیب و غریب کُرتی جو آگے کی طرف اُس حد تک کاٹ دی جاتی، جہاں تک جسم پر انگیا کا تصرّف رہتا۔ اس میں نہ آستینیں ہوتیں اور نہ سینے پر اس کا کوئی حصہ رہتا۔ وہ لمبے بندوں کے ذریعے سے جو شانوں پر سے ہو کے آتے، پیٹ اور پیٹھ پر معلّق ہوتی۔ اس کے اوپر تین گز کا چُنا ہوا باریک دوپٹّا جو سر سے اوڑھا جاتا۔ لیکن آخر میں فقط شانوں پر پڑا رہنے لگا۔

ہندوستان کے موسم اور مزاجوں کی نزاکت نے محرم، کُرتی اور دوپٹّے سب کو روز بہ روز سبک کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ لاہی کی انگیا اور کریب کے دوپٹّے وضع دار امیر زادیوں کے فیشن میں داخل ہوگئے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے سے گھٹنے رخصت ہوگئے اور ان کی جگہ بڑے بڑے گھیر دار پائنچوں کے کلیوں دار پائجامے جو کمر کے پاس بہت ہی تنگ ہوتے اور جو رکلی یعنی میانی خوب کھنچی رہتی، علی العموم رواج پاکے عورتوں کی خاص وضع قرار پاگئے۔ یہ پائنچے آگے کی طرف ایک

نفاست وخوش نمائی کے انداز سے ناف کے نیچے گھرس لیے جاتے تاکہ چلنے پھرنے میں زمین پر لوٹ کے خراب اور میلے نہ ہوں۔ غدر کے قریب زمانے یا شاہی کے عہدِ آخر میں باریک کپڑوں اور آدھی آستینوں کے تنگ شلوکوں کا رواج ہوگیا۔ جو کُرتی کے عوض پہلے تو محرم کے اوپر پہنے جانے لگے، اور چند روز بعد انھوں نے محرم کی ضرورت بھی اڑادی، مگر اب بھی بہت ہی باریک کپڑوں کے استعمال کیے جانے کی وجہ سے یہ لباس ننگا معلوم ہوتا خصوصاً اس لیے کہ باہیں بالکل ننگی رہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شلوکوں کے عوض کسی قدر ڈھیلے کُرتوں کا رواج ہونے لگا۔ لیکن اب یک بہ یک کُرتوں کی جگہ انگریزی جاکٹ اور باڈس پہنے جانے لگے۔

اب ہر صوبے اور ہر شہر کی وضعوں کا مقابلہ اور اس کے ساتھ باہمی اختلاط سے ہونے لگا ہے (کذا) اور بعض مسلمانوں یا خود خاتونوں کو ساری زیادہ خوش نما نظر آنے لگی۔ جس کی وجہ سے لکھنؤ کی عورتیں آدھے کے قریب پُرانی وضع چھوڑ کے ساریاں باندھنے لگی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس میں زیادہ سادگی ہے۔ میں اگرچہ اس کے خلاف نہیں ہوں کہ عورتیں اپنے حُسن میں جدّت اور تازگی پیدا کرنے کے لیے مختلف لباسوں کو پہنیں اور بہ مصداق ؎

ہر لحظہ بوضعِ دگر آں یار برآید

نئی نئی دھجوں سے اپنے شوہروں کی دل داری کریں۔ لیکن میں اس کے سخت خلاف ہوں کہ اپنی قومی وضع بالکل چھوڑ دی جائے۔ اور اپنے معاشرتی خصائص بالکل فنا کر دیے جائیں۔ ساری ایک غیر مخیط کپڑا اور تمدّنِ انسانی کے بالکل ابتدائی اور غیر متمدّن زمانے کی یادگار ہے۔ سادگی بے شک دل کش چیز ہے لیکن بہت سی قیدوں اور خصوصیتوں کے ساتھ، ورنہ پوری سادگی تو عریانی میں ہے۔ خود لباس، فطرتِ انسانی کو اپنے تفنّن کا جامہ پہنانا ہے۔ اِس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ساری

میں کیا خاص خوبی و خوب صورتی ہے۔

جس طرح مرد کی طبیعت کا خاصّہ ہے کہ اپنی حسین ترین منکوحہ سے اُکتا کے دوسری جوان عورتوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے نوجوان اپنی بیبیوں کی وضع سے سیر ہوکے دوسری قوموں کی عورتوں کے لباس پر فریفتہ ہوجاتے ہیں۔ مگر خوب یاد رکھیے کہ جس طرح آپ اُن کے لباس پر فریفتہ ہیں، اُسی طرح دوسری قوموں کے مرد آپ کی عورتوں کے ترقی یافتہ لباس میں زیادہ دل کشی و رعنائی پاتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کا ایک مغالطہ ہے جو فی الحال آپ کی نظر میں اپنی عورتوں کے لباس کو معیوب ثابت کرکے بار بار ملک میں یہ بحث پیدا کراتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بیبیوں کے لیے مناسب کیا ہے۔

ہم اس مسئلے پر اچھی طرح بحث کرتے اگر ہمیں یقین ہوتا کہ خالص عورتوں کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی غرض سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ دراصل یہ مسئلہ اُسی تقاضاے طبع سے پیدا ہوا ہے جس نے نوجوانوں کو کوٹ پتلون پہنایا، ہیٹ سے اُن کے سروں کو زینت دی اور سوا رنگت کے ان میں کوئی چیز اپنی نہیں باقی رکھی لہٰذا ہم کو یقین ہے کہ یہ مسئلہ فقط اس جوش میں پیدا ہوا ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی انگریزی لباس اختیار کریں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس بارے میں لکھنا پڑھنا اور کہنا سننا سب بے کار ہے۔ اس لیے کہ جب تک انگریزی سایے اور اسکرٹ اور بانٹ (انگریزنوں کی ٹوپی) پہننے کا فیصلہ نہ کردیا جائے گا ہمارے مصلحانِ معاشرت اور نقالِ موجدانِ فیشن کو چین نہ آئے گا۔ اس کے سوا چاہے اور کیسی ہی اچھی اصلاح و ترمیم کی جائے گی، اُن کا اطمینان نہ ہوگا۔

غرض اس انجام کو سوچ کے، اس بارے میں اخباروں اور رسالوں کے صفحے سیاہ کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں۔

(۳۷)

لباس کے متعلق لکھنؤ میں تراش وخراش اور کپڑوں کی نوعیت میں روز بہ روز ترقی ہوتی رہی۔ گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے ادنا طبقے والے سوا ستر پوشی کے اپنا سارا بدن برہنہ رکھتے ہیں۔ یہ صرف ان کے افلاس اور اہل ملک کی کم مایگی کے باعث نہیں، بلکہ موسم اور آب و ہوا کے تقاضے سے ہے۔ اس کا اثر دہلی میں بھی یہ تھا کہ بجائے گندہ اور گراں کپڑوں کے، سبک اور نازک کپڑے اختیار کیے گئے۔ یہاں اس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ اور چوں کہ اب سپہ گری و جنگ جوئی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی۔ عیش پرستی اور عورتوں کی صحبت بہت بڑھتی جاتی تھی، اس لیے مردوں پر عورتوں کی وضع کا اثر پڑنے لگا، جو اعتدال سے باہر ہوگیا۔ اور جس قسم کی زینت و آرایش عورتوں کے لیے موزوں ہے، مردوں نے اپنی وضع اور اپنے لباس میں اختیار کرنا شروع کردی۔

خصوصاً اُس زمانے سے جب کہ یہاں کے حکم رانوں نے اپنے لیے نواب کا لفظ چھوڑ کے، بادشاہ کا لفظ اختیار کیا۔ نیشاپوری اور رسالار جنگی خاندان کے لوگ جو معتمد بہ وثیقے اور پنشنیں پاتے تھے، بالکل خانہ نشیں کردیے گئے، تو اُن کو سوا عورتوں کے کسی کی صحبت ہی نہ نصیب ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اُن کی وضع اور لباس ہی میں زنانہ پن نہیں پیدا ہوا بلکہ اُن کی زبان بھی عورتوں کی سی ہوگئی۔ اور چوں کہ وہی شہر کے رئیس اور وضع دار تصور کیے جاتے، لہٰذا اکثر عوام نے بھی اُن کی پیروی شروع کردی۔ اور برخلاف دیگر مقامات کے رئیسوں کے، یہاں لکھنؤ میں یہ عام وضع ہوگئی کہ سر پر مانگ، اُس پر مسالے کی کام دار ٹوپی، کانوں تک بال جن کی کنگھی کرنے میں ماتھے پر دونوں جانب پٹیاں جمائی جاتیں، منہ میں پان، ہونٹوں پر لاکھا، بدن پر تنی تنی کمر تو بیوں کا چست انگرکھا، اُس کے نیچے گلبدن کا ریشمی

کھنچا ہوا گھٹنا، ہاتھوں میں مہندی، پانوں میں ٹاٹ بافی یعنی کام دار بوٹ، جاڑوں میں انگرکھے کی جگہ نیلے، زرد یا سبز و سرخ، اطلس یا گرنٹ کا روئی دار دگلا۔

جاڑوں میں یہاں کے بعض معزز لوگ عموماً شال کی قبائیں پہنتے۔ مگر دوشالے اور شالی رومال کو سب پسند کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسا شال لکھنؤ والوں میں اب بھی کہیں کہیں نکل آتا ہے، ویسا شال ہندوستان کیا معنی شاید خود کشمیر میں بھی اب نصیب نہ ہو سکے گا۔

شال کا شوق یہاں تک بڑھا کہ بہت سے شال بُننے والے اور ہزاروں رفوگر اور شال کے دھونے والے کشمیری اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آ بسے جن کا گذشتہ پچاس سال میں اب نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ اُن میں سے کوئی بچا بھی تو اُس نے کوئی اور پیشہ اختیار کر لیا۔

مُحرّم چونکہ لکھنؤ میں ایک بڑی اہم چیز اور عزاداری کا زمانہ تھا اس لیے سوگ واری اور نفاست و نزاکت کا لحاظ رکھ کے، یہاں مُحرّم کے لیے خاص لباس اور خاص زیور ایجاد ہو گیا۔ سیاہ اور نیلے رنگ غم و سوگ واری کے رنگ سمجھے گئے۔ اور سبز رنگ اس لیے کہ بنی عباس کے عہد میں اُن کے سیاہ رنگ کے مقابل بنی فاطمہؓ کا رنگ سبز تھا چنانچہ آج بھی ایران و ہند کے بعض فاطمی اپنے سبز عماموں سے سیّدوں کی اُس قدیم وضع کا ثبوت دے دیا کرتے ہیں۔ بہر تقدیر مُحرّم میں سرخ رنگ ممنوع قرار پایا۔ سبز، نیلا، اور سیاہ رنگ اور ان کے ساتھ زرد رنگ بھی اس موسم کے لیے مناسب سمجھے گئے۔ چنانچہ یہاں مُحرّم میں تمام عورتوں کا لباس انھی مذکورہ رنگوں سے مناسب جوڑ لگا کے منتخب کیا جاتا۔ سارا زیور بڑھا دیا جاتا۔ حتیٰ کہ چوڑیاں تک اتار ڈالی جاتیں جن کے عوض کلائیوں کے لیے ریشم کی سیاہ و سبز پہنچیاں اور کانوں کے لیے سیاہ و زرد ریشم کے کرن پھول

ایجاد ہوئے۔ جو سونے چاندی کے زیور سے بھی زیادہ نفاست کے ساتھ اُن کی زیبائی ورعنائی بڑھا دیا کرتے ہیں۔

محرّم تو نہایت ہی اہم مہینا تھا، یہاں ہر موسم اور ہر زمانے کے مناسب ایسی ایسی ایجادیں عورتوں کے لباس میں روز ہوتی رہتی تھیں جن کو سارا ہندستان حیرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج سے پچاس سال پیش تر لکھنؤ میں عورتوں کے لباس کی تراش خراش اور روز روز کی تازہ جدتوں کو جو دیکھتا، وہ فرانس اور لندن کے فیشن بدلنے کو بھول جاتا۔ اور اسی بنا پر اکثر زبانوں پر جاری ہو گیا کہ لکھنؤ، مشرق کا پیرس ہے۔ آج بہت سے سادگی پسند اور ترقی یافتہ معاشرے سے محروم رہنے والے اِن تکلّفات پر اعتراض کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ جن درباروں اور شہروں میں تمدّن ترقی کرتا ہے، وہاں معاشرت وصحبت کے ہر شعبے میں ایسی ہی باتیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ جو ایک فلسفی کی نظر میں لغو و فضول ہوں مگر وضع داروں کی صحبتیں اور شایستہ لوگوں کی محفلیں ان کو نہایت ہی اہم اور ضروری تصوّر کرتی ہیں۔

مردوں پر عورتوں کی وضع کے غالب آنے کا اثر اگر کپڑوں کی نزاکت اور تیز بھڑکیلے رنگوں تک محدود رہتا تو بہت غنیمت ہوتا، یہاں تو بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ میاں بیوی کے دگلوں، دوپٹوں، دُلائیوں، رضائیوں اور پائجاموں میں کسی قسم کا فرق ہی نہیں رہا۔ بہ جز اس کے کہ گوٹا پٹھا اور زیور عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگوں کے نازک ریشمی کپڑے بغیر گوٹے پٹھے کے پہنتے مگر یہ مذاق غدر کے بعد انگریزی اثر سے گھٹنے لگا۔ اور اب صرف چند گنتی کے لوگوں کے سوا کسی میں نہیں باقی رہا۔

مرد خدمت گاروں اور ان کے مختلف طبقات کی طرح یہاں عورتوں کے

مختلف طبقوں کی بھی خاص خاص وضعیں قرار پا گئیں۔ انگریزوں کے خانساماں، کوچ مین، اور سائیس مختلف وردیوں میں رہتے ہیں۔ مگر وہ وردیاں اُن کا اصلی لباس نہیں قرار پا سکیں کہ اپنے گھروں میں بھی وہ اُن کو پہنا کرتے ہوں بخلاف اس کے لکھنؤ میں زنانے اور مردانے نوکروں اور اندر باہر کے تمام ملازموں کے لیے جو خاص خاص لباس مقرر ہو گئے تھے، وہی اُن کی اصلی وضع قرار پا گئی۔ مثلاً جیسے ڈیوڑھیوں کے پہرے والے سپاہیوں اور چوب داروں، ہرکاروں وغیرہ کی خاص اور جدا جدا وضعیں تھیں، ویسے ہی زنانی محل سراؤں میں محل داروں، مغلانیوں، اور کہاریوں کی وضعیں اس قدر ممتاز تھیں کہ دور سے دیکھتے ہی انسان سمجھ جائے گا کہ یہ عورت محل دار ہے، یہ خواص ہے، یہ مغلانی ہے، اور یہ کہاری ہے، اور پھر لطف یہ کہ اُن کے لباس میں وردی کی شان نہیں پیدا ہونے پائی۔

خدمت گاروں اور اُکھی کی طرح پیش خدمتوں کا البتہ وہی لباس تھا جو خود میاں بیویوں کا لباس تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں گروہ اپنے مالک یا مالکہ کا اُتارن یعنی اُن کے اُترے ہوئے کپڑے پہنا کرتے ہیں۔

لباس کے بعد عورتوں کے لیے سب سے اہم چیز زیور ہے۔ اور عورتیں اکثر اپنی مخصوص دولت و جائداد اپنے زیور کو سمجھتی ہیں جس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اکثر صوبجاتِ ہند میں بھدّے اور بھاری زیور کا زیادہ رواج ہے تاکہ وہ قیمت میں زیادہ ہوں۔ زیور کے بھاری ہونے کا شوق اودھ کے دیہات میں اور عموماً ہندوستان کے تمام شہروں میں روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ مگر لکھنؤ میں دلّی کے شریف خاندانوں کی معزز خاتونیں آئیں تو ابتداءً وہی زیور جس کا سارے ہندوستان اور خود دلی میں رواج تھا، پہنے ہوئے تھیں۔ مگر یہاں آنے کے چند روز بعد جب یہاں کی ترمیم شدہ مخصوص معاشرت قائم ہوئی تو زیور میں فقط زینت و آرائش کا خیال باقی رہ گیا۔ اور ہر قسم

کا زیور روز بہ روز سبک، ہلکا، نازک، اور خوش نما ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر عہد میں اُمرا اور دولت مند گھرانوں کی بیویوں کی یہ وضع ہو گئی کہ سادے بغیر مسالے اور گوٹے بیٹھے کے کپڑے پہنتیں اور زیور کی قسم کی دو ہی ایک چیزوں پر جو بہت ہی نازک سبک اور قیمتی ہوتیں، کفایت کرتیں۔ اور اگر گلے اور ناک کان میں متعدد چیزیں پہنتیں بھی تو وہ بہت ہی ہلکی ہوتیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا سبک اور ہلکا زیور لکھنؤ میں بننے لگا، کہیں نہ بن سکتا تھا۔

ناک میں نتھ، ہندوؤں کے عہد سے نہایت ہی ضروری زیور اور سہاگ کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ جو خیال باہمی میل جول سے مسلمانوں میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ دیہات والیاں آج بھی اِس کے بھاری کرنے میں یہاں تک مبالغہ کرتی ہیں کہ چار چار پانچ پانچ تولے کی نتھیں پہن لیتی ہیں، جن سے اکثر نتھنے پھٹ جاتے ہیں، مگر دوبارہ ناک چھدوائی جاتی ہے تاکہ ناک نتھ سے خالی نہ رہے۔ لکھنؤ کی بیویوں نے نتھ کو اُڑا ہی دیا۔ اور اُس کی جگہ سونے کی مرصّع کیل پہننے لگیں۔ جو بہت ہی نفیس اور خوب صورت زیور ثابت ہوئی۔ اور نزاکت پسندی نے ان کیلوں کو بھی اتنا مختصر اور سبک کر دیا کہ سبک ناک کی کیلیں، لکھنؤ کے سناروں اور سادہ کاروں کے سوا اور کہیں کے کاریگر نہیں بنا سکتے۔

اب اِدھر پچّیس تیس سال سے بُلاق کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی پسندیدہ مذاق نہیں، مگر زیور کے اختصار اور عام پسندی نے اِسے اِس قدر ترقی دی ہے کہ اب بہت کم عورتیں ہیں جو بُلاق نہ پہنتی ہوں۔

فی الحال مختلف شہروں کے باہمی میل جول سے زیور بنانے کے فن میں ہر جگہ ترقی ہو رہی ہے۔ اور خاص خاص زیوروں کے لیے خاص خاص شہر مشہور ہو گئے ہیں مگر غدر سے پیش تر جب ریلوے نے بلادِ ہند میں یہ باہمی موانست و یکرنگی نہیں

پیدا کی تھی، لکھنؤ سے اچھے سُنار اور کاری گر کہیں نہ مل سکتے تھے۔ لیکن اب بہت سے شہر اس فن میں لکھنؤ سے بڑھتے جاتے ہیں۔ خصوصاً شہر دہلی مغشوش چاندی کے سبک زیور بنانے میں ہندوستان کے تمام شہروں سے سبقت لے گیا ہے۔ مگر پھر بھی اکثر مقامات کے نفیس مزاج گھرانے لکھنؤ ہی کے بنے ہوئے زیور اور یہاں کے چاندی کے ظروف کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ بحث لکھنؤ کی صنعتوں میں ہمیں بار بار چھیڑنا پڑے گی، اِس لیے یہاں اِتنے ہی پر قناعت کرتے ہیں۔

(۳۸)

کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی بحث ختم کر کے اب ہم اُن چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کو سوسائٹی اور میل جول سے خصوصیت ہے اور جن پر مناسب اور اپنے مذاق کا تصرّف کر کے لکھنؤ نے انھیں اپنا بنا لیا۔

دنیا کے ہر ملک میں میل جول اور معاشرت کا ایک تمدّن قائم ہو جاتا ہے جس میں زیادہ تر تعلق وضع قطع، اخلاق و عادات، نشست برخاست، طرزِ کلام، طریقۂ مذاق، مکان اور فرنیچر وغیرہ کو ہوتا ہے۔ اور اِن باتوں کے بعد اُس سامانِ زندگی کو، جس کی اُس سوسائٹی کو ضرورت ہو۔ فطری طور پر یہ چیزیں ہر گروہ، ہر طبقے اور ہر شہر و قریے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور آج بھی دنیا میں پھر کے دیکھیے تو ہر جگہ سوسائٹی کی خاص نوعیت اور اس کے خصوصیات نظر آ جائیں گے۔ مگر جن مقاموں میں کوئی معزز دربار قائم ہو جاتا ہے اور علم و ادب کو ترقی ہوتی ہے، وہاں کی سوسائٹی ایک بڑے حصّۂ ملک کو اپنا تابع بنا کے اُن کے ہر شہر و قریے کی معاشرت کا مرجع اور اصولِ تہذیب کا مرکز بن جاتی ہے۔

ہندوستان میں تہذیب و تمدّن اور آدابِ سوسائٹی کا اصلی مرکز یقینی طور پر

دہلی تھی۔ اِس لیے کہ بہت سی صدیوں تک وہ ہندوستان میں حکومت کا مرکز اور علم و فضل کا منشا و مستقر رہ چکی ہے۔ سارا ہندوستان اُس کے زیر نگیں تھا اور وہاں کی صحبت کے تربیت یافتہ تمام صوبوں کے حاکم اور ادب آموز ہوا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے لیے اُس کے مقابل میں نہ کوئی خصوصیت ہے اور نہ اُسے کوئی امتیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر اِس محل پر لکھنؤ کا نام لیا جانے کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ زمانے کے اتفاق سے پچھلی صدی میں وہی دہلی کی معاشرت پوری پوری لکھنؤ میں منتقل ہوائی۔ اور وہیں کے امرا و شرفا، علما و شعرا، اتقیا و صلحا سب کے سب لکھنؤ میں چلے آئے۔ اور جو دربار دہلی میں اُجڑتا تھا، لکھنؤ میں آکے جمع ہوتا۔ اِس لیے وہاں کے تمام وضع دار لوگ ایک ایک کرکے سب یہیں چلے آئے۔ اور یہاں اطمینان حاصل ہو جانے کی وجہ سے اپنی ترقی یافتہ معاشرت پر اور ترقیاں کرنے لگے۔ اور پھر لطف یہ کہ دہلی والوں کی جو معاشرت اودھ میں آکے قائم ہوئی تھی، اُس میں سوائے دہلی والوں کے کوئی غیر شخص نہ تھا۔ حتیٰ کہ لکھنؤ کے پرانے معزز باشندوں کو بھی اس میں بالکل جگہ نہیں ملی۔

لہٰذا لکھنؤ کی معاشرت دراصل دہلی کی معاشرت اور وہیں کی ترقی یافتہ سوسائٹی کا آخری نمونہ ہے۔ اِس پچھلی صدی میں دہلی کے پرانے تمدن کے دو اسکول ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو خاص دہلی میں موجود تھا اور دوسرا وہ جو لکھنؤ میں منتقل ہو آیا۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ زوال سے بیش تر کی آخری صدی میں اُس اسکول کے لیے جو دہلی میں تھا، دربار مغلیہ کے کمزور پڑ جانے اور دولت مندی کے مٹ جانے کی وجہ سے میدانِ ترقی میں آگے قدم بڑھانے کا ویسا موقع نہیں نصیب تھا، جیسا لکھنؤ والے دہلی کے اسکول کو حاصل تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ اُس زمانے میں لکھنؤ کا تمدن ترقی کر رہا تھا، اور دہلی کے قدیم تمدن کی ترقی رُک گئی تھی۔

الغرض یہی ترقیاں لکھنؤ کی سوسائٹی کے خصوصیات ہیں۔ بلکہ غور کرنے سے یہ

نظر آتا ہے کہ دہلی میں تمدن و معاشرت کو قدیم شہنشاہی دربار کی برکتوں سے جو ترقی حاصل ہوئی تھی، پچھلے دور میں تجارت پیشہ جاہل قوموں کے غلبے اور قدیم خاندانی شرفا کے دیگر بلاد میں منتشر ہونے یا خانہ نشین ہو جانے کے باعث وہ بھی تشریف لے گئی۔ اور سچ یہ ہے کہ اودھ کے شاہی دربار کے ٹوٹ جانے کے بعد سے بیرونی لوگوں کے میل جول اور پرانے مہذب خاندانوں اور اُن کے اثر کے مٹ جانے کی وجہ سے جو تہذیب لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھی، وہ بھی روز بہ روز رخصت ہوتی جاتی ہے۔

مگر ہمیں اُس بدتمیزی کی سوسائٹی اور اُن متمردانہ اخلاق و آداب سے بحث نہیں جو غدر کے بعد سے لکھنؤ میں پیدا ہونا شروع ہوئے، اور ترقی کرتے جاتے ہیں۔ ہماری غرض محض اُس تہذیب کو بتانا ہے جو لکھنؤ کے شاہی دربار کے آغوش میں پرورش پا کے یہاں کی صحبتوں میں پیدا ہو گئی تھی۔

یہاں کی معاشرت کے متعلق اپنے اِس مضمون کے سلسلے میں ہم مندرجۂ ذیل اُمور کو بیان کرنا چاہتے ہیں (۱) مکان (۲) فرنیچر (۳) وضع قطع (۴) اخلاق و عادات (۵) نشست برخاست (۶) صاحب سلامت و مزاج پرسی (۷) طرزِ کلام (۸) طرز مذاق (۹) شادی و غمی کی محفلیں (۱۰) مجلسیں (۱۱) مولد شریف کی محفلیں۔ پھر ان کے بعد ہم اُن چیزوں کو بیان کریں گے جو لوازمِ صحبت اور سامانِ معاشرت ہیں۔

مکان: دہلی اور لکھنؤ میں مکانوں کے متعلق پُرانا مذاق یہ تھا کہ ظاہری نمائش اور شان داری صرف شاہی قصروں اور ایوانوں کے لیے مخصوص تھی، اُمرا و تجار اپنے رہنے کے لیے جو مکان تعمیر کراتے، وہ اندر اندر سے چاہے کیسے ہی وسیع اور نفیس ہوں مگر اُن کی ظاہری حالت بالکل معمولی مکان کی سی ہوتی۔ اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ جو مکان ظاہر میں شان دار ہوتے، اکثر بادشاہوں کو پسند آ جاتے، اور بنوانے والوں کو اُن میں رہنا بہت کم نصیب ہوتا۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ رعایا میں سے کسی کا تعمیر مکان

میں شاہانہ اولوالعزمی دکھانا، تمرّد و سرکشی پر محمول کیا جاتا اور اُسے سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا۔

اسی وجہ سے آپ کو دہلی میں مقبروں کے سوا قدیم الایام کی ایک بھی ایسی عمارت نہ نظر آئے گی جو عالی شان ہو، اور رعایا میں سے کسی عالی مرتبہ امیر یا دولت مند تاجر کی بنوائی ہوئی ہو۔ لکھنؤ میں بھی ابتداءً یہی حال تھا۔ نوّاب آصف الدّولہ اور نوّاب سعادت علی خاں کے زمانوں میں دولت مند فرانسیسی تاجر مسیو مارٹن نے دو ایک عالی شان عمارتیں تعمیر کیں مگر اُن کی تعمیر میں اصلی منشا یہ تھا کہ فرماں روا لے شہر کو پسند آئیں اور اُس کے ہاتھ فروخت کر ڈالی جائیں۔ انھیں عمارتوں میں لامارٹینز کلیج ہے، جس پر نوّاب سعادت علی خاں کی جُزرسی کی وجہ سے اسٹیٹ کا قبضہ نہ ہو سکا۔ یہ وہی کوٹھی ہے جو فی الحال عوام میں "مارکین صاحب کی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد یہاں کے ایک وزیر روشن الدّولہ نے اپنے رہنے کے لیے ایک عمدہ عمارت بنوائی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ سلطنت کے حکم سے ضبط کر لی گئی اور انتزاعِ سلطنت کے وقت اس کا شمار مقبوضاتِ شاہی میں تھا چنانچہ انگریزی دَور میں وہ سرکاری جایداد ہونے کے باعث گورنمنٹ کے قبضے میں آگئی۔ اور روشن الدّولہ کے ورثہ کو نہیں دی گئی۔ مگر آج تک وہ روشن الدّولہ ہی کی کوٹھی کہلاتی ہے۔ گو کہ اس میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور ان کے اسسٹنٹ اجلاس کرتے ہیں۔

رعایا کے عام مکانوں کی وضع یہاں یورپ کے کوٹھی نما مکانوں سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ یورپ میں مکان کے اندر صحن کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس لیے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی پردہ نہ کرنے کی وجہ سے باہر جا کے کُھلی فضا میں ہوا کھا لیتی ہیں لہٰذا وہاں کے خلاف یہاں ضرورت ہے کہ مکان کے اندر صحن ہوا کرے تاکہ عورتیں گھر

کے اندر ہی کھلی فضا کا لطف اُٹھا سکیں ۔

اِس ضرورت اور یہاں کی معاشرت کے دیگر تقاضوں نے یہاں کے مکانوں کی عام قطع یہ کر دی ہے کہ بیچ میں صحن، اُس کے گرد عمارت، اُس عمارت میں ایک رُخ صدر قرار دے دیا جاتا ہے اور اُدھر اینٹ چونے کے ستونوں پر کم از کم تین اور کبھی اس سے زیادہ محراب دار در قائم کیے جاتے۔ محرابیں عموماً شاہجہانی محرابوں کے نمونے کی ہوتی ہیں یعنی ان میں چھوٹی چھوٹی قوسوں کو خوش نمائی سے جوڑ کے بڑی محراب بنائی جاتی ہے۔ صدر میں اکثر ایسی محرابوں کے دوہرے تہرے ہال ہوا کرتے ہیں۔ پچھلا ہال کبھی دروازے لگا کے ایک بڑا کمرہ بنا دیا جاتا ہے اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تقریباً کمر تک اس کی کرسی بلند کر کے وہ شہ نشین بنا دیا جاتا ہے۔

ان بڑے ہالوں کے دونوں پہلوؤں پر کمرے ہوتے ہیں۔ اور ہال کی چھت اتنی اونچی ہوتی ہے کہ پہلو میں تلے اوپر دو کمرے ہال کی ایک چھت کے اندر آجاتے ہیں۔

اب صحن کے دونوں پہلوؤں پر اس کے طول کے مناسب دالان، کمرے اور کوٹھریاں بنا دی جاتی ہیں جن میں باورچی خانہ، پاخانہ، مودی خانہ، زینہ، کنواں، اور ماما اصیلوں کے رہنے کے مقامات ہوتے ہیں۔ صدر دالان کے مقابل جانب بھی اگر ضرورت معلوم ہوئی یا استطاعت ہوئی تو ویسے ہی عالی شان دالان اِدھر بھی بنا دیے جاتے ہیں، جیسے کہ صدر جانب ہوتے ہیں۔ دروازہ اکثر پہلو میں یعنی اُن سمتوں میں ہوتا ہے جدھر باورچی خانہ اور شاگرد پیشہ کے رہنے کے کمرے ہوتے ہیں جس کے سامنے اندر کے رُخ پر مقابل اور ایک پہلو میں قدِ آدم سے ذرا بلند ایک دیوار قائم کر دی جاتی ہے، تاکہ دروازے سے اندر کا سامنا نہ رہے۔

غریبوں اور اوسط درجے والوں کے مکانوں میں اکثر پختہ محرابوں کے عوض اسی وضع کے چوبی سہ درے قائم کر کے، دالان بنا دیے جاتے ہیں جن میں صدر میں اور کبھی اُس کے مقابل جانب بھی دالان در دالان ہوتے ہیں۔ اِس قسم کے جو مکان زیادہ مکمل

ہوتے ہیں، اُن میں چاروں طرف سہ درے اور دالان ہوتے ہیں۔ اور اُن کے پہلوؤں میں ایک ایک دروازے کی کوٹھریاں نکلتی ہیں، جو مختلف ضروریات کا کام دیتی ہیں اور انھی میں سے کسی میں باہر کا دروازہ ہوتا ہے۔

یہ یہاں کے مکانوں کا ایک عام خاکہ تھا۔ مگر اسی مجموعی وضع کو قائم رکھ کے اکثر مکانوں میں نیچے اور ہر جگہ ایسی حکمت اور خوش اسلوبی سے یکدر ے، کمرے اور کوٹھریاں نکالی جاتی ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے اتنی تھوڑی سی جگہ میں اتنی مکانیت کیونکر آگئی۔

فن عمارت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو نظر آئے گا کہ ابتداً پست عمارتیں بنتی تھیں پھر بلند اور مضبوط مگر سادی عمارتیں بننے لگیں۔ اس کے بعد زیب و زینت کے لیے اُن پر نقش و نگار بننے لگے، پچّی کاری کی ایجاد ہوئی، اور عجیب و غریب طریقے سے رنگ آمیزیاں کی جانے لگیں۔ لیکن باوجود ان سب کمالوں کے اب تک بڑے بڑے چوڑے آثاروں کی دیواریں ہوتیں اور ان میں بڑے بڑے ہال اور دیوان خانے بنا دیے جاتے۔

سب سے بعد کا کمال ہندوستانی عمارت میں یہ تھا کہ درزی کی سی کتربیونت کرکے تھوڑی سی زمین میں بہت زیادہ مکانیت نکال دی جائے۔ عمارت کا یہ کمال خاص دہلی سے شروع ہوا۔ وہیں اس نے بڑے اعلا درجے تک ترقی کرلی۔ وہاں سے سب جگہ پھیلا اور لکھنؤ میں اس نے سب مقامات سے زیادہ ترقی کی۔

آج کل بڑے بڑے استاد انجنیر موجود ہیں، جنھوں نے بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنوائی ہیں۔ وہ نمائشی طور پر عمارت کی ایک نہایت ہی خوب صورت اور شان دار شکل قائم کردیں گے۔ لیکن یہ کام فقط پرانے کاری گروں کا حصّہ ہے کہ زمین کے ایک چھوٹے ٹکڑے پر عالی شان عمارت بنا کے کھڑی کردیں۔ اور اس میں مہندسانہ کمال سے اتنے دالان، کمرے، کوٹھریاں اور صحنچیاں نکال دیں کہ دیکھنے والے کی عقل چکّر میں آجائے۔ اندرونی پردے کی دیواریں اتنی پتلی، نازک، سبک اور اس کے

ساتھ مضبوط ہوں کہ معلوم ہو اینٹ چونے کی دیواریں نہیں، لکڑی کی اسکرینیں ہیں۔

عمارت میں لکھنؤ کی یہی خصوصیت تھی جس کو اگلے دربار نے نشوونما دیا۔ مگر اب انگریزی عہد میں یہ کمال ناقدری کی وجہ سے مٹتا جاتا ہے۔ پُرانے کاری گر فنا ہو گئے اور جو دو ایک باقی ہیں، اُن کی قدر نہیں۔

مگر پُرانے ہی زمانے سے ہندو مسلمانوں کے مکانوں میں ایک بیّن فرق چلا آتا ہے، جو آج تک موجود ہے۔ ہندو اپنے مکانوں میں صحن بہت چھوٹا اور تنگ رکھتے ہیں۔ اور بلا لحاظ اس کے کہ ہوا اور روشنی کا گزر ہوگا یا نہیں، مکانیت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے مسلمان کھلے ہوادار مکان چاہتے ہیں اور مکانیت اُسی درجے تک بڑھاتے ہیں جہاں تک کہ ہواداری اور روشن رہنے میں فرق نہ آئے۔ لیکن باوجود مسلمانوں کے اس مذاق کے، اگلے کاری گروں نے اُن کے ہوادار مکانوں میں بھی اس قدر مکانیت نکالی ہے کہ دیکھنے والے اَش اَش کر جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اُس زمانے کے باکمال معمار دروازوں، کمروں کی محرابوں اور دالانوں اور کمروں کی دیواروں پر مختلف رنگوں سے ایسے نفیس اور اعلا درجے کے نقش و نگار بناتے تھے جیسے اب مشکل سے بن سکتے ہیں۔ اور آج کل مصوّری کا فن بے شک ترقی کر گیا ہے، مگر معمار جیسی نقاشی در و دیوار پر کیا کرتے تھے، وہ مٹ گئی۔ اور عہدِ جدید کی سادگی پسندی کی وجہ سے روز بہ روز مٹتی جاتی ہے۔ تاہم اب بھی یہاں اس کام کے بعض استاد معمار ایسے پڑے ہیں کہ اُن کی سی نقاشی شاید کسی شہر کے معمار نہ کر سکیں گے۔ نقش و نگار ہی نہیں وہ چھتوں اور دیواروں پر اعلا درجے کی تصویریں بھی بنا سکتے ہیں۔

معماروں ہی پر منحصر نہیں، اُس وقت کے بڑھئیوں کو بھی یہی کمال حاصل تھا۔ وہ چاہے اعلا درجے کی میزیں کرسیاں اور الماریاں یا ریلوے ٹرین کی گاڑیاں

نہ بنا سکیں، مگر ستونوں، محرابوں، اور دروازوں کے چوکھٹ بازوؤں پر ایسے نفیس و نازک نقش و نگار کھود کے بنادیا کرتے تھے، جیسے آج مشکل سے بن سکیں گے۔

(۳۹)

معاشرت میں دوسری چیز مکانوں کا فرنیچر یعنی وہ سامان ہے جس سے مکان آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اُن دنوں آج کل کی سی میز کرسیاں نہ تھیں بلکہ خاص ہندوستانی اور اسلامی مذاق کا سامان تھا۔ مکانوں میں تختوں کے چوکے ہوتے، پلنگ ہوتے، یا تختوں کے اوپر بچھانے کے لیے نازک اور خوش نما پلنگڑیاں ہوتیں۔ غریبوں اور متوسط حیثیت والوں کے یہاں بانوں کے پلنگ ہوتے۔ اور اُمرا کے گھروں میں علی العموم نواڑ کے پلنگ ہوا کرتے۔

نفیس طبع لوگوں کے گھروں کی یہ شان ہوتی کہ جھاڑو دی ہوئی ہے۔ دیواروں پر سفیدی پھری ہے۔ چھت پر اُجلی سفید چھت گیری کھنچی ہوئی ہے، جس کے چاروں طرف چُنّٹ دی ہوئی جھالر لٹک رہی ہے۔ دالان، کمرے یا صحن میں تختوں کا چوکا ہے۔ اُس پر دری ہے اور دری پر سفید برّاق چاندنی، جو اِس نفاست سے کھینچ کے بچھائی گئی ہے کہ شکن کا کہیں نام نہیں۔ چاروں کونوں پر سنگِ مرمر کے گنبد نما میر فرش، فرش کے کونوں کو دبائے ہوئے ہیں تاکہ ہوا میں چاندنی اُڑنے نہ پائے یا اس میں شکنیں نہ پڑیں۔

اوپر اُجلا فرشی پنکھا ہے، اِس کا بھی بعد کے زمانے میں رواج ہوا۔ ورنہ دراصل اُن مکانوں کی زینت دستی پنکھوں سے ہوتی جو حسبِ مرتبہ اور درجہ و رُتبہ، بڑے تکلف و اہتمام سے بنائے جاتے۔ اور اُن کا حال ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کریں گے۔ اُس چوکے اور فرش پر، خواہ کمرے کے اندر ہو یا باہر، ایک جانب جو صدر مقام قرار پاجاتا، نواڑ کا نفیس

اور خوب صورت پلنگ بچھا ہوتا۔ پلنگ کے اوپر گرمیوں میں دری اور جاڑوں میں توشک ہوتی اور اُس کے اوپر ایک اُجلی چادر بچھی رہتی۔ پلنگ کی چادر میں شاہی محلوں یا اُن کی ہم رتبہ محل سراؤں میں ایک نیچی زمین کے قریب تک کی چینٹ دار جھالر چاروں طرف ٹنکی ہوتی جو پلنگ میں ایک خاص شان پیدا کر دیتی۔ چاروں پایوں پر بچھونے کے چاروں کونے ریشم کی رنگین ڈوریوں سے ایک خوش نما بندش سے باندھ دیے جاتے تاکہ لیٹنے اور کروٹیں بدلنے میں بچھونا کھنچنے اور اپنی جگہ سے سرکنے اور ہٹنے نہ پائے۔

سرھانے، پلنگ کے عرض کے برابر مربّع مستطیل قطع کے پتلے پتلے چار نہایت ہی نرم تکیے ہوتے۔ یہ تکیے اکثر شال باف (ٹول) کے ہوتے اور اُن پر تنزیب یا پتلی نین سکھ کے سفید غلاف چڑھے ہوتے جن میں ٹول کی سرخی اپنی جھلک دکھاتی اور وہ پراٹھے کی پرتوں کی طرح تلے اوپر رکھے جاتے۔ پھر اُن کے اوپر اِدھر اُدھر اُسی کپڑے کے دو ننھے ننھے نرم گل تکیے ہوتے تاکہ کروٹ سے لیٹنے میں گالوں کے نیچے رہیں۔ یہ گل تکیے ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ بڑے نہ ہوتے۔ اس کے بعد بچھونے پر دونوں جانب دونوں پٹیوں کی جانب دو گول تکمیاں رہتیں، جن کو کروٹ لیتے وقت رانوں کے نیچے دبا لینے میں آرام ملتا پائنتی دُلائی، رضائی یا لحاف، موسم کے مناسب لگا دیے جاتے۔ اور دن کو جب کوئی لیٹنے والا نہ ہوتا، سارے پلنگ پر ایک پلنگ پوش پڑا رہتا۔

چوکے پر پلنگ کے آگے صدر نشینی کے لیے فرش کے اوپر ایک قالین مسند کی وضع میں بچھا دیا جاتا۔ اور قالین پر پلنگ سے ملا ہوا گاؤ ہوتا جس پر روز کے استعمال کے لیے تو سفید غلاف رہتا، مگر اعلا تقریبوں کے موقعوں پر نہایت قیمتی ریشمی اور اکثر کارچوبی کام کے غلاف چڑھا دیے جاتے۔

اور اگر چوکے پر پلنگ نہ ہوتا تو اُس کے کسی ایک رُخ پر، جو مناسب معلوم ہو، مسند تکیہ ہوتا اور اُس پر نشست ہوتی۔

دیواروں پر اگرچہ کبھی کبھی تصویریں ہوتیں۔ مگر تصویروں کا جس قدر اب رواج ہے، اُن دنوں نہ تھا۔ بلکہ تصویروں کے عوض عمدہ قطعات، جن پر بڑی نفاست سے نقش و نگار بنائے جاتے، فریم میں جڑ کے دیواروں پر لگا دیے جاتے۔ ان قطعات کا اُس زمانے میں رؤسا کو اس قدر شوق تھا کہ انھی کے لکھنے اور تیار کرنے پر خوش نویسوں کی زندگی بسر ہوتی۔ اور سچ یہ ہے کہ اسی شوق نے اُس زمانے میں وہ تمام ور دیا کمال خوش نویس پیدا کر دیے جو سوا قطعات لکھنے کے، کتابت کو اپنے لیے ننگ اور اپنے معمولی شاگردوں کا کام سمجھتے۔

تختوں کے علاوہ صحن، ڈیوڑھی، اور دروازے کے باہر کی نشست کے لیے مونڈھے ہوتے۔ جو اگرچہ اب بھی کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں، مگر اُن دنوں شریفوں کا کوئی گھر ان سے خالی نہ تھا۔ یہ سیٹھے اور بانوں سے بنائے جاتے، اور جن گھروں میں ان کا زیادہ اہتمام ہوتا، اُن میں اُن مونڈھوں پر بکری کی خشک کھال جس میں بال موجود ہوتے چڑھا دی جاتی۔ یا مضبوطی کے لیے وہی بال دار چمڑا فقط ان کے کناروں پر چڑھا ہوتا۔ یہ مونڈھے اُن دنوں بڑی بکار آمد چیز تھے۔

اُمرا کے سوا، جو زنانے اور مردانے دو مکان رکھتے تھے، عوام اور اکثر متوسط طبقے والے فقط ایک ہی مکان پر زندگی بسر کرتے۔ اب علی العموم کوشش کی جاتی ہے کہ ہر مکان میں دروازے کے پاس کوئی بیرونی کمرہ ضرور موجود ہو۔ اُن دنوں اس کا چنداں خیال نہ تھا۔ بلکہ ڈیوڑھی میں اور اس میں گنجایش نہ ہوتی تو دروازے کے باہر یہی مونڈھے ڈال کے لوگ احباب سے ملتے اور اس میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا جاتا۔

کمروں اور دالانوں کے اندر اکثر طاقوں پر خوش نمائی و زیبائش کے لیے کاغذ کے گل دستے رکھ دیے جاتے۔

دالانوں کی محرابوں کے لیے عموماً پردے ضروری سمجھے جاتے۔ مگر آج کل سینٹھوں، سرکیوں یا ٹاٹ کے پردوں کا جو رواج ہے، اُن دنوں نہ تھا۔ بلکہ اس قسم کے پردے معیوب سمجھے جاتے۔ اور ان کی جگہ تول یا جاجم کے روئی دار پردے تیار کرائے جاتے جو اکثر بندھے رہتے۔ فقط ضرورت کے اوقات میں کھول کے لٹکا دیے جاتے۔ زنانی محل سراؤں کے بیرونی دروازوں پر بھی اسی قسم کے پردے ہوتے، جس کے پاس کوئی ماما یا کہاری اکثر کھڑی نظر آتی۔

(۳) وضع قطع: اِس کا ذکر لباس کے سلسلے میں آچکا ہے۔ مگر اِس موقع پر ہمیں یہ بتانا ہے کہ اُن دنوں شرفا کے مذاق میں اپنے گھر پر اندر یا باہر پورے کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ سر سے پاؤں تک برہنہ رہنا اور فقط ایک تول کی عرقی یعنی مختصر سی لنگی باندھے رہنا معیوب نہ تھا۔ یہ عرقی اِس قطع کی ہوتی کہ جانگھیا کی طرح بجز ستر پوشی کے ٹانگیں بھی ننگی رہتیں۔ فی الحال ہمارے شرفا اپنے گھر پر بھی اندر یا باہر بنیائن، کرتا اور پائجامہ پہنے رہنا لازمی سمجھتے ہیں۔ مگر جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُن دنوں بظاہر ہر گھر میں اتنے کپڑے پہنے رہنا وضع داری کے خلاف تھا۔ اُس وقت بہت سے ایسے لوگ تھے جو فقط گھر سے نکلتے وقت انگرکھا، پائجامہ پہن لیتے۔ اور اس طریقے سے ایک شوب کو مہینوں تک نباہ لے جاتے۔ اور کپڑوں کی یہ حالت ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ آج ہی دھو کے آئے ہیں۔ معمول تھا کہ دھوبی کے وہاں سے آیا ہوا انگرکھا پہنا جاتا تو اس کے دامن، گوٹ اور آستینیں چُنی جاتیں۔ اِس چناوٹ کے نشان مہینوں اُسی طرح برقرار رہتے۔

ہاں عورتوں کے لباس میں البتہ کوئی فرق نہ آتا۔ وہ اپنے گھر میں اُتنے ہی کپڑے پہنے رہتیں جتنے کہیں مہمان جانے میں پہنتیں۔ یہ اور بات ہے کہ آنے جانے کا جوڑا بھاری اور قیمتی ہوتا، اور گھر میں پہننے کا معمولی کسی کے وہاں مہمان جانے کی صورت

میں مرد اور عورت دونوں عمدہ نفیس اور بھاری پوشاکیں پہن کے جاتے۔ اور لباس کی عمدگی کی وجہ سے مردانی و زنانی دونوں صحبتیں بہت صاف ستھری اور بارونق رہتیں۔

(۴۰)

مردوں کی وضع مسلمانوں میں قدیم الایّام سے یہ چلی آتی تھی کہ سر پر بال، کتری ہوئی مونچھیں، اور ڈاڑھی گول اور مقطع۔ مذہبی لوگ علما و زہاد ڈاڑھی کو حسب سنّت نبوی بالکل چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور مونچھوں کے قصر میں کبھی اتنا مبالغہ کرتے کہ منڈا ڈالتے۔ لیکن امرا و شرفا کی وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی کے لیے نیچے گلے کے پاس اور اوپر گالوں پر حدیں قائم کی جاتیں اور جو بال زیادہ بڑھ جاتے اُن کو کاٹ کے ڈاڑھی میں گولائی پیدا کر کے اُس کی درازی کی ایک حد مقرر کر دی جاتی۔ سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے ڈاڑھی کو خیرباد کہی۔ اور اس کے بعد جہانگیر کے منہ پر بھی ڈاڑھی نہ تھی۔ اکبر و جہانگیر کے دربار پر اس کا چاہے کسی حد تک اثر پڑ گیا ہو مگر امرائے اسلام کی عام وضع وہی رہی جو پہلے سے چلی آتی تھی۔

لکھنؤ میں دربار قائم ہونے کے بعد ڈاڑھی میں قصر شروع ہوا اور ہوتے ہوتے اکثر کے منہوں پر سے ڈاڑھیاں غائب ہو گئیں۔ غالباً اس کا یہ اثر ہو کہ ہم مذہبی کی وجہ سے یہاں کے دربار پر ایرانیوں کا اثر پڑ رہا تھا۔ اور وہاں شاہان صفویہ کے عہد سے بادشاہوں اور امیروں میں ڈاڑھی کی وہ اہمیت نہیں باقی رہی تھی جو آغاز اسلام سے چلی آتی تھی۔ یا تو مسلمانوں میں کسی کی ڈاڑھی مونڈ دینا سزا دینے یا اُس کی تذلیل و تحقیر کرنے کے لیے تھا، یا ایران میں ڈاڑھی نہ رکھنا شانِ امارت و حکومت میں داخل ہو گیا۔ لکھنؤ کے خاندانِ نیشاپوری کے پہلے بانی نواب برہان الملک کے مُنہ پر مقطع ڈاڑھی

تھی شجاع الدولہ نے ڈاڑھی منڈائی اور اُس کے بعد سے یہاں کے تمام اُمرا اور بادشاہ ڈاڑھیاں منڈاتے رہے۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عام شیعوں سے ڈاڑھی کا رواج اُٹھ گیا۔ پھر بعد کے زمانے میں بہت سے سنّیوں نے بھی ڈاڑھیاں کتروائیں یا منڈا ڈالیں۔ ڈاڑھی منڈانے کا شوق پیدا ہونے کے بعد طرح طرح کی وضعیں نکلنے لگیں۔ کسی نے کانوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی قلمیں نکالیں۔ کسی نے ٹھیکے رکھوائے۔ کسی نے بڑے بڑے گل مچھے رکھے۔ اطراف وجوانبِ لکھنؤ کے قصباتیوں اور بعض شہر کے سُنّیوں نے بھی یہ وضع اختیار کی کہ ڈاڑھی رکھتے مگر راجپوتوں اور ہندی پٹھانوں کے مذاق کے مطابق ڈاڑھی کے بیچ میں ٹھڈی کے پاس مانگ نکال کے، دونوں طرف کے بالوں کو کانوں کی طرف چڑھاتے اور اِس وضع پر ڈاڑھی کے قائم رکھنے کے لیے گھنٹوں ڈھاٹا باندھے رہتے۔ پھر اُس چڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی کنگھی کرکے اور باندھ باندھ کے اوپر کے رُخ پر چڑھائی جاتیں۔ چنانچہ یہی وضع یہاں اور سارے ہندوستان میں سپہ گری اور شجاعت کی علامت تصوّر کی جاتی۔

سر کے متعلق حضرت سرورِ کائنات صلعم کے مبارک عہد میں عام مذاق تھا کہ سر پر بڑے بڑے بال ہوتے جو حج کے زمانے میں منڈا یا کتوا دیے جاتے۔

مگر عرب ہی میں ظہورِ اسلام کے چند روز بعد سر منڈانے کا عام رواج ہوگیا اور یہی رواج ایران میں معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمان ابتداءً جب ہندوستان میں آئے ہیں، اُس وقت اُن کی وضع عموماً یہی تھی کہ منڈے ہوئے سر اور اُن پر عمامے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کے آنے کے وقت سر پر بال رکھنے کا رواج تھا۔ یہی وضع یہاں کے مسلمانوں کو پسند آئی۔ چنانچہ آخر عہد میں علما و اتقیا اور مشائخ و صوفیہ کے سوا دہلی کے شریف و وضیع کی عام وضع یہ تھی کہ سر پر بال ہوتے جو کانوں تک رہا کرتے۔ سوا بانکوں کے، جو نئی نئی وضعیں نکالا کرتے۔

اسی وضع میں شرفائے دہلی لکھنؤ میں آئے۔ یہاں آ کے نازک مزاجیاں بڑھیں، خود آرائی کے شوق میں ترقی ہوئی اور نزاکت اور صفائی سے کنگھی کر کے ماتھے پر عورتوں کی طرح پٹیاں جمائی جانے لگیں۔ اور ایسی دھج پیدا ہو گئی کہ نوخیز لڑکوں میں عورتوں کی سی دل کشی پیدا ہو گئی۔ پھر چند روز کے بعد جب انگریزوں سے سیکھ کے عورتوں نے ماتھا خوب کھول کے بال الٹنا شروع کیے تو یہ وضع بھی بعض بعض مردوں نے اختیار کر لی۔

اب غدر کے بعد جب انگریزی وضع قطع اختیار کی جانے لگی تو سارے ہندوستان کے لوگوں کی طرح یہاں بھی بال کٹ کے انگریزی فیشنوں کے ہو گئے۔ اور جتنے منہوں پر ڈاڑھیاں باقی رہ گئی تھیں، وہ بھی تشریف لے گئیں۔

عورتوں کے بالوں کی وضع غالباً لکھنؤ میں وہی ہوگی جو دہلی میں تھی۔ لیکن یہاں شاہی میں دلھنوں اور بناؤ چناؤ کرنے والی عورتوں کی چوٹیوں میں بڑے بڑے رنگین دو ٹپوں کے موباف ہوتے جو خوب پیچ دے کے، سو خَردِ ماغ سے کمر تک بٹ کے لٹکا دیے جاتے۔ اور زیادہ تکلّف کے وقت اُن میں چوڑا لچکا لپیٹ دیا جاتا اور معلوم ہوتا کہ بڑی بھاری موٹی چوٹی سر تا پا چاندی کی ہے۔ ماتھے پر محراب دار پٹیاں جمائی جاتیں۔ اور اُن کے بیچ میں چاند ٹیکے کے گرد سنہری یا روپہلی افشاں اور ستاروں سے نقش و نگار بنائے جاتے۔

ہاتھوں پاؤں میں منہدی عورتوں کے لیے لازمی تھی۔ مگر ان کے ساتھ رنگین مزاج مردوں نے بھی کثرت سے منہدی لگانا شروع کر دی تھی۔ جس کو دیکھ کے باہر والے لکھنؤ کے مردوں میں زنانہ پن پاتے اور اُن کا نام رکھتے۔

(۴) معاشرت میں چوتھی چیز اخلاق و عادات ہیں۔ اس بات میں لکھنؤ والوں نے خصوصیت کے ساتھ نمود حاصل کی۔ یہی چیز لکھنؤ میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے

اور اس پر بحث کرنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ دراصل لکھنؤ میں ایشیائی تہذیب کو انتہائی ترقی ہوگئی اور کسی مقام کے لوگوں میں معاشرت کے وہ قواعد نہیں ملحوظ خاطر رہتے، جن کے اہلِ لکھنؤ عادی ہو گئے ہیں۔

تہذیب دراصل اُن اخلاقی تکلّفات کا نام ہے جن کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔ آج کل ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے دیکھتے ہیں کہ ملنے جلنے میں چنان و چنیں اور معاشرت کے تکلّفات، ایک قسم کی فضول ریاکاری ہیں۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ یوں تو فضول ریاکاری لباس اور بود و باش کا انتظام بھی ہے، اور بہیمیت کی زندگی کو چھوڑ کے، انسانیت کی زندگی اختیار کرنے کے تمام امور فضول ریاکاری کہے جاسکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کو انسانی تہذیب نہیں آتی اور مہذّب لوگوں سے ملنے کا سلیقہ نہیں ہوتا، انھوں نے اپنے لیے عذر داری کا بہانہ اِس بات کو قرار دے لیا ہے کہ ہمیں شہر والوں یا مہذّب لوگوں کی ایسی دکھاوے کی باتیں نہیں آتیں۔ مگر غور کرو تو انسانیت ہی دکھاوا ہے۔ اچھّا پہننا، اچھّا سامانِ معشیت رکھنا، اچھّا کھانا، اور ہر کام میں صفائی کا خیال کرنا، سب دکھاوا ہے۔

تہذیبِ اخلاق کا پہلا اصول یہ ہے کہ میل جول میں دوسرے کو ہر لطف اور نفع کی بات میں اپنے اوپر فوقیت دی جائے اور آپ کو اُس کے پیچھے اور اُس سے ادنا درجے پر رکھّا جائے۔ کسی کی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا، اُس کے لیے صدر کی جگہ کو خالی کرنا، اور اُسے صدر میں بٹھانا، اُس کے سامنے ادب سے دو زانو بیٹھنا، اُس کی باتوں کو توجّہ سے سُننا اور عاجزی کے لہجے میں جواب دینا، یہ سب باتیں دوسرے کو اپنے اوپر فوقیت دینے کی ہیں۔ اور یہ جس درجے تک وضع دار شرفائے لکھنؤ میں مروّج تھیں، لکھنؤ کے عہدِ شباب کے زمانے میں اور کہیں نہ تھیں۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جن کو ملنے جلنے کے طرزِ عمل سے تعلق ہے۔ مگر یہی چیزیں

جب اخلاق و عادات میں پوری طرح پیدا ہو جاتی ہیں تو انسان میں ایثارِ نفس کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ آمادہ ہو جاتا ہے کہ دوستوں کے ساتھ ہر طرح کی رفاقت اور ہر بات میں اُن کی اعانت کرے۔ عہدِ شاہی میں یہ چیز اہلِ لکھنؤ میں پورے کمال کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جن کا بہ ظاہر کوئی ذریعۂ معیشت نہ تھا، اُن کے احباب ایسے مخفی طریقوں سے اُن کی کفالت کرتے کہ کسی کو کبھی پتا بھی نہ چل سکتا۔ اور ذرائع معاش کے مخفی رہنے کے باعث وہ سفید پوشی اور امیرانہ وضع کے ساتھ بڑے بڑے امیروں کی صحبتوں میں شریک ہوتے اور کسی کے سامنے اُن کی آنکھ نیچی نہ ہوتی۔ لکھنؤ ایسے لوگوں سے بھرا ہوا تھا کہ انقلابِ سلطنت ہو گیا اور یک بہ یک اُن کے بسر کرنے کے ذریعے مفقود ہو گئے۔

اُمرا کے ایثار کی اِس شان نے یہاں شرافت کا یہی معیار قرار دے دیا تھا کہ دوسروں کے ساتھ ایسے اخلاق سے پیش آئیں اور ان کی خاطر داشت میں ایسی فیاضی دکھائیں جس میں احسان رکھنے کا نام کو بھی شائبہ نہ ہو۔ دُنیا کے تمام بڑے شہروں میں بڑے بڑے تاجر اور دولت مند موجود ہیں جو لاکھوں روپے مستحقوں کو دے ڈالتے ہیں، مگر اُن کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک پیسا بھی انھوں نے بے غرضی سے نہیں صرف کیا۔ بہ خلاف اِس کے، لکھنؤ والوں کی دوست پروری اور شریف نوازی ایسی تھی کہ دُنیا کو دینے اور لینے والے میں کوئی فرق نہ نظر آتا۔

اِس میں شک نہیں کہ جب بعدِ انقلابِ سلطنت بڑے بڑے اُمرا مفلس و نادار ہو گئے اور وہ گروہ جو مخفی ذرائع معاش پر بسر کر رہا تھا، فاقے کرنے لگا، تو امرا فیاضی و ایثارِ نفس کا جوہر دکھانے سے معذور ہو گئے۔ مگر ظاہری اخلاق جو سرشت میں داخل ہو گیا تھا، ویسا ہی باقی رہا۔ اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنی باتوں سے تو اعلا درجے کی مہمان نوازی کی اُمید دلاتے ہیں، مگر اُن کے مہمان ہو جیے،

تو اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کو اکثر لوگوں نے ریاکاری و لفّاظی سمجھ رکھا ہے۔ مگر افسوس، یہ ریاکاری نہیں بلکہ حوصلہ مندی ہے، جس کی استطاعت نہیں۔ ایسے لوگوں پر اعتراض نہ کیجیے بلکہ اُن کی حالت پر ترس کھائیے۔

لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دولت مندی کے زمانے میں چوں کہ شہر کی آبادی کا زیادہ حصّہ امرا و شرفا اور احباب کی مخفی دست گیری پر بسر کر رہا تھا، اس کی وجہ سے محنت، جفاکشی اور وقت کی قدر و قیمت جاننے کا مادّہ علی العموم اہلِ لکھنؤ میں فنا ہو گیا اور جو مشاغل اُنھوں نے اختیار کیے، وہ اُن کو ترقّی قومی کی شاہ راہ سے روز بہ روز دور کرتے گئے۔ اُن کے مشغلے لہو و لعب کے سوا کچھ نہ تھے۔ بے فکری، اور فکرِ معاش سے سبک دوش ہونے نے انھیں کبوتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، چوسر، گنجفے اور شطرنج کا شائق بنایا۔ جن کاموں پر وہ آمدنی کا زیادہ تر حصہ صرف کرنے لگے اور "اندیشۂ فردا" کے لفظ سے ساری آبادی نا آشنا تھی۔ کوئی امیر نہ تھا جو ان مزخرف کاموں میں سے کسی ایک کا دل دادہ نہ ہو۔ اور اُس کے شوق نے اور بہتوں کو بھی اِس کام میں نہ لگایا ہو۔

عیّاشی اور تماش بینی سے دُنیا کا کوئی شہر خالی نہیں۔ خصوصاً یورپ کی سی بدتمیزی اور بد سلیقگی کی عیّاشی خدا نہ کرے کہ ہمارے شہروں میں پیدا ہو۔ لیکن لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے زمانے میں رنڈیوں سے تعلقات پیدا کرنے کی جو بنیاد پڑی، تو روز بہ روز اُسے ترقی ہی ہوتی گئی۔ امیروں کی وضع میں داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے۔ حکیم مہدی کا سا قابل و ہوشیار اور مہذّب و شائستہ شخص جو وزیرِ اعظم کے رتبے تک پہنچ گیا تھا، اس کی ترقی کی بنیاد پیاروا نام ایک رنڈی سے پڑی۔ جس نے دس ہزار روپے کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے اُسے ایک صوبے کی نظامت کا عہدہ دلوایا تھا۔ اِن بے اعتدالیوں کا ایک ادنا کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں مشہور تھا کہ "جب تک انسان کو رنڈیوں کی صحبت نہ نصیب ہو،

آدمی نہیں بنتا۔" آخر لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی اور ہمارے زمانے تک لکھنؤ میں بعض ایسی رنڈیاں موجود تھیں جن کے گھر میں علانیہ اور بے باکی سے چلا جانا اور اُن کی صحبت میں رہنا معیوب نہ سمجھا جاتا۔ بہر تقدیر اِس چیز نے ایک بڑی حد تک ان کے عادات و خصائل بگاڑ دیے۔ گو کہ اس کے نتیجے میں انھیں نشست و برخاست کا سلیقہ بھی آ گیا۔

رہے عورتوں کے اخلاق و عادات، اس بارے میں ہمارا عام دعوا ہے کہ جن لوگوں میں زناکاری کا شوق ہو، اُن کی عورتیں پارسا نہیں ہو سکتیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں عورتوں کے اخلاق اُتنے خراب نہیں ہوئے جتنے کہ مردوں کے خراب ہوئے تھے۔ ملنساری اور اپنی ملنے والیوں کے ساتھ ادب و تعظیم سے ملنا عورتوں میں بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ مردوں میں تھا۔ کسی زمانے میں چرخہ کاتنا شریف عورتوں کا شریفانہ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اگرچہ سوت کی کلوں نے اِس مشغلے کو بالکل بے کار اور بے نتیجہ کر دیا مگر شوقینی و امارت نے اس سے پہلے ہی یہ مشغلہ یہاں کی عورتوں سے چھڑوا دیا تھا۔ یہاں اِس کے عوض عورتوں کو سینے پرونے، کاڑھنے، گھروں کی صفائی کا انتظام کرنے، ماماؤں، لونڈیوں اور پیش خدمتوں سے کام لینے اور بننے سنورنے کا زیادہ شوق تھا اور بیویوں کو گھر کے کاموں اور شوہر اور بچوں کے کپڑوں سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ جن لہو و لعب کے کاموں میں مرد مبتلا ہو گئے تھے، اُن میں وہ بھی مبتلا ہوں۔ درحقیقت اُس دور میں مرد گھروں میں بیٹھے کھیلا کرتے تھے۔ گھر بار اور دنیا کا سارا کارخانہ فقط عورتوں کے دم سے چل رہا تھا۔

مگر امیروں کے محلوں میں جب سارا کاروبار ماماؤں، مغلانیوں، پیش خدمتوں اور اناؤں کے ہاتھ میں ہو گیا تو عالی مرتبہ بیگموں کے سامنے مجرا کرنے کے لیے ڈومنیوں کے طائفے ملازم ہوئے۔ اور جن محلوں میں مستقل طور پر ڈومنیاں نوکر رکھیں، وہاں

شہر کی عام ڈومنیوں کی جلد جلد آمد و رفت رہتی۔ اور آئے دن وہ طبلہ سارنگی لیے ڈیوڑھی پر کھڑی ہی رہتیں۔ اس لیے ان کے سیکڑوں طائفے شہر میں موجود تھے۔ ڈومنیوں کا مذاق، جہاں تک مجھے معلوم ہے، نہایت فحش اور بیہودہ ہوا کرتا ہے۔ اور ان کی صحبت عورتوں پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال سکتی ہے۔ چنانچہ جس طرح مردوں کی بداخلاقی کی باعث رنڈیاں تھیں، عورتوں کا اخلاق بگاڑنے کی باعث ڈومنیاں ہو گئیں۔

لیکن شرفا کے خاندان ڈومنیوں کی صحبت سے بچے ہوئے تھے۔ اور اس لیے ان کی عورتیں اس مضرت سے بچی رہیں جو عمدہ خصائل و اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ لکھنؤ کی عورتوں کا کیرکٹر ہے کہ وہ شوہر پر اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ اپنی ہستی کو شوہر کی ہستی کا ایک ضمیمہ تصور کرتی ہیں۔ اور بعض اور شہروں کی عورتوں کی طرح جو خانہ داری کے سلیقے میں لکھنؤ والیوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہیں، یہاں کی عورتوں کو کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ اپنا روپیا شوہر سے چھپا کے الگ جمع کریں۔ اور شوہر کی بیماری میں بھی اپنی دولت صرف کرنے میں تامل کریں۔ لکھنؤ کی عورتیں وہاں کی عورتوں کی سی ہنرمند نہیں اور گھر گرہستی کے کام میں ان کے مقابل پھوہڑ ہیں، حد درجے کی مسرف ہیں، چٹوری ہیں، مگر شوہر کا ساتھ دینے اور اس پر اپنی جان قربان کر دینے میں سب سے اوّل ہیں۔

(۴۱)

(۵) معاشرت میں پانچویں چیز نشست و برخاست ہے۔ ہر متمدّن قوم میں نشست و برخاست کے مختص قوانین اور اصول موضوعہ ہوا کرتے ہیں۔ اور انھی سے اس قوم کی ترقی و تہذیب کا درجہ قائم ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ عیسائیوں کے متمدّن شہروں پیرس، لندن اور برلن میں یا مسلمانوں کے مہذّب بلاد قسطنطنیہ، تہران اور شیراز میں جائیے اور وہاں کے مہذّب لوگوں کی صحبت میں شریک ہو جیے تو

نظر آئے گا کہ ان میں نشست و برخاست کے اخلاقی قوانین کس قدر سخت ہیں۔ مگر ہندوستان کے بڑے تاجرانہ شہروں میں آپ جائیں اور وہاں کے اُمرا و معززین سے ملیں تو آپ کو اخلاقی قوانینِ تہذیب کا بالکل پتا نہ چلے گا۔ مگر ان شہروں میں جہاں کوئی خاص دربار قائم ہے، یا رہ چکا ہے مثلاً حیدرآباد دکن، بھوپال اور رام پور وغیرہ، معزز وطنی درباروں کے قائم ہونے کی برکت سے عوام و خواص سب میں حفظِ مراتب کے قواعد نظر آئیں گے۔ بخلاف تاجرانہ شہروں کے جہاں تمیزداری، ادب اور حفظِ مراتب کا نام و نشان کبھی نہ ہوگا۔

دہلی میں اگلے دنوں یہ اخلاقی اصول یقیناً سب جگہ سے زیادہ بڑھے ہوئے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہاں کا دربار سب سے بڑا تھا اور صدیوں سے قائم چلا آتا تھا۔ مگر وہاں تجارت پیشہ اقوام کے سوسائٹی پر غالب آنے کی وجہ سے اگلی ساری تہذیب خاک میں مل گئی۔ نشست و برخاست کی بنیاد امارت، ریاست اور حکومت سے پڑتی ہے۔ حکومت و ریاست بتاتی ہے کہ چھوٹوں کو بڑوں سے اور بڑوں کو چھوٹوں سے کیونکر ملنا چاہیے۔ اور برابر والوں سے کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مگر تجارت کو ان امارت کے چوچلوں اور اخلاقی تکلفوں سے دشمنی ہے۔ وہ معاملت اور خودغرضی کے آغوش میں پلتی ہے اور سلف سیکری فائس یعنی اپنے وقت اور اپنے روپے، اپنے ہنر اور اپنی دولت کو بے وجہ کسی پر قربان کر دینے کو حماقت اور لغویت بتاتی ہے۔ بخلاف اس کے ریاست کا جوہر یہ ہے کہ بے غرضی کے ساتھ اپنے طرف داروں یا قابل لوگوں سے مراعات کی جائے۔ اور اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جہاں تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجروں کی معاشرت خوش باش امیروں اور شریفوں کی معاشرت پر غالب آجائے گی، وہاں کوئی اخلاقی قانون نہیں باقی رہ سکتا۔ چنانچہ اس چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان درباروں کی ساری آن بان مٹا کے رکھ دی اور وہ بات نہیں باقی رہی،

جو اُس کی نام وری کی تاریخ کے شایاں تھی۔

دہلی کی تہذیب کو جب تاجروں کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اُس نے اپنے قدیم وطن سے بھاگ کے لکھنؤ کے چھوٹے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اُس کے سواد میں داخل ہونے کے بعد کسی کو نہ نظر آسکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا اور کوئی دربار بھی ہے۔ پھر یہاں آزادی سے بیٹھ کر شرفائے دہلی نے اپنے قوانینِ نشست و برخاست کو برتنا شروع کیا تو چند ہی روز میں یہ حالت ہو گئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و شائستگی اور آدابِ نشست و برخاست کا مرکز تھا۔ اور تمام شہروں کے مہذب لوگ اہلِ لکھنؤ کی تقلید اور پیروی کر رہے تھے۔ ان مراتب کا قائم کرنا کہ کس شخص کا استقبال دروازے تک آکے کرنا چاہیے، کس کے لیے فقط کھڑے ہو جانے کی ضرورت ہے، کس کے لیے نیم خیز ہو کے اور کس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے "آئیے تشریف لائیے" کہہ دینا کافی ہے، زیادہ تر اپنے دلی فیصلے اور اجتہاد پر موقوف ہے اور اس اجتہاد کا جیسا ملکہ لکھنؤ کے مہذب شرفا کو حاصل ہے، کسی کو نہیں۔

یہاں کوئی برابر والا آئے گا تو کھڑے ہو کے تعظیم دیں گے۔ اس کے لیے بہترین جگہ خالی کریں گے اور جب تک وہ بیٹھ نہ جائے گا، خود نہ بیٹھیں گے۔ اس کے سامنے ادب اور تمیز داری سے بیٹھیں گے۔ چہرہ بشاش رکھیں گے تاکہ اُس کو کسی قسم کا تنغص نہ ہو۔ جب وہ کوئی چیز دے گا تو ادب سے تسلیم کر کے لیں گے۔ اس کا پورا خیال رکھیں گے کہ ہماری کوئی حرکت اُسے ناگوار نہ ہو۔ اور اُس کی صحبت میں کسی اور ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے تو اُس سے معذرت خواہ ہو کے اور معافی مانگ کے توجہ کریں گے۔ کہیں اُٹھ کے جانے کی ضرورت پیش آئے گی تو اُس سے اجازت لے کے جائیں گے۔ اگر اُس کے ساتھ جانے کی نوبت آئے تو راستے میں اُس کے پیچھے رہیں گے

اور اُسے آگے بڑھائیں گے۔ اصولِ تہذیب کی پابندی میں وہ بھی اصرار کرے گا کہ "پہلے آپ تشریف لے چلیں" لیکن اِدھر سے بار بار یہی کہا جائے گا کہ "جناب آگے تشریف لے چلیں، میں کس قابل ہوں" اور اگر وہ کسی طرح نہ مانے اور مجبور ہی کر دے تو شکر گزاری میں آداب بجا کے آگے قدم بڑھائیں گے بھی تو اس انداز سے کہ اُس کی طرف پیٹھ نہ ہو۔

اکثر لوگ اِن آداب کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور ضرب المثل ہو گیا ہے کہ چند لکھنؤ والے "پہلے آپ" "پہلے آپ" کہتے رہے اور ریل چھوٹ گئی۔ چنانچہ دونوں اسٹیشن پر پڑے رہ گئے۔ اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر چیز کا اعتدال سے گزر جانا بدنما اور مضر ہو جاتا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدابِ معاشرت کی نگہداشت اہلِ لکھنؤ کے اخلاق میں اِس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اُن کے برتنے میں انھیں ضرر پہنچ جانے کا بھی خیال نہیں رہتا؟ جو لوگ تہذیب و شائستگی سے مُعرّا ہیں جو اعتراض چاہیں کریں۔ لیکن ایک مہذّب و شائستہ آدمی ان باتوں کو بجائے عیب کے، اخلاقی جوہر تسلیم کرے گا۔

اب تو سب شہروں کی طرح یہاں بھی میز کرسیوں اور انگریزی فرنیچر کا رواج ہو گیا ہے، مگر پہلے نشست فرش کی تھی۔ جو حسبِ حیثیت و دولت قیمتی و پُرتکلف ہوا کرتا۔ اگر کوئی ہم رتبہ غیر یا بزرگ اور واجبُ التّعظیم شخص آجاتا تو اُسے گاؤ کے آگے بٹھا کے، سب لوگ حاضرینِ صحبت کی تعداد کے مطابق چھوٹا یا بڑا حلقہ باندھ کے مودّب اور دو زانو بیٹھ جاتے۔ جس کسی سے وہ بات کرتا، وہ شخص ہاتھ جوڑ کے نہایت ہی فروتنی سے جواب دیتا اور اُس کے سامنے زیادہ باتیں کرنا یا اپنی آواز کو اُس کی آواز پر بلند کرنا اخلاقی جرم خیال کرتا۔

لیکن اگر سب برابر والے حریفانِ صحبت اور یارانِ ہم مذاق ہوتے تو نشست میں بے تکلّفی رہتی۔ اور باوجود ہم رتبہ و ہم سن ہونے کے بے تکلّفی پر

بھی سب ایک دوسرے کا ادب کرتے۔ اس کا خیال رہتا کہ کسی کی طرف پیٹھ نہ ہو اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے کسی کی سُبکی یا اُس کی عزت کرنے سے بے پروائی ثابت ہو۔ نوکر اور خدمت گار پاس یا اس فرش پر نہ بیٹھ سکتے جس پر یارانِ صحبت بیٹھے ہوتے۔ وہ تعمیلِ احکام کے لیے سامنے ادب سے کھڑے ہوتے یا نظر سے غائب کسی قریب ہی ایسے مقام پر ٹھہرتے جہاں تک آواز پہنچ جائے۔ اور اُن کا ہر وقت کھڑا رہنا یا زیادہ باتیں کرنا بدتمیزی سمجھا جاتا۔

وہ خاص دان یا حقّہ لا کے لگاتے تو صاحبِ خانہ اپنے ہاتھ سے دوستوں کے سامنے بڑھاتا اور وہ اُٹھ کے اور تسلیم کر کے لیتے۔ بے تکلفی کی صحبتوں میں خُردوں کا بے ضرورت آنا نامناسب تھا۔ اگر کبھی ضرورت سے وہ آجاتے تو باپ کے آگے دوستوں کو نہایت ہی ادب سے جھک کے آداب بجالاتے۔ اور اُن کے آتے ہی بزرگوں کی صحبت لمبے تکلف سے مہذب بن جاتی۔ اور جس طرح وہ خُرد سب کی بزرگی کا ادب کرتا، اُسی طرح بزرگ اُن کی خُردی کا پاس کر کے اپنی بے تکلفیاں چھوڑ دیتے۔

یہاں کی صحبت میں روز کے ملنے والوں سے مصافحے یا معانقے کا رواج نہ تھا۔ مصافحہ مقتدایانِ قوم کی دست بوسی تک محدود تھا۔ اور معانقہ صرف اُن دوستوں کے لیے تھا جو کسی سفر سے واپس آئیں یا مدت کے بعد ملیں۔

زنانے میں مرد جاتے تو عورتوں کا احترام کرتے۔ اُن کے سامنے ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ بے تکلفی برتیں یا اُن میں زیادہ نشست رکھیں۔ میاں بیوی میں بے تکلفی لازمی تھی۔ لیکن گھر کی بزرگ عورتوں کے سامنے وہ بھی ہرگز بے تکلف نہ ہوتے۔ دہلی کے شرفا میں معمول تھا کہ نئی دلھن جب تک چار یا پانچ بچّوں کی ماں نہ ہو جائے، گھر کی تمام عورتوں کے سامنے شوہر سے پردہ کرتی اور مجال نہ تھی کہ کوئی عزیز مرد

یا عورت اُسے شوہر کے پاس یا شوہر کو اس کے پاس جاتے دیکھ لے۔ یہ سختی شہر کے شرفا میں نہ تھی۔ شہر کے خاندانوں میں میاں بیوی ابتدا ہی سے ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ مگر یہ معیوب تھا کہ ماماؤں اور پیش خدمتوں کے سامنے بھی باہم بے تکلفی اختیار کریں۔

عورتوں کی باہمی صحبت، سوا بڑے بڑے امیروں کے گھرانوں کے، نسبتہً بے تکلف رہتی۔ ان میں مہمان آنے والی بیویوں کے ساتھ ایک معتدل درجے تک تکلّف رہتا۔ مگر اُس تکلّف کے ساتھ خلوص اور یک جہتی کا اظہار زیادہ ہوتا۔

(۴۲)

نشست برخاست ہی کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ یورپ یا عرب و عجم کی طرح ہندوستان میں باہم ملنے جلنے اور لطفِ صحبت اُٹھانے کے لیے کلبوں اور سوسائٹیوں کا رواج نہ تھا۔ یورپ میں ہر جگہ ایسے کلب یا ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں جن میں جا کے لوگ احباب اور ہم مذاق لوگوں سے ملتے اور اُن کی صحبت سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں میں چائے خانے یا قہوہ خانے میل جول اور مبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ جس جگہ دو چار انگریز ہوتے ہیں، وہاں اپنا ایک کلب قائم کر لیتے ہیں اور فرصت کے اوقات میں وہاں جا کے اخبار پڑھتے اور احباب سے ملتے ہیں، اُسی طرح جس شہر میں ایرانیوں اور عربوں کی کافی تعداد ہوتی ہے، وہاں ان کا کوئی چائے خانہ یا قہوہ خانہ کھل جاتا ہے اور اُس میں جس وقت دیکھیے اُن کا کوئی نہ کوئی گروہ ضرور موجود ہوتا ہے جو وہاں چائے اور حقّے پیتے، کھانے کھاتے اور ساتھ بیٹھ کے گپیں اُڑاتے ہیں۔

برخلاف اس کے ہندوستان میں کبھی اِس قسم کے کلبوں یا چائے خانوں کا رواج نہ تھا اور نہ آج تک ہے۔ سرکارِ انگریزی نے جابجا شہروں میں اس مذاق

کے پیدا کرنے کی کوشش کی، بڑے بڑے مصارف کا بار اُٹھا کے چائے خانے کھلوائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آج سے تیس پینتیس سال پیشتر خاص لکھنؤ کے چوک میں میر محمد حسین صاحب مرحوم ڈائرکٹر زراعت و تجارتِ ریاستِ نظام نے، حیدر آباد جانے سے پہلے گورنمنٹ کی اعانت سے ایک چائے خانہ کھلوایا تھا جس میں فرنیچر بھی اچھا تھا اور سوا ناجائز چیزوں کے ہر قسم کے مشروبات تیار رہتے تھے۔ مگر کسی نے توجہ نہ کی اور آخر میر صاحب کو نقصان اُٹھا کے اُسے بند کر دینا پڑا۔

یہاں کا پُرانا مذاقِ صحبت یہ ہے کہ ہر محلّے میں یا آبادی کے ہر حلقے میں کوئی خوش حال یا دولت مند شخص اپنے گھر میں لوگوں کے آنے اور اٹھنے بیٹھنے کا سامان کرتا ہے۔ احباب کی تواضع و خاطر داشت کے لیے حقّے پان وغیرہ ضروری چیزوں کو وہ اپنے ذاتی صرف سے مہیا کرتا ہے اور اُس کے ہم مذاق بلا ناغہ اور پابندی سے آتے ہیں۔ دیر تک صحبت رہتی ہے، بذلہ سنجیاں اور لطیفہ گوئیاں ہوتی ہیں۔ اور جب تک صحبت قائم رہے حقّے پان سے تواضع ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر ندیمانِ صحبت کے مذاق کے اعتبار سے اُن کی محفلوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے۔ ارکانِ محفل اگر ادب اور شعر و سخن کا مذاق رکھتے ہیں، تو شاعری، نثّاری، اور سخن آفرینی و سخن سنجی کا چرچا رہتا ہے۔ اگر وہ علما و فضلا ہیں، تو عالمانہ مذاق کے ساتھ علمی مباحث چھڑتے ہیں۔ اگر مہذّب امرا کی صحبت ہے تو وضع و لباس، سامانِ عیش، کھانے پینے اور ہر چیز کے برتنے اور ہر مذاق کے اختیار کرنے میں انتہا درجے کی نفاست و شایستگی اور رکھ رکھاو کے ساتھ تمیزداری ظاہر کی جاتی ہے۔ اگر رنگین مزاج عیاشوں کی صحبت ہے تو اس میں بازاری مہ لقائیں بھی شریک ہوتی ہیں اور ناز آفرینی و ناز برداری کی ادائیں نظر آتی ہیں۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یورپ کی طرح یہاں مردوں کی کسی صحبت میں شریف و پاک دامن عورتیں نہیں شریک ہو سکتیں۔ اور احباب کی محفل میں جب کوئی عورت نظر آ جائے تو یقین جان لیجیے

کہ وہ عصمت فروش بازاری رنڈی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی صحبتوں میں شریف وشایستہ عورتوں کے شریک ہونے کی وجہ سے بازاری عورتوں کا درجہ اور مرتبہ سوسائٹی میں اس قدر گر گیا کہ کسی شریف خاندان کا دروازہ اُن کے لیے نہیں کھل سکتا اور نہ شرفا کے کلبوں اور سوسائٹیوں میں وہ قدم رکھ سکتی ہیں۔ بخلاف اس کے ایک حد تک سارے ہندوستان میں اور اسی طرح لکھنؤ میں بازاری عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب وشایستہ اُمرا کی محفلوں میں اُن کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں۔ اور یہاں اس مذاق میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ بعض معزز رنڈیوں نے بھی اپنے گھروں میں ایسی ہی نشست وبرخاست کی صحبتیں قائم کر دیں، جن میں جاتے بہت سے مہذب لوگوں کو بھی شرم نہیں آتی۔ لکھنؤ میں چودھرائن، بی حیدر جان اور اسی پایے کی چند اور رنڈیوں کے مکان اچھے خاصے شرفا کے کلب تھے۔ جن میں صاحبِ محفل یعنی اُن بی صاحب کی طرف سے حقے پان کی بہ خوبی خاطر کی جاتی۔ انگریزی مذاق نے اب اتنی اصلاح ضرور کی ہے کہ اگرچہ طرح طرح کی نئی بداخلاقیاں پیدا ہو گئی ہیں، مگر رنڈیوں کے گھروں میں علانیہ بیٹھ کے لطفِ صحبت اٹھانا ذرا معیوب سمجھا جانے لگا ہے۔

بہ ہر حال لکھنؤ کے کلب خوش باش لوگوں اور امیروں کے گھر تھے۔ یہاں یہ طریقہ نہایت ہی معیوب تھا اور اب تک ہے کہ ساجھے کی ہانڈی پکائی جائے یا حاضرینِ محفل چندہ دے کے اور اپنے اپنے داموں کا حقہ پان یا کھانا پانی ایک ساتھ بیٹھ کے کھائیں پئیں۔ یہاں چندے کے ڈنر قوم کے لیے مایۂ شرم اور خلافِ شرافت تھے۔ اور یہاں کی تمام دعوتیں عام اس سے کہ خوشی کی تقریب میں ہوں یا محض دوستانہ ہم صحبتی کے لیے، فقط ایک شخص کی طرف سے ہوا کرتیں۔ دوسرا اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی طرف سے پوری دعوت دے سکتا ہے۔ یہ نہیں کر سکتا کہ اپنی دعوت میں مجھ سے کھانے کے پانچ روپے لے کے مجھے بھی شریک کر لیجیے۔

دہلی کے تاجروں میں بِتّی پڑنے کا رواج ہے یعنی بہت سے تاجر مل کے چندا جمع کرتے ہیں اور اُس رقم سے کوئی دعوت یا رقص و سرود کی صحبت کسی گھر میں یا باہر کی تفرّج گاہوں میں کی جاتی ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ یہ طریقہ وہاں کی تجارت نے زوالِ سلطنت کے بعد نکال لیا ہے۔ شرفائے دہلی کا یہ مذاق ہرگز نہ تھا۔ اس لیے کہ وہاں کے شرفا میں ہوتا تو لکھنؤ میں بھی ہوتا۔ جو معاشرت میں دہلی کا شاگرد اور اُسی کے اگلے نکھرے مذاق کا نام لیوا ہے۔

۶- صاحب سلامت اور مزاج پرسی: آدابِ معاشرت میں چھوٹی چیز جو سب باتوں سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، سلام کرنا اور جس سے ملیں اُس کا مزاج پوچھنا ہے۔ اسلام کا قدیم مذہبی اور سیدھا سادہ سلام "السّلامُ علیک"، اور بہت سے لوگ ہوں تو "السّلامُ علیکم" ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ اس سلام کے بعد ہر ملنے والے سے صبح کو ملیں تو "صبحکم اللہ بالخیر" یعنی اللہ تمھاری صبح خیریت سے گزرانے، اور شام کو ملیں تو "مساکم اللہ بالخیر" کہا کرتے تھے۔ یہی سلام اور مزاج پرسی عربوں کی تھی جسے تعلیم دیتے ہوئے وہ مغرب میں اندلس تک چلے گئے۔ اور مشرق میں ہندوستان تک چلے آئے۔ یورپ میں یہی طریقہ صاحب سلامت اُن سے اہلِ فرنگ نے سیکھا۔ اور مشرق میں ایرانیوں تورانیوں اور ہندوستانیوں نے سیکھا۔ چنانچہ یورپ میں، اصلی سلام جو اسلام کا خفیفہ تھا، وہ تو غائب ہو گیا۔ فقط سلام کے بعد والی دعائیں "صبحکم اللہ بالخیر" اور "مساکم اللہ بالخیر" باقی رہ گئیں۔ انھی کا ترجمہ "گڈ مارننگ" اور "گڈ ایوننگ" آج تک ہم صاحب سلامت میں انگریزوں کی زبان سے سنتے ہیں۔ فرانسیسی میں "بون سیتن"، "بون ژور" اور "بون سُوار" یعنی تمھاری صبح، دن، اور شام اچھی ہوں، کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مغربی قوموں کو صاحب سلامت کا یہ سبق اندلس کے عرب فاتحوں

سے ملا ہے۔

ہندوستان اور ایران میں چوں کہ بزرگوں کی پرستش کا رواج تھا اور یہ چیز ان مشرقی لوگوں کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی، اس لیے خالی خولی السلام علیکم کے الفاظ جو افرادِ قوم کی مساوات کو قائم کرتے تھے، دولت مندوں کو اپنے تبختر اور اپنی نخوت کے جوش میں بہت پھیکے اور اپنی شان سے کم نظر آئے۔ خصوصاً جب یہاں شہنشاہی دربار قائم ہوا اور تاج داروں نے اپنی تعظیم و تکریم کرانے میں سارے اسلامی آداب کو مٹا دیا، درباریوں کو اپنے سامنے اسی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے اور اپنی تعظیم میں جھکنے کا حکم دیا جس طرح کہ بندے خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں۔ تو شاہی درباروں کی پیروی میں عام امرا اور دولت مندوں نے بھی بجائے "السلام علیکم" کے دیگر تعظیمی الفاظ سلام کے لیے مقرر کیے۔ مثلاً تسلیم، کورنش، آداب، بندگی، اور خود پرست و خدا فراموش امرائے اسلام کی برکت سے فی الحال یہ سب الفاظ ہمارے سلام ہیں۔ عرب میں "السلام علیکم" کہنے کے ساتھ، سوا خندہ جبینی کے اور کوئی حرکت نہیں کی جاتی تھی۔ فقط سلام کے بعد ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جاتا۔ مصافحے میں ہاتھ کو حرکت دی جاتی۔ اور اسی کے ساتھ "صبحکم اللہ بالخیر" یا "مساکم اللہ بالخیر" کہا جاتا۔ اس عربی طرزِ صاحب سلامت کی یادگار میں اب یورپ میں سر کی ایک خفیف حرکت کے ساتھ "گڈ مارننگ" وغیرہ کہتے اور ہاتھ کو ملا کے جھٹکا دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہندوستان میں اب پورا اسلام یہ ہے کہ مذکورۂ بالا الفاظ کہنے کے ساتھ ہاتھ کو سر یا پیشانی پر رکھتے اور رکوع کے درجے تک یا اس سے کسی قدر کم جھکتے ہیں۔ یہ جھکنا اور پیشانی پر ہاتھ رکھنا خالص ہندوانہ اور مشرکانہ جذبات کی یادگار ہے۔ اِن دونوں باتوں میں اشارہ ہے کہ ہم آپ کے قدموں پر سر جھکاتے اور آپ کے سامنے زمیں

بوس ہوتے ہیں۔

اسی قدر نہیں، بادشاہوں اور امیروں کے درباروں میں سلاموں کی تعداد مقرر تھی۔ کہیں سات سلام کیے جاتے اور کہیں تین۔ عام بزرگوں اور دوستوں سے ملنے میں ایک سلام کافی تھا۔ لکھنؤ میں چوں کہ آداب و حفظِ مراتب کا زیادہ خیال تھا، اس لیے خُردوں کا سلام بزرگوں سے اور نیز متوسّط درجے والوں کا معزز لوگوں سے یہ ہے کہ الفاظِ مذکورہ میں سے کسی ایک کو زبان سے ادا کرنے کے ساتھ داہنے ہاتھ کو سینے یا چہرے کے سامنے تک اٹھا کے کئی بار حرکت دی جائے۔ خُردوں کے لیے آج تک یہ نہایت ہی پسندیدہ اور سعادت مندانہ سلام ہے۔ یہ ہاتھ کو کئی بار حرکت دینا متعدّد سلاموں کا اشارہ ہے۔ علیٰ ھذا القیاس، اکثر لوگ تسلیم اور کورنش کو جمع کے صیغوں میں استعمال کر کے کہتے ہیں: "تسلیمات" اور "کورنشات"۔ یہ بھی سلام کے تعدّد کی یادگار ہے۔

اب ہم مذکورۂ بالا مروّجہ الفاظِ سلام کے معنی اور ان کی شان و اصلیت جُدا جدا بیان کرتے ہیں۔ تسلیم کے معنی عربی میں "سلام کرنا" ہیں۔ بہ ظاہر "السلام علیکم" کو چھوڑ کے فعل کا صیغہ استعمال کرنا لغو سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہاں کی سوسائٹی میں یہ سمجھا گیا کہ بجائے سلام کرنے کے "میں سلام کر رہا ہوں" کہنے میں زیادہ اظہارِ تعظیم ہوتا ہے۔ کورنش ترکی زبان کا لفظ ہے جو ترکی فاتحانِ ہند کے ساتھ یہاں آیا۔ اس کے معنی، سلام کے لیے جھکنے کے ہیں۔ لہٰذا اس میں بھی جھک کے زمیں بوس اور قدم بوس ہونے کا خیال موجود ہے۔ آداب، فقط ادب کی جمع ہے۔ سلام کے محل پر اس کے زبان پر لانے کا منشا یہ ہے کہ ادب و تعظیم کے جتنے طریقے ہیں، ان سب کو بجا لاتا ہوں۔ بندگی، یہ تمام الفاظِ سلام سے زیادہ ذلیل اور مشرکانہ لفظ ہے۔ بندگی کے معنی پوجنے اور عبادت کرنے

کے ہیں۔ سلام میں اِس کا منشا اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ حقِ عبودیت بجا لاتا ہوں، جو مسلمانوں کے عقائد کی رو سے خدا کے سوا اور کسی کے مقابل نہیں کہا جا سکتا۔

بہ خلاف اِن ہندوستانی سلاموں کے، عرب میں جو الفاظ "السّلامُ علیکم" کہے جاتے ہیں اُن کا لغوی ترجمہ یہ ہے کہ "تم پر سلامتی" یا صاف اردو میں یوں کہیے "تم سلامت رہو"۔ یعنی سلام کرنا دراصل ہر ملنے والے کو سلامتی کی دعا دینا ہے۔ اسلام نے اس پر ترقی یہ کی کہ سلام خدا کا پیام ہے جو رسولِ خدا صلعم نے مسلمانوں کو پہنچایا اور قیامت تک آپ کا یہ پیغام ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو پہنچاتا رہے گا۔ السلامُ علیکم میں سلام پر جو الف لام لگا ہوا ہے، اس میں صاف اسی جانب اشارہ ہے کہ وہ سلام جو حضرتِ رسالت کا پیام ہے، تم کو پہنچے۔

اسلام کے اصلی سلام کے اِن معنوں اور اس کے مقصد کو سمجھ کے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ سلام قومی مساوات کا خیال دلانے اور تمام پیروانِ رسالتِ محمدی میں قومیت و اخوّت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر افسوس، مسلمانوں نے اِس کو چھوڑ دیا۔ اور ہمارا فضول تبختر اب ہمیں یہ خیال دلاتا ہے کہ کسی معمولی مسلمان کا ہم سے ملتے وقت السلامُ علیکم کہنا ہماری توہین کرنا ہے۔ اس پر طُرّہ یہ ہوا کہ شیعہ سُنّی کے اختلاف نے چوں کہ یہ شان پیدا کر دی ہے کہ دونوں بجائے ایک قوم بننے اور ایک جماعت ثابت ہونے کے، ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز رہنا چاہتے ہیں۔ عوام ہی نہیں دونوں فریقوں کے متاخر علما و مصنّفین تک نے اپنے اپنے فریق کو دوسرے کے عادات و اطوار سے نفرت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و عجم تک میں تو شیعہ و سُنّی دونوں کا سلام "السّلام علیکم" تھا۔ مگر ہندوستان خصوصاً لکھنؤ کے شیعوں نے السّلام علیکم کو سُنّیوں کے

سر مار کے، اپنے لیے "سلامٌ علیکم" کے الفاظ مخصوص کر لیے ہیں۔ وہ زیارتِ ائمہ پڑھنے میں تو وہی پرانے الفاظ مثلاً "السلامُ علیک یا ابا عبداللہ علیہ السلام" کہتے ہیں۔ مگر ملنے جلنے والوں سے جب صاحب سلامت کرتے ہیں تو کہتے ہیں "سلامٌ علیکم"۔ اس لیے کہ "السّلامُ علیکم" سُنّیوں کا سلام ہے۔

تاہم زیادہ تر یہ اگلا عربی سلام سُنّی اور شیعہ دونوں میں مذہبی لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ یا مذہبی شان و وضع میں داخل ہے۔ ورنہ امرا کی سوسائٹی میں "آداب و تسلیم" کا عام رواج ہے۔ بندگی بھی اکثر لوگ کہتے ہیں مگر یہ لفظ عورتوں میں زیادہ مروّج ہے۔

لکھنؤ میں پرانا، مہذّب اور شائستہ لوگوں کا سلام یہ تھا کہ چھوٹا، بڑے سے یا غریب، امیر سے نہایت جھک کے تسلیم یا آداب کہے۔ جواب میں بزرگ، خردوں سے کہیں: جیتے رہو، بڑے ہو، صاحبِ اقبال ہو۔ اُمرا، غریبوں کے لیے بغیر جھکے فقط ہاتھ اٹھا دیں یا ہاتھ اٹھانے کے ساتھ انھیں الفاظِ تسلیم و آداب و تسلیم کا اعادہ کریں یا بندگی کہہ دیں۔ مگر برابر والوں کا طریقہ جواب دینے میں یہ تھا کہ راہ چلتے میں صاحب سلامت ہو تو اُسی طرح جھک کے تسلیم یا آداب کہیں۔ اگر کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو پوری طرح اُٹھ کھڑے ہوں اور جھک کے جواب دیں۔

سلام کے بعد ایک دوسرے سے کہے: مزاجِ شریف یا مزاجِ اقدس یا مزاجِ عالی یا مزاجِ مبارک یا مزاجِ مُعلّا۔ اور دوسرا ہاتھ جوڑ کے کہے: دعا کرتا ہوں۔ تقریباً سارے ہندوستان میں مہذّب و شائستہ لوگوں کا طریقہ سلام و مزاج پرسی یہی ہے۔ مگر لکھنؤ میں اور چند شہروں میں جہاں ہندوستانی ریاست قائم ہے، اور کوئی دربار موجود ہے، ان طریقوں کے ادا کرنے میں

زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کمی ہونا بدتمیزی خیال کی جاتی ہے۔
مگر اب چند روز سے خصوصاً لکھنؤ میں عوام اہلِ حرفہ اور ادنا طبقے والوں میں اگلے دربار اور اُس کے آداب کے مٹ جانے سے، السلام علیکم کہنے کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ خدا کرتا، امرا بھی اس کی پیروی کرتے، اور ادنا و اعلا کا امتیاز بالکل اٹھ جاتا۔

(۳۴)

۷۔ طرزِ کلام: آدابِ معاشرت میں ساتویں اہم چیز گفتگو اور طرزِ کلام ہے۔ دنیا میں ہر شخص کی شایستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُس کے الفاظ اور اُس کے اندازِ گفتگو سے ہوتا ہے۔ دُنیا کی ہر اقبال مند قوم سب سے پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی اور اسے ترقی دیتی ہے۔
تہذیب و شایستگی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان پر مکروہ و فحش الفاظ نہ آئیں۔ جو الفاظ و خیالات مخاطب کو ناگوار گزریں، اُس کے سامنے زبان سے نہ نکلیں۔ اور اگر کبھی ناگوار مضامین کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش بھی آئے تو وہ ایسے الفاظ اور ایسے عنوان سے ادا کیے جائیں کہ مخاطب کو گراں نہ گزریں۔ اور اگر گراں گزریں بھی تو ان کی گرانی میں ایک گونہ گوارائی و لطف پیدا ہو جائے۔ اس بارۂ خاص میں اہلِ زبانِ لکھنؤ اور یہاں کے شایستہ لوگوں کو جو کمال حاصل ہے، ہندوستان کے اور کسی شہر والوں میں نہ نظر آئے گا اگرچہ موجودہ تعلیم و تہذیب نے ایک حد تک یہ خوبی ہر جگہ اندازِ گفتگو میں پیدا کر دی ہے، مگر انگریزی اثر سے معرّا کر کے دیکھیے تو بالذات یہ شایستگی و شستگی زبان اہلِ لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئے گی۔
باہر کے لوگ اس کا یہاں تک لوہا مانے ہوئے ہیں کہ لکھنؤ والوں کے

سامنے گفتگو کرتے جھیپتے، اور جس قدر شائستگی اُن میں ہے، اُس کو بھی بھول جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب اپنی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں تو یہ کہہ کے اپنی کم زوری کا الزام دور کرتے ہیں کہ ہم سادگی سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں اور ہمیں لکھنؤ والوں کی سی چناں چنیں نہیں آتی۔ مگر دراصل یہ عذر بدتر از گناہ ہے۔ میں نے ایرانیوں کو دیکھا کہ اُن کے سامنے ہندوستانی بات کرنا بھول جاتے ہیں۔ انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسیوں کے سامنے انگریزوں کی زبان سے ایک لفظ نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عربوں کی طلاقتِ لسانی کی کبھی یہ حالت تھی کہ اُن کے سامنے غیر ملک والوں کی زبان نہ کھل سکتی تھی اور عرب لوگوں کا خیال ہو گیا تھا کہ زبان خدا نے فقط ہم کو دی ہے، اور ساری دنیا ہمارے مقابل گونگی ہے۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ ماسوا عرب کے تمام دنیا کے لوگوں کو وہ "عجم" کہتے، جس کے لغوی معنی گونگے کے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال ہندوستان میں ہر شہر کے لوگوں کے مقابل لکھنؤ والوں کا ہے کہ وہ فصاحت و بذلہ سنجی میں سب کو دبا کے صحبت پر چھا جاتے ہیں اور اپنے سامنے کسی اور کو زبان نہیں کھولنے دیتے۔

شائستگیِ زبان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد کیا جائے۔ اور سب زبانوں میں مخاطب کے لیے دو ضمیریں ہیں: ایک واحد کی اور ایک جمع کی۔ اور معزز مخاطب کے لیے واحد کی جگہ ہر زبان میں تعظیماً جمع کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ فارسی میں واحد مخاطب کی ضمیر "تو" ہے اور جمع کی "شما"۔ عربی میں واحد کی "ک" اور "انت" اور جمع کی "کم" اور "انتم"۔ انگریزی میں "یو" کے لفظ سے معزز شخص مخاطب کیا جاتا ہے۔ بخلاف ان سب زبانوں کے اردو میں مخاطب کے لیے واحد کی تو ایک ہی ضمیر "تو" ہے

مگر جمع کی دو ضمیریں ہیں "تم" اور "آپ" اور ان تینوں ضمیروں کے لیے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ مقرر ہے۔ ایک بہت ادنا شخص کو "تو" کہیں گے۔ ادنا درجے کے لوگوں میں جو ذرا امتیاز رکھتا ہو، اُسے اور اپنے خُردوں کو "تم" کہیں گے۔ اور جو ہم رتبہ معزز و تعلیم یافتہ شریف ہو، اُسے "آپ" کہیں گے۔ اگرچہ معزز درجے کے لوگ کبھی بے تکلفی میں اپنے اقران و امثال اور اپنے ہم سِنوں کو بھی "تم" کہنے لگتے ہیں، مگر جن لوگوں سے بے تکلفی نہ ہو، اُن کو تم کہنا، اردو میں خصوصاً اہلِ لکھنؤ میں اخلاقی و ادبی جرم ہے۔

اردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اِتنے ہی درجے نہیں، بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں جن کا شرفا و معززین کے مقابلے میں استعمال کرنا لازمی ہے: جناب، جنابِ والا، جنابِ عالی، حضرت، حضرتِ والا، حضور، حضورِ والا، حضورِ عالی، قبلہ، قبلہ و کعبہ، سرکار اور اسی قسم کے چند اور الفاظ اُردو میں معزز مخاطب کی نسبت حسبِ درجہ استعمال کیے جاتے ہیں، جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اور ان کا صحیح استعمال جس قدر اہلِ لکھنؤ جانتے ہیں، اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے۔

ہمارا دعوا ہے کہ اِتنے تعظیمی الفاظِ خطاب دُنیا کی کسی زبان میں نہیں ہیں۔ ہندوستان میں وہ زمانہ گزر گیا، جب اُردو یہاں کی تمام زبانوں کی ادب آموز تھی، اور اب ادبِ اُردو کی شاگردی سے آزاد ہو کے سب زبانیں کوسِ لمن الملکی بجا رہی ہیں۔ بنگالی، پنجابی، گجراتی، سندھی، مرہٹی، کنڑی، تلنگی وغیرہ سب کو اپنی ادبی ترقی و فصاحت کا دعوا ہے۔ مگر ہم مذکورہ ہندوستانی زبانوں کو اور ان کے ساتھ ساری دُنیا کی مشہور زبانوں فارسی، عربی،

انگریزی اور فرانسیسی کو بھی چیلنج دیتے ہیں کہ اگر ان کو اُردو سے زیادہ ادبی وسعت وفصاحت کا دعوا ہے تو مخاطب کے لیے ذہنی لغتوں میں اتنے لفظ نکال دیں جتنے کہ اردو میں موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ باوجود اپنی کم عمری اور اپنے محدود رقبۂ تصرّف کے، اردو چند ہی روز میں شائستگی، لطافت اور مناسباتِ علمِ مجلس کے اعتبار سے اُس درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی جو دنیا کی کسی زبان کو نہیں حاصل ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اردو کسی ملک، کسی صوبے، کسی گروہ، کسی مذہب کی زبان نہ تھی، بلکہ یہ وہ زبان تھی جو شاہی دربار سے شروع ہو کے ہندوستان کے ہر شہر میں مہذّب وشائستہ لوگوں، نکھری صحبت والوں، صاحبانِ علم وفضل، شاعروں اور ادب واخلاق کے شیدائیوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس کی بنیاد ہی تہذیب وشائستگی کے ہاتھوں سے پڑی اور آخر تک نکھرے مذاق والوں اور شیدائیانِ سخن کے ساتھ مخصوص رہی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی مجارٹی کسی صوبے میں نہیں، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر جگہ کے مہذّب وشائستہ لوگ اس کے بولنے والے ہیں۔ یہ پیدا اسی لیے ہوئی تھی کہ ہندوستان میں اعلا درجے کی اور ساری دنیا سے زیادہ شائستہ سوسائٹی پیدا کر دے۔ مگر بدنصیبی سے انگریزی دور میں جب مغربی معاشرت وادب نے جگہ پکڑی تو ہندوستانیوں کے باہمی اور قدیم فطری تعصّبات نے یہ رنگ دکھایا کہ مسلمان اس پہ ناز کرنے لگے کہ ہماری زبان ہے اور ہندوؤں نے یہ خیال کر کے کہ اس زبان میں ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، اسے مسلمانوں ہی کے سر مارا اور دامن جھٹک کے علاحدہ ہو گئے۔ اس سے اردو کو نقصان پہنچا اور روز بہ روز زیادہ نقصان پہنچے گا۔ مگر باوجود اس کے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو رسیلاپن، جو ادبی خوبیاں اس میں

ین، نہ نئی پیدا کی ہوئی ہندی زبان میں ہیں اور نہ ہندوستان کی کسی ورزبان میں۔

انگریز ہوں یا عرب، افغانی ہوں یا ایرانی، جب اردو بولتے ہیں تو خاطب کے لیے سوا "تم" کے اور کوئی لفظ اُن کے خیال میں نہیں آتا۔ س لیے کہ اس قسم کا اور کوئی لفظ جو "تم" سے زیادہ شایستہ و ترقی یافتہ و، اُن کی زبان میں موجود ہی نہیں ہے۔

انگریزی میں خطاب کے اور الفاظ ہیں مثلاً یور آنر، یور اکسیلنسی، ور ہائنس، یور مجسٹی وغیرہ۔ مگر وہ اعلا درجے کے امرا اور بادشاہوں کے لیے خاص ہیں، اُن کے سوا اور کسی کی نسبت نہیں استعمال کیے جا سکتے۔ س قسم کے مختصّ الاشخاص الفاظ اردو میں بھی ہیں۔ مثلاً جہاں پناہ، صاحبِ عالم، مرشدزادہ، نوّاب صاحب، نوّاب زادہ، صاحبزادہ۔ یہ خاص اعلا طبقے کے لوگوں کے خطابات ہیں، جن کے ساتھ جناب یا حضور کے لفاظ ملا کے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ اور غالباً اس قسم کے مخصوص خطابات ہر زبان میں موجود ہوں گے۔ مگر مذکورۂ بالا تعظیمی الفاظ جو اُردو زبان میں ہر معزز و شایستہ انسان کی نسبت استعمال کیے جا سکتے ہیں، اردو کے سوا سی اور زبان میں نہیں نظر آتے۔

مزاج پرسی کو دیکھیے، ہر زبان میں اس کے لیے معمولی الفاظ ہیں، مگر ردو میں ادب و احترام کی نگہداشت کے لیے مزاجِ عالی، مزاجِ مبارک، مزاجِ قدس، مزاجِ مقدّس، مزاجِ معلّا وغیرہ کہہ کے معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اُردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر میں پھیل رہے ہیں، مگر ان کے استعمال میں جو اجتہادی ملکہ شرفائے لکھنؤ کو حاصل ہے،

اور کسی جگہ کے لوگوں کو نہیں نصیب ہو سکتا۔

شرفائے لکھنؤ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ "ش، ق" درست رہے گا اور تمام عربی حرفوں کو حتی الامکان اُن کے اصلی مخرج سے ادا کریں گے۔ فارسی ترکیبوں میں اضافت نمایاں طور پر ادا کی جائے گی۔ علما اور ذی علم لوگوں سے باتیں کریں گے تو عربی و فارسی الفاظ کو زیادہ استعمال کریں گے۔ اور ان کے صحیح تلفظ سے ادا کریں گے۔ اطبّا سے گفتگو ہو گی تو عربی کے طبّی مصطلحات کو کام میں لائیں گے۔ جاہل نوکروں اور عوام سے بات کریں گے تو عربی الفاظ سے بچیں گے۔ عورتوں سے بات چیت ہو گی تو اُن کے محاوروں اور مثلوں کو گفتگو میں صرف کریں گے۔

خُرد، بزرگ سے۔ ادنا، اعلا سے۔ یا عامی، عالم سے گفتگو کرے گا تو ہر لفظ اور ہر فقرے میں ادب و تعظیم کا خیال رکھّے گا، آواز مناسب درجے تک پست اور نیچی رہے گی۔ اسی طرح بزرگ، خُردوں سے۔ اعلا طبقے والے ادنا لوگوں سے۔ علما، عوام سے بات کریں گے تو ان کے لہجے، اُن کے انداز اور اُن کے الفاظ میں شفقت و محبّت کے جذبات مضمر ہوں گے۔

ان باتوں کا لحاظ رکھنے اور مذکورۂ بالا ادب و تعظیم کے الفاظ و ضمائر استعمال کرنے سے اہلِ لکھنؤ کی زبان اس قدر شایستہ اور شُستہ و رُفتہ ہو گئی ہے کہ یہاں کے عوام اور جُہلا، دوسرے شہروں کے اکثر شعرا و فصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں۔ اور جو شایستگی و تمیز داری ان سے ظاہر ہو جاتی ہے، کسی اور مقام کے قابل و ذی علم لوگوں سے بھی نہیں ظاہر ہو سکتی مگر افسوس! لکھنؤ مٹتا جاتا ہے، اب یہاں بیرونی لوگوں کا ایسا طوفانِ بے تمیزی بپا ہے، یہاں کے شایستہ لوگ اس طرح بے کار ہو کے کونے

میں بیٹھ گئے ہیں، اور قانونی آزادی نے جُہلا و عوام کو اس درجہ بے باک و بد تمیز بنا دیا ہے کہ یہ تمام ادبی خوبیاں خاک میں مِل رہی ہیں اور چند روز بعد شاید ان کا پتا بھی نہ ہو۔

(۴۴)

(۸) آدابِ معاشرت میں آٹھویں چیز طریقۂ مذاق ہے۔ عرب کا پُرانا مقولہ بلکہ مشہور حدیثِ نبوی ہے کہ کلام میں ظرافت ویسی ہی ہے جیسے کھانے میں نمک" سچ یہ ہے کہ شوخی و ظرافت کے بغیر نہ کلام میں مزہ پیدا ہوتا ہے اور نہ صحبت میں جان پڑتی ہے۔ مگر اسی ظرافت میں اگر بے احتیاطی ہو جائے تو وہی سخت فتنہ و فساد کا باعث ہو جاتی ہے۔ ظرافت نے باتوں باتوں میں اکثر تلوار چلوا دی ہے اور پُرانے جانی دوستوں کو گھڑی بھر میں دشمن بنا دیا ہے۔ غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ ان خرابیوں کا باعث ظرافت نہیں بلکہ ظرافت میں بے احتیاطی کرنا یا اعتدال سے باہر ہو جانا ہوا کرتا ہے۔

جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے، اُسی قدر اُس میں مذاق و ظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہیں۔ کلام میں ظرافت جن طریقوں سے پیدا ہو جاتی ہے اُن کا محصور کرنا بہت دشوار ہے۔ صدہا طریقے ہیں جن سے ایک فصیح البیان شخص اجتہادی طور پر فائدہ اٹھا لیا کرتا ہے اور ان کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔ ہمیں اس موقع پر فقط اس قدر کہنا ہے کہ زیادہ تر بنائے ظرافت ایسے الفاظ ہوا کرتے ہیں جو مختلف معنی رکھتے ہوں اور بعض معنوں سے کسی پر تعریض ہوتی ہو۔ اور کبھی ظرافت میں ایسے الفاظ سے بھی کام نہیں لیا جاتا بلکہ کسی انسان یا چیز کو کسی ایسی شے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو باوجود غیر متناسب ہونے کے مشابہ ہو۔ پھر اُس تشبیہ

کو لیسے عنوان اور پہلو سے ادا کرنا کہ اُس میں بعوض تشبیہ کے، استعارے کی شان پیدا ہو جائے. علیٰ ہذا القیاس، کبھی اپنے آپ کو یا کسی اور کو اس قدر بڑھانا یا اتنا گھٹانا کہ اصلی درجے سے بہت دور ہو جائے۔ اِن سب باتوں کے لیے سلیقے کی ضرورت ہے۔ اچھا سلیقہ رکھنے والا سخت سے سخت تعریض کر جاتا ہے اور ناگوار سے ناگوار تشبیہ دے دیتا ہے، مگر کسی کا دل میلا نہیں ہوتا یا کسی کو اظہارِ ناگواری کی گنجایش نہیں ملتی۔ بہ خلاف اِس کے اگر کسی بد سلیقہ شخص نے یہ کام کرنا چاہا تو لوگ بگڑ کھڑے ہوتے ہیں اور عداوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اِس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام النّاس کو ہے، اور جگہ کے خاص لوگوں میں بھی نہیں نظر آتا۔

ایک بنگالی عالم ڈاکٹر اگھور ناتھ نے، جو بڑے عالم و فاضل، فلسفے میں یکتائے روزگار، لٹریچر کے ڈاکٹر اور اردو کے اچھے ماہر تھے، زبانِ اردو پر اعتراض کرنے کے عنوان سے مجھ سے کہا: "صاحب! یہ کون سی زبان کی خوبی ہے کہ ایک دفعہ میں نے ایک صحبت میں کہا: ہم آج کل دودھ پیا کرتے ہیں۔ اس پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔" میں نے کہا: اردو کا یہی اعلا درجے کا حُسن ہے۔ آپ چونکہ اس زبان میں ناقص ہیں، اِس لیے آپ کو بجائے اپنے عیب کے، یہ زبان کا عیب نظر آیا۔ ہر زبان میں ذو معنی لفظ ہوا کرتے ہیں اور زبان دانوں کا کام یہ ہے کہ تمام ذم کے پہلوؤں کو بچا کے، لفظوں کو استعمال کیا کریں۔ انگریزی میں لفظ "کنسیو"، کے معنی خیال کرنے کے بھی ہیں اور حاملہ ہونے کے بھی۔ ایک مشہور لاٹ صاحب نے پارلیمنٹ میں تین بار کہا: "آئی کنسیو" اور آگے سوچنے لگے۔ کسی نے پکار کے کہہ دیا: جناب نے تین بار آئی کنسیو کہا اور ہوا کچھ نہیں۔ یعنی تین بار حمل رہا اور پیدا کچھ نہ ہوا۔

اس پر سب نے قہقہہ لگایا اور وہ لاٹ صاحب جھینپ گئے۔ اسی طرح اردو میں ہزار ہا الفاظ ہیں جن میں مختلف پہلو نکلتے ہیں، بولنے والا ان کے استعمال کا صحیح سلیقہ نہ رکھتا ہوگا تو بات بات پر ہنسا جائے گا۔

یہی مذکورۂ بالا "دودھ پینے" کا جملہ ہے۔ ہندوستان میں "دودھ پینا" شیر خوار بچوں کا کام ہے۔ اور کسی عاقل بالغ کے لیے کہنا کہ "یہ دودھ پیتے ہیں" عیب ہونے کے علاوہ ان معنوں میں مستعمل ہوتا ہے کہ ابھی نا سمجھ اور نادان ہیں۔ اس پہلو کے بچانے کے خیال سے اہلِ لکھنؤ یہ کبھی نہ کہیں گے کہ میں دودھ پیتا ہوں۔ بلکہ اس مضمون کو یہ عیب کا پہلو بچا کے مختلف عنوانوں سے ادا کریں گے کہ "میں آج کل دودھ کو استعمال کرتا ہوں" "آج کل میری غذا دودھ ہے" "دودھ چاول کھاتا ہوں"۔ لکھنؤ والوں کی ان احتیاطوں کو دیکھ کے آگرے کے ایک قابل و زبان داں شاعر کو دھوکا ہوا کہ لکھنؤ کی زبان "دودھ کھاتا ہے"، دودھ پینا نہیں۔ لکھنؤ کے ایک صاحب سے اُن سے اِس بارے میں اختلاف ہوا۔ اور حَکَم کے طور پر مجھ سے دریافت کیا گیا۔ میں نے کہا: دودھ پینے کی چیز ہے، کوئی اس کی نسبت کھانے کا لفظ کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ذم کا پہلو بچانے کے لیے اہلِ لکھنؤ دودھ پینے کا لفظ اپنی نسبت استعمال نہ کریں گے۔

ایک اسی محاورے پر منحصر نہیں، اُردو میں صدہا الفاظ میں مختلف محاوروں اور معنوں کی وجہ سے ذم کے پہلو پیدا ہو گئے ہیں اور ہر اہلِ زبان کا کام ہے کہ اُن سے بچے۔ یا کوئی شخص کسی کی نسبت مذاقاً استعمال کر جائے تو اُس کا فرض ہے کہ سمجھے اور جواب دے۔ ورنہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ زبان سے ناواقف ہے۔

اہلِ لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے۔ وہ اپنے کلام میں صد ہا عنوانوں سے ظرافت پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے، اتنا ہی زیادہ اہلِ سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگوں میں یہ ملکہ نہیں۔ ہے اور کثرت سے ہے۔ اور اب اردو زبان سارے ہندوستان میں اس طرح ترقی کر رہی ہے کہ ہر جگہ اعلا درجے کے ظریف پیدا ہوتے جاتے ہیں اور سخن دانی و سخن فہمی کا شعور بڑھ رہا ہے۔ مگر لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعتِ ثانویہ بن کے اُن کی فطرت و جبلّت بن گیا ہے۔ اور لطافتِ کلام کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت میں جیسے بے تکلّف اور ستھرا مذاق اُن کا نظر آئے گا، اوروں کا نہیں ہو سکتا۔

۵۹ آدابِ معاشرت میں نویں چیز، شادی اور غمی کی محفلیں ہیں۔ مسلمانوں کی اگلی دولت مندی و حکومت نے اُن کی عورتوں کی ارمانیں بہ مقابل اکثر مقامات کے، یہاں بہت بڑھا دی ہیں۔ ولادت سے لے کے شادی تک لڑکے کی ہر خوشی و کامیابی ایک تقریب بن جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد ہی چھٹی، چلّا اور درمیان کے نہان۔ عقیقہ۔ کھیر چٹائی۔ دودھ بڑھائی بسم اللہ۔ ختنہ اور سب سے بڑھ کے عقدِ نکاح۔ یہ سب بجائے خود شادی کی تقریبیں ہیں۔ اکثر بچّوں کی سال گرہ ہوا کرتی ہے۔ مذکورہ تقریبوں کے علاوہ غسلِ صحّت یا کسی خاص مقصد کے پورے ہونے پر بھی خوشی کی غیر معمولی تقریبیں ہو جاتی ہیں۔

ان سب تقریبوں میں قرابت والی بیبیاں اور پاس پڑوس کی بہت سی شناسا عورتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ زنانی محفلیں مرتّب ہوتی ہیں، جن میں تختوں کے چوکوں پر، اور زیادہ مہمان ہوئے تو زمین پر دری چاندنی کا

اُجلا فرش بچھتا ہے۔ دولت مند گھروں میں چاندنی پر تین طرف یا فقط صدر میں پرتکلّف قیمتی قالین بچھتے ہیں۔ کنول اور مردنگیں روشن ہوتی ہیں اور ڈومنیوں کا طائفہ سامنے بیٹھ کے مجرا کرتا ہے۔ ناچنے والی ڈومنی گھونگھرو باندھ کے ناچتی اور بھاو بتاتی ہے۔ مجرے کے درمیان میں وقتاً فوقتاً ڈومنیاں ہنسانے والی نقلیں کرتی ہیں۔ بہر حال مسرت کے ولولے اور خوشی کے چہچہے ہوتے ہیں اور ڈومنیاں اگرچہ مجرے میں اکثر بے اعتدالیاں کرنے لگتی ہیں اور صحبت میں بے حیائی و بے شرمی کو بڑھا دیتی ہیں، مگر نشست برخاست کے سلیقے، بیویوں کے باہمی ربط و ضبط اور اس کے ساتھ حفظِ مراتب میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ ہر تقریب کے متعلق صد ہا رسمیں ہیں جن کا انجام پانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ان رسموں کی محافظ اور برقرار رکھنے والی بڑی بوڑھی عورتیں اور ان کے ساتھ ڈومنیاں ہوا کرتی ہیں، جن کو ان رسموں کے بہانے بہت کچھ مل جاتا ہے۔

اکثر تقریبوں میں رت جگا ضرور ہوا کرتا ہے اور یہی ایک چیز ہے جو ہندوستانی عورتوں کے اعتقاد میں خالصتہً لوجہ اللہ ہے اور جس میں ڈومنیاں "اللہ میاں کی سلامتی" کا نغمہ گاتی ہیں۔ شب زندہ داری ہوتی ہے، مگر عبادت کے لیے نہیں، بلکہ گانے بجانے، رات بھر دھما چوکڑی مچانے اور صبح ہوتے مسجد میں جا کے اللہ میاں کا طاق بھرنے کے لیے۔ جن کی نذر کے لیے گلگلے اور خدا رحم مخصوص چیزیں ہیں۔ ان تقریبوں میں یہی کارروائی دیہات میں بھی ہوا کرتی ہے مگر وہاں بدتمیزی و بدسلیقگی ہوتی ہے تو شہر والیوں میں نفاست، صفائی، خوش ترتیبی، اور شائستگی۔

(۴۵)

جن شادی کی تقریبوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور اُن کی زنانی محفلوں کی

ایک عام تصویر گذشتہ موقع پر دکھا دی ہے، اُن کی مفصّل تشریح یہ ہے کہ چھٹی اُس تقریب کا نام ہے جب کہ زچگی کے بعد ماں اور بچّے کو پہلی دفعہ نہلایا جاتا ہے۔ زچہ کو تیز گرم پانی سے نہلانا ایک طبّی علاج ہے۔ مگر یہ غسلِ ولادت چونکہ ایک خوشی کے موقع پر ہوتا ہے، اس لیے اس کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے۔ اور چونکہ عموماً زچگی کے چھٹے روز یہ پہلا نہان ہوتا ہے، اس لیے اس کا نام ہی چھٹی پڑ گیا۔ اور اس میں زچہ بڑے اہتمام سے نہلائی جاتی ہے پھر بچّہ نہلایا جاتا ہے اور ان کے بعد تمام عورتیں جو مہمان ہوتی ہیں یکے بعد دیگرے سب نہاتی ہیں۔ زچہ اور بچّے کے لیے نئے بھاری جوڑے حسبِ حیثیت تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سب عورتیں کپڑے بدلتی ہیں۔ اس نہان میں جو طرح طرح کی رسمیں برتی جاتی ہیں، وہ بے حد و بے شمار ہیں۔ اور غالباً ہر شہر و قریے بلکہ ہر خاندان میں کُلّیتہً یکساں اور جُزءً مختلف اور نئی ہیں۔

دُلھن کے میکے یا دیگر اعزّہ کی طرف سے اس موقع پر زچہ اور بچّے کے جوڑے، طوق، ہنسلی اور کڑے، ننھے بچّے کے قابل کھلونے، جھنجھنے، چٹوے، اُن کے ساتھ مرغیاں اور خدا جانے کیا کیا چیزیں بڑی دھوم دھام، جلوس اور باجوں کے ساتھ آتی ہیں۔ زنانے میں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں اور اتنی استطاعت نہ ہو تو خود گھر والی عورتیں ڈھول سامنے رکھ کے، گا بجا لیتی ہیں۔

یہی شان بعد کے دو نہانوں یعنی بیسویں اور چلّے کے نہانوں کی ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اطمینان دیا ہے تو دونوں موقعوں پر محفلِ عیش و نشاط گرم ہوتی ہے، ورنہ فقط چلّے کے نہان میں زیادہ دھوم دھام ہوتی ہے، اور بیسویں کے نہان کی تقریب معمولی ہوتی ہے۔

عقیقہ۔ مسلمانوں کی خالص مذہبی رسم ہے، جس کا آغاز بنی اسرائیل کے زمانے سے آلِ ابراہیمؑ میں چلا آتا ہے۔ یہود، پیدائش کے آٹھویں دن بچّے کو مسجدِ اقصیٰ میں لے جاکے اس کا سر منڈاتے اور قربانی کرتے تھے۔ اور اُن کا مقتدا خاص طریقوں سے اُس کے لیے برکت کی دعا کیا کرتا تھا۔ یہی طریقہ مسلمانوں میں بھی رسمِ ابراہیمیؑ اور سنّتِ محمدیؐ کی حیثیت سے آج تک جاری چلا آتا ہے۔ اگرچہ اب ولادت کے بعد آٹھویں دن عقیقے کی قید اُٹھ گئی ہے، مگر اکثر بچّے کی عمر کے پہلے ہی سال میں ہوجایا کرتا ہے۔ اس میں بچّے کو نہلا کے نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اعزّہ و احباب کے مجمع میں نائی اس کا سر مونڈتا ہے۔ اور جیسے ہی وہ سر میں اُسترا لگاتا ہے، بچّہ اگر لڑکا ہے تو دو اور لڑکی ہے تو ایک بکرا قربانی کیا جاتا ہے۔ منڈ جانے کے بعد سر میں صندل لگایا جاتا ہے۔ اعزّہ و اقارب حسبِ حیثیت بچّے کو کچھ رونمائی دیتے ہیں۔ قربانی کا گوشت غربا اور اعزّہ میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ اور گھر میں خوشی کا جلسہ ہوتا ہے اور اسی قسم کی محفل مرتّب ہوجاتی ہے جیسی کہ اور تقریبوں میں ہوتی ہے۔

کھیر چٹائی۔ اس تقریب سے بچّے کو دودھ کے علاوہ اور غذاؤں کے دینے کا آغاز ہوتا ہے جو اکثر اُس وقت ہوا کرتی ہے جب بچّہ چار پانچ مہینے کا ہوچکتا ہے۔ اکثر گھروں میں غذا کا آغاز کھیر سے کیا جاتا ہے جو خاص اہتمام سے پکائی جاتی ہے اور خاص طور پر قرابت دار خاتونوں کی موجودگی میں بچّے کو چٹائی جاتی ہے، جب کہ وہ نئے کپڑے پہنے ہوتا ہے اور سب بیویاں ترقیِ عمر کی دعاؤں کے ساتھ اس کے ہاتھ میں روپے دیتی ہیں اور وہی محفلِ طرب قائم ہوجاتی ہے جو ہر تقریب میں نظر آتی ہے۔

دودھ بڑھائی۔ یہ تقریب اُس موقع پر ہوتی ہے جب بچّے کا دودھ چھُڑایا جاتا ہے۔ اس میں عموماً گھجوریں پکائی جاتی ہیں تاکہ بچّہ اگر دودھ کے لیے ضد کرے تو بہلانے کے طور پر اس کے ہاتھ میں دے دی جایا کریں۔ مگر عموماً رواج ہے کہ اتنی مقدار میں پکائی جاتی ہیں کہ جن جن گھروں سے حصّہ داری ہے، ان میں تقسیم بھی ہو سکیں۔ دودھ کے چھُڑانے کا عام طریقہ یہ ہے کہ ماں یا مرضعہ کی چھاتیوں میں پانی میں گھول کے ایلوایا اور کوئی کڑوی چیز لگا دی جاتی ہے، جس کی کڑواہٹ سے گھبرا کے بچّہ دودھ چھوڑ دیتا ہے۔ اور جب پینے کے لیے ضد کرتا اور بہلانے نہیں بہلتا تو پھر یہی کارروائی کی جاتی ہے۔ اور دو ایک دفعہ میں اُسے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ دودھ بڑھائی کا زمانہ علی العموم اُس وقت ہوتا ہے جب بچّہ دو سال کا ہو جائے۔ حنفیوں میں مدّتِ رضاعت اڑھائی برس ہیں۔ یعنی اڑھائی برس کے بعد دودھ چھڑانا لازمی ہے۔ لیکن رواج اس سے کم ہی زمانے کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض عورتیں تین تین چار چار سال دودھ پلاتی رہتی ہیں مگر یہ بات عموماً نفرت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، اس لیے کہ شرع کے خلاف ہے۔ اِس تقریب میں بھی جن گھروں کو خدا نے استطاعت دی ہے، اُن میں بہت اچھی چہل پہل ہو جاتی ہے اور رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی ہے۔

بسم اللہ۔ یہ تقریب اُس دن ہوتی ہے جس روز لڑکے کو پہلے پہل پڑھنے کے لیے بٹھاتے ہیں۔ اور اس کا زمانہ از روے رسومِ مروّجہ وہ خیال کیا گیا ہے جب بچّہ چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جائے۔ اور اس چار کے عدد نے اس تقریب میں اس قدر خصوصیت پیدا کر لی ہے کہ چار سال چار مہینے چار دن کے بعد چار گھنٹے اور چار منٹ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ وقتِ مقررہ پر کوئی محترم مولوی صاحب یا کوئی بزرگِ خاندان لڑکے کو جو نہلا دھلا کے

اور نئے کپڑے پہنا کے دولھا بنا دیا جاتا ہے، پڑھانے کے لیے لے کے بیٹھتے ہیں۔ الف، بے، کی کتاب اس کے سامنے رکھتے ہیں اور بسم اللہ کہلا کے عربی کے دعائیہ الفاظ "رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر" کہلاتے ہیں۔ جن کے معنی یہ ہیں کہ "خدا وندا آسان کر اور دشوار نہ کر اور خیریت سے ختم کر"۔ پھر الف بے کہلا کے مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ عزیز و قریب لڑکے کو حسبِ توفیق دیتے ہیں اور اُس دن سے اُس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

ختنہ۔ یہ بھی سنّتِ ابراہیمی اور آلِ ابراہیم ؑ کی پُرانی اور ضروری رسم ہے۔ اور چونکہ ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کارروائی کے بعد سے لڑکا مسلمان ہو جاتا ہے اِس لیے اس رسم کا عام نام ہی "مسلمانی" پڑ گیا ہے۔ اِس میں بچّے کے عضوِ مخصوص کے مُنہ پر کی کھال کاٹ لی جاتی ہے، جس کا کاٹنا طبّی اور ڈاکٹری اصول سے بھی بعض امراض و شکایات سے بچنے کے لیے نہایت مفید ہے۔ یہ ایک قسم کا آپریشن ہے، جس کو ہمارے قدیم سرجن (جرّاح) جو عموماً نائی ہوتے ہیں، نہایت خوبی اور غیر معمولی پُھرتی سے انجام دیتے ہیں۔ اُن کو اچھا معاوضہ اور انعام دیا جاتا ہے اور اس رسم کے انجام دیتے وقت مردانے میں اکثر اعزّہ و احباب بُلا کے بٹھا لیے جاتے ہیں۔ اور زنانے میں مہمان بیویوں کا مجمع ہوتا ہے۔ ختنہ ہوتے ہی مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ جن کو استطاعت ہوتی ہے، دعوت کرتے ہیں۔ اور پھر اُس روز خوشی کی تقریب ہوتی ہے جب زخم اچھا ہونے کے بعد لڑکا غسلِ صحت کرے۔ اکثر خاندانوں اور سنّت امراد والے گھرانوں میں اُس روز لڑکا دولھا بنا کے گھوڑے پر چڑھایا جاتا ہے اور برات بڑے جلوس اور دھوم دھام کے ساتھ کسی درگاہ میں جاتی ہے، جہاں چادر اور مٹھائی چڑھا کے لڑکا اُسی شان سے گھر واپس آتا ہے، جہاں خوشی کے چہچہے اور عیش و شادمانی کے جلسے نظر آتے ہیں۔ اس رسم کے ادا ہونے کا زمانہ مختلف ہے۔ بعض لوگ چھٹی یا چلّے ہی میں بچّے کا ختنہ کرا دیتے ہیں۔ مگر عام رواج اس وقت ہے جب لڑکا چھے سات برس کا ہو جائے۔

ایک اور تقریب روزہ کشائی کی بھی ہے۔ یہ اُس وقت ہوتی ہے جب لڑکا یا لڑکی نو دس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور اسے پہلے پہل روزہ رکھوایا جائے۔ اِس میں علی العموم بہت سے روزہ داروں کی دعوت کی جاتی ہے جن کے لیے کثرت سے افطاریاں تیار کی جاتی ہیں اور لڑکا اُن کے ساتھ بیٹھ کے افطار کرتا ہے۔ اور لڑکی سے توزنانے میں مہمان روزہ دار بیویوں کے ساتھ روزہ کھولتی ہے۔ اس میں گانا بجانا کم ہوتا ہے۔ مگر شوقین اور رنگین مزاج لوگوں کے لیے یہ بہانہ بھی محفلِ رقص وسرود گرم کرنے کے واسطے کافی ہو جاتا ہے۔

اِسی قسم کی کارروائیاں غسلِ صحّت کی تقریبوں اور منّت مراد پوری ہونے کے موقعوں پر ہوا کرتی ہیں۔ اور سوا اُن خاص باتوں کے جو اس تقریب سے تعلق رکھتی ہوں، باقی سب باتیں ان میں بھی وہی ہوتی ہیں جو اور تقریبوں میں بیان کی گئیں۔

سب سے بڑی اور اہم تقریب شادی یا عقدِ نکاح ہے۔ یہ وہ ضروری تقریب ہے جس کی بے اعتدالیوں کی بدولت سیکڑوں خاندان تباہ و برباد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور وجہ یہ کہ خوشی کے جوش اور شاہدِ آرزو سے ہم کنار ہونے کی محویّت میں کسی کو نہ اپنی حالت و استطاعت کا خیال رہتا ہے نہ اپنے انجام و مآلِ کار کا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرض لے کے، جایدادیں بیچ کرکے، دوستوں عزیزوں سے مانگ کے، یا جس طرح کوئی رقم مل سکے فراہم کرکے، ارمانیں پوری کی جاتی ہیں۔ اور شادی کے ختم ہوتے ہی یہ حالت ہوتی ہے کہ اکثر گھروں میں فاقے کی نوبت آجاتی ہے۔

شادی اور نکاح چونکہ انسانی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے، اِس لیے اس کو ہم ذرا تفصیل و تشریح سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کی نسبت اکثر

مشاطاؤں کے ذریعے سے ٹھہرتی ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں، خصوصاً ان میں جہاں اگلے تمدن نے ترقی کی تھی، عورتوں کا ایک خاص پیشہ ہے مشاطہ گری۔ شعرا کے کلام اور لغت میں مشاطہ اُس عورت سے مراد ہے جو عالی مرتبہ خاتونوں کی کنگھی چوٹی کرتی، کپڑے اور زیور پہناتی، اور اور انھیں بنا چُنا کے سنوارتی اور آراستہ کرتی ہے۔ مگر سوسائٹی میں مشاطہ ان عورتوں کو کہتے ہیں جو شادی کے پیام لے جاتی، نسبتیں ٹھہراتی اور شادیاں کراتی ہیں۔ غالباً اس پیشے کی ابتدا انھی عورتوں سے پڑی جو حسینوں کو بنایا سنوارا کرتی ہیں، اور آخر میں شادی ٹھہرانے والی عورتوں کا نام مشاطہ پڑ گیا۔ یہ بڑی چالاک اور مکار عورتیں ہوا کرتی ہیں۔ ہر لڑکے کا پیام جب کسی گھر میں لے جاتی ہیں تو اُس کی دولت مندی، تعلیم، سعادت مندی، خوش اخلاقی اور خوبصورتی کی اس قدر تعریف کرتی ہیں کہ لڑکی والوں کی نظر میں اسے مثنوی میر حسن کا شاہزادہ بے نظیر ثابت کیے بغیر دم نہیں لیتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی لڑکی کی بات لڑکے والوں کے یہاں لے جاتی ہیں تو اُس کے حُسن و جمال، نازو انداز اور خوبی و رعنائی کے بیان میں ایسے قلقلے باندھ دیتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہیں وہ انسان نہیں، کوہِ قاف کی پری یا شاہزادی بدرِ منیر ہے۔

مشاطہ کی پیام رسانیوں کے بعد اگرچہ تحقیق و جستجو مرد ہی کرتے ہیں مگر نسبت ٹھہرنے میں زیادہ دخل دونوں گھروں کی عورتوں کو ہی ہوا کرتا ہے جو اپنا اطمینان کر کے مردوں کی رضامندی حاصل کرتی ہیں اور نسبت ٹھہر جاتی ہے۔ دونوں خاندانوں میں بچوں کے پیدا ہوتے ہی ارمان بھری مائیں نسبت ٹھہرا لیا کرتی ہیں۔ ان کے لیے مشاطہ کی ضرورت نہیں پیش آتی بلکہ دولھا کو بے غل وغش ٹھیکرے کی منگی دُلھن مل جاتی ہے اور شادی سے

بیش تر کی رسمیں جن کو نسبت ٹھہرنے سے تعلق ہے، ان کی نوبت نہیں آتی۔ گویا پیدا ہوتے ہی منگنی ہو جاتی ہے۔

نئے گھروں میں جب پیام جاتا ہے تو اکثر لڑکا اپنے چند عزیزوں اور مخصوص دوستوں کے ساتھ "بَر دکھوّا" کے نام سے دُلھن والوں کے وہاں بلایا اور ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہاں سے عورتیں بھی اُسے تاک جھانک کے دیکھ سکیں۔ گھر والے مرد جمع ہو کے اس سے ملتے اور حسبِ حیثیت خاطر مدارات کرتے ہیں۔ اسی طرح لڑکے کی ماں بہنیں ایک مقررہ تاریخ پر دلھن کے گھر میں جاتی اور مٹھائی کھلانے یا کسی اور بہانے سے دُلھن کا چہرہ دیکھتی ہیں، جو عام طور پر اُن سے چھپائی اور پردے میں رکھی جاتی ہے۔ مگر بعض شریف گھروں میں دولھا نہیں بلایا جاتا بلکہ خاندان کے مرد کسی نہ کسی عنوان سے لڑکے کی لاعلمی میں اسے دیکھتے اور اس کا حال دریافت کر لیتے ہیں اور یوں ہی لڑکی کی حالت کا بھی پتا لگا لیا جاتا ہے۔

اِن طریقوں سے جب لڑکے والے لڑکی کو، اور لڑکی والے لڑکے کو پسند کر لیتے ہیں، جس میں صورت شکل، حالت و حیثیت کے علاوہ شرافتِ خاندان کو بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے، تو منگنی کی رسم عمل میں آتی ہے۔ اِس میں دولھا کی طرف سے مٹھائی جاتی ہے، پھولوں کا گہنا جاتا ہے اور ایک سونے کی انگوٹھی جاتی ہے جسے بعض گھرانوں میں دولھا کی عزیز عورتیں خود جا کے پہناتی ہیں۔

منگنی کی رسم ادا ہو جانے کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ نسبت ٹھہر گئی۔ اور اُس وقت سے دونوں جانب معمول ہو جاتا ہے کہ جب کوئی تقریب ہو تو سمدھیانے میں خاص اہتمام سے حصے جائیں۔ اور جو حصہ لڑکے یا لڑکی کے لیے ہوتا ہے، وہ بڑا ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مزیّن و باوقعت بنا دیا جاتا ہے۔ اسی

اثنا میں اگر محرّم آگیا تو دونوں جانب سے اہتمام اور تکلف کے ساتھ گوٹا، الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور اعلا درجے کے کارچوبی اور ریشمی بٹوے سمدھیانے میں بھیجے جاتے ہیں۔

برات یعنی نکاح کے دن سے چند روز پہلے دُلھن مانجھے بٹھادی جاتی ہے جب کہ اُسے مانجھے کا زرد جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ اُس وقت سے روز اس کے اُبٹنا لگتا ہے اور بہ جز خاص ضرورتوں کے، وہ پردے سے باہر نہیں نکلتی۔ جس دن وہ مانجھے بیٹھتی ہے، اسی روز رسم ہے کہ اُس کا جھوٹا بٹنا، اُس کی جھوٹی مہندی، مصری کا کوزہ اور بہت سی پینڈیاں ایک شان دار جلوس اور باجے کے ساتھ دولھا کے گھر بھیجی جاتی ہیں۔ جو پینڈیاں خاص دولھا کے لیے ہوتی ہیں، وہ جداگانہ خوانوں میں ممتاز و مخصوص ہوتی ہیں۔ انھی کے ساتھ دولھا کے لیے مانجھے کا زرد بھاری جوڑا، ایک رنگی ہوئی منقش چوکی اور لوٹا کٹورا بھی ہوتا ہے۔ لوٹا کٹورا چوکی پر ناڑے سے کس کے باندھ دیے جاتے ہیں اور جلوس میں یہ چیزیں اس ترتیب سے ہوتی ہیں کہ باجے والوں اور جلوس کے بعد سب کے آگے چوکی ہوتی ہے۔ اُس کے بعد خوانوں میں دولھا کی مخصوص چیزیں ہوتی ہیں جو عموماً کچّے طباقوں میں رکھی ہوتی ہیں۔ اور ان کے بعد بہت سے خوانوں میں عام قسم کی پینڈیاں ہوتی ہیں۔ دُلھن کی چھوٹی بہنیں اور ڈومنیاں فینس اور ڈولیوں پر سوار ہو کے جاتی ہیں، جو دولھا کے گھر پہنچ کر، ایک پینڈی اور مصری کے سات سات ٹکڑے کرکے، وہ سب ٹکڑے دولھا کو ڈھکا ڈھکا کے کھلاتی ہیں۔ اِس رسم کی نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ خالص ہندی رسم ہے، جس کو نہ عرب سے تعلق ہے نہ عجم سے۔ اس لیے کہ مانجھے اور اُس ساتھ کنگنے کی ابتدا ہندوستان کے سوا اور کسی جگہ نہیں ثابت ہوتی۔

مانجھے کے دس بارہ روز سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد اُسی شان وشوکت اور جلوس کے ساتھ دولھا کے گھر سے دُلھن کے یہاں سانچق جاتی ہے۔ سانچق تاتڑ کی لفظ اور ترکی رسم ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ترک ومغل اِس رسم کو اپنے ساتھ ہندوستان میں لائے۔ اِس میں دولھا کے یہاں سے دُلھن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا ہے، جو عموماً بہت بھاری اور کارچوبی ہوتا ہے۔ اِس کے ساتھ دُلھن کے لیے سنہری منقش کا سہرا، چاندی کا چھلا، سونے کی انگوٹھی، دو ایک اور چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اور وہ زیور رہتا ہے جس کو پہنا کر وہ رخصت کی جائے گی۔ اور پھولوں کا گہنا ہوتا ہے۔ جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل، شکر کے قرص اور میوہ جاتا ہے۔ سانچق کے لیے خاص اہتمام سے منقش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے ہیں۔ پھر بانس اور کاغذ کے رنگا رنگ تختوں میں چار چار گھڑے لگا کے چوگھڑے بنا دیے جاتے ہیں، اور دولت مندی وامارت کی شان کے مناسب ان چوگھڑوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور اکثر سو سو، دو دو سو کے شمار کو پہنچ جاتے ہیں مگر ان کے اندر چند گنتی کے نقلوں یا پاؤ آدھ سیر شکر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُن کے منہ گھڑوں پر عموماً سرخ کا کپڑا ناڑے سے بندھا ہوتا ہے۔ اور جلوس میں ان سب گھڑوں کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی رہتی ہے جس میں دہی بھرا ہوتا ہے۔ اور اُس کے منہ پر بھی سوہا ناڑے سے باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے گلے میں مبارک فالی کے لیے دو ایک مچھلیاں بھی بندھی ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں جب دُلھن کے گھر پہنچتی ہیں تو اعزہ واقارب میں تقسیم ہوتی ہیں۔

(۴۶)

سانچق کے دوسرے ہی روز شب کو دُلھن کے گھر سے بڑے جلوس اور روشنی کے ساتھ منہدی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ غالباً یہ عربی الاصل رسم

ہے۔ اس میں دراصل دُلھن والوں کی طرف سے دولھا کے لیے وہ جوڑا جاتا جسے پہن کر وہ بیاہنے کو آئے گا۔ اِس جوڑے میں علی العموم قدیم عہدِ مغلیہ کی درباری وضع کا خلعت، شملہ، جیغہ، سرپیچ اور مرصّع کلغی ہوتی ہے۔ نصیب ہوا تو اس کے ساتھ موتیوں کا ہار بھی بھیجا جاتا ہے۔ مذکورہ چیزوں کے علاوہ ریشمی پائجامہ اور جوتا وغیرہ معمولی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ اکثر ایک طلائی انگوٹھی بھی جاتی ہے۔ اِس جوڑے کے ساتھ دولھا کے لگانے کے لیے پسی ہوئی تیار مہندی بھی بھیجی جاتی ہے جس کو بہت سے طباقوں میں پھیلا کے رکھتے ہیں اور اس میں سبز و سرخ شمعوں کو نصب کر کے روشن کر دیتے ہیں۔ اِس طرح کے مہندی کے بہت سے طباق روشن ہوتے ہیں جو مہندی کے جلوس میں ایک خاص شان اور آن بان پیدا کر دیتے ہیں۔ مہندی کے ان روشن طباقوں کے ساتھ سوپچاس طباقوں میں ملیدہ ہوتا ہے جو خرموں کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے اور جیسی حیثیت ہوتی ہے، اُسی کے مناسب کثرت سے بھیجا جاتا ہے۔ اِس موقع پر جوڑے کے ساتھ دولھا کے لیے سونے کا سہرا بھی بھیج دیا جاتا ہے۔

مہندی کے دوسرے دن دولھا کی طرف سے برات جاتی ہے۔ برات جانے کا اگلا ضروری وقت، پہر رات رہے یعنی تین بجے شب کا تھا۔ لیکن اب یہ وقت اکثر چھوٹتا جاتا ہے اور بجائے پہر رات رہے کے، پہر دن چڑھے یعنی نو دس بجے صبح کو براتیں جانے لگی ہیں۔ اِس تاخیر کی ابتدا واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کے زمانے سے ہوئی۔ اُن کی برات جانے میں اتفاقاً دیر ہوگئی اور دن نکل آیا تھا۔ لوگوں نے آسانی اور روشنی کے سامان کی تخفیف کے خیال سے اِسی وقت کو اختیار کرنا شروع کر دیا چنانچہ اب عموماً ابتدائے روز میں برات جاتی ہے اور دوپہر کو عقد ہو جاتا ہے۔

برات میں حتی الامکان پورا جلوس جمع کیا جاتا ہے۔ مروّجہ تین باجے: یعنی بُرا ناڈھول، تاشے اور جھانجھیں۔ روشن چوکی۔ اور ارگن باجا ضرور ہوتے ہیں۔ اس سے ترقی ہوئی تو گھوڑوں پر نوبت، نقارہ، جھنڈیاں، برچھے بردار، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے۔ اور اس سے بھی زیادہ حوصلہ ہوا تو اُنھی باجوں کے متعدّد گروہ بڑھا دیے جاتے ہیں۔ دولھا وہی جوڑا پہن کے جو مہندی کے ساتھ آیا تھا اور سہرا باندھ کے علی العموم گھوڑے پر اور اعلا طبقے کے اُمرا کے یہاں ہاتھی پر سوار ہو کے سارے جلوس اور باجوں کے پیچھے آہستہ آہستہ زینت و وقار سے روانہ ہوتا ہے۔ دولہا کو "نوشہ" یعنی نیا بادشاہ کہتے ہیں۔ اور خیال بھی یہی ہے کہ دولھا ایک دن کے لیے بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ جب دولھا کو بادشاہ بناتے ہیں تو اس کے سر پر شملہ کیوں ہوتا ہے؟ تاج کیوں نہیں پنھاتے؟ اِس سے اِس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں سلطان سریرآرا تاج نہیں پہنتے تھے، بلکہ سب کے سروں پر کلغی دار شملے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے غازی الدین حیدر کے زمانے سے شاہانِ اودھ کو تاج پنھا دیا۔ مگر وطنی سوسائٹی نے اس تاج کو قبول نہیں کیا اور اپنے بادشاہوں کی وضع وہی رکھتی جو پُرانی تھی اور اسی نمونے کا بادشاہ اپنے نوشاہوں کو بناتے ہیں۔ دولھا کے پیچھے فینسوں اور ڈولیوں میں سوار دولھا کی ماں بہنیں اور عزیز و قریب عورتیں اور ڈومنیاں ہوتی ہیں۔ چلتے وقت گھر میں جو صدہا رسمیں اور ٹوٹکے ہوتے ہیں، بہت ہیں، اور لغو ہونے کی وجہ سے زیادہ تر قابلِ لحاظ بھی نہیں۔

اِس شان سے جب برات دُلھن کے گھر پہنچتی ہے تو عموماً اُس وقت دلھن نہلائی جا چکتی ہے اور اُس کے غسل کا پانی باہر لا کے دولھا کی سواری کے گھوڑے یا ہاتھی کے پانو کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے۔ دلھن کو یہ غسل سات

دن کے باسی ٹھنڈے پانی سے دیا جاتا ہے جو کلس کا پانی کہلاتا ہے۔ اور جاڑوں کے موسم میں غریب دلھن کے لیے اس پانی میں نہانا قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ چوکی پر پان بچھا کے وہ نہلائی جاتی ہے اور یہی پان اُس اکیس پانوں والے بیڑے میں شامل ہوتے ہیں جو سب سے پہلے سسرال میں کھلایا جاتا ہے۔

اب دولھا سواری سے اتر کے زنانے میں جاتا ہے۔ وہاں رسمی تنگھائی جاتی ہے۔ اور طرح طرح کی پہیلیوں اور رسمیں عمل میں آتی ہیں جو ہر گروہ اور ہر خاندان میں جدا جدا اور عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ یہ وقت علی العموم وہ ہوتا ہے جب دلھن نہا تو چکتی ہے مگر ابھی کپڑے نہیں پنھائے گئے ہوتے ہیں۔ وہ ایک چادر میں لپٹی ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ پر مصری رکھ کے دولھا کو کھلائی جاتی ہے۔ جس میں سالیاں زندہ دل عورتیں اور ڈومنیاں قیدیں بڑھا بڑھا کے دولھا کے لیے ہر کام مشکل کر دیتی ہیں۔

شادی کی یہ پہلی ہفتخوان طے کر کے دولھا باہر مردانے میں آتا ہے، جہا ں بزمِ نشاط مرتّب ہوتی ہے۔ اعزّہ و احباب پُر تکلّف کپڑے پہنے، قرینے سے صاف ستھری دری چاندنی اور قالینوں کے فرش پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور سامنے مردانہ یا زنانہ طائفہ کھڑا مجرا کرتا ہوتا ہے۔ عین محفل کے درمیان میں اور صدر مقام پر دولھا کے لیے زرنگار مسند تکیہ ہوتا ہے جس پر دولھا کو اُس کے ہم عمر لڑکے لا کے بٹھا دیتے ہیں اور اس کے دونوں طرف خود بیٹھ جاتے ہیں۔ تاکہ دولھا اُن کے ساتھ آزادی سے باتیں کر سکے۔

دولھا کے لیے لازم ہے کہ اپنی ہر وضع، ہر حرکت سے شرمیلا پن ظاہر کرے۔ وہ نہ تو بے تکلف باتیں کر سکتا ہے، نہ کوئی اُس کی آواز سن سکتا ہے، نہ کسی سے وہ بے تکلفی سے مل جل سکتا ہے۔ منھ پر سہرا ہوتا ہے اور پھر سونے کے سہرے پر پھولوں کا سہرا باندھ کے، اِس قابل نہیں رکھا جاتا

کہ کوئی بغیر کوشش اور دیر تک کی محنت کے اُس کی صورت دیکھ سکے۔ محفلِ نشاط میں بیٹھنے بلکہ اکثر عقد ہو جانے کے بعد سہرا اٹھا کے شملے میں لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ چہرہ کھُل جائے۔ مگر اب بھی اُس کے لیے لازم ہے کہ ایک ہاتھ سے مُنہ پر رومال رکھے رہے، جو اظہارِ شرم کی ایک علامت ہے۔ اور اب چہرہ کھُلنے کے بعد بھی اس رومال کی وجہ سے اُس کی صورت دیکھنے کے شائقین کو بغیر دیر تک اس فکر میں لگے رہنے کے کامیابی نہیں ہو سکتی۔

دولھا کے باہر آکر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عقدِ نکاح کا انتظام ہوتا ہے، جس کے لیے یہ سب بکھیڑا کیا گیا ہے۔ اگر شیعہ خاندانوں کی شادی ہے تو دو مجتہد صاحب تشریف لاتے ہیں، ایک لڑکے کے نائب و وکیل بن کے اور دوسرے لڑکی کے نائب و وکیل بن کے۔ لڑکی والے خود پردے کے پاس جا کے یا عادل شاہدوں سے تصدیق فرما کے لڑکی کی شرعی مختاری حاصل کرتے ہیں اور اُس کے بعد دونوں دولھا کے سامنے بیٹھ کے دولھا دُلھن کی جانب سے قرأت و صحتِ مخارج سے ایجاب و قبول کے صیغے ادا کرتے ہیں۔ اور اگر خاندان سُنّی ہے تو کوئی محترم مولوی صاحب اور اگر کوئی گانو ہوا تو وہاں کے مقررہ خاندانی قاضی صاحب آ کے نکاح پڑھاتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے عزیزوں میں سے کوئی صاحب اُس کے وکیل و مختار بن کے آتے ہیں اور وہ شاہدوں کو پیش کرتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے مجھے اپنا وکیل ان دونوں شاہدوں کے سامنے مقرر کیا اور مجھے اپنے عقد کا اختیار دیا۔ قاضی صاحب ان شاہدوں پر اطمینان کر کے اور مقدارِ مہر کو اُن وکیل صاحب سے دریافت کر کے، دولھا کو کلمۂ شہادت پڑھاتے، مسلمان کے لیے جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے" ان کا عربی میں اقرار کراتے اور اُس کے بعد تین بار اس سے یہ کہہ کے

کہ "فلاں لڑکی کے ساتھ اتنے مہر پر ہم نے تمھارا عقدِ نکاح کر دیا۔" دولھا سے اقرار کراتے ہیں کہ "میں نے قبول کیا۔" اس کے بعد ایک دعائیہ خطبہ پڑھ کے لوگوں سے کہتے ہیں : "مبارک" ساتھ ہی مبارک سلامت کا غل ہوتا ہے۔ نقل اور چھہارے جو سینیوں میں بھرے سامنے رکھے ہوتے ہیں، ان کو حاضرین میں لٹا دیتے ہیں۔

مجتہد یا مولوی صاحب کے آنے کے وقت گانا موقوف ہو جاتا ہے۔ اور بعدِ عقد مولوی صاحب چلے جاتے ہیں تو پھر رقص و سرود کی محفل گرم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد دولھا پھر اندر زنانے میں بلایا جاتا ہے۔ عورتوں کی دنیا میں رسوم اور شرائطِ عقد کے اصلی لوازم کے بجا لانے کا خاص یہی وقت ہے۔ زنانے میں اس موقع پر رسومِ نکاح کے ضمن میں دولھا کے ساتھ ہر قسم کا تمسخر کیا جاتا ہے اور اس کے پریشان کرنے میں کوئی کارروائی اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ ان تمام رسوم کی بجا لانے والی سالیاں اور ڈومنیاں ہوتی ہیں۔ درحقیقت ناکتخدا نوجوانوں کے لیے شادی ایک پُراسرار لاج (فراموش خانہ) ہے، جس میں بیسیوں ایسے مراحل پیش آتے ہیں جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ دلھن اوڑھ لپیٹ کے ایک غیر متحرک گٹھری کی طرح اس کے سامنے لا کے رکھ دی جاتی ہے۔ ابھی تک اسے رخصتی کا جوڑا نہیں پنھایا گیا ہوتا۔ لاتے وقت کوشش کی جاتی ہے کہ پہلی آمد میں دلھن کی ایک لات دولھا کے پڑ جائے۔ پھر ٹونے گائے جاتے ہیں۔ دولھا سے بیوی کی غلامی، ذلیل ترین غلامی اور خدا جانے کیسی کیسی خدمتیں بجالانے کا اقرار کرایا اور وعدہ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آرسی مصحف کی رسم ادا ہوتی ہے، جس کے لیے دولھا دلھن کے درمیان رحل پر قرآن شریف اور اس پر آئینہ

رکھا جاتا ہے۔ اور اُس آئینے میں دولھا کو دُلھن کا پہلا جلوہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر لازم ہے کہ چہرہ دیکھنے سے پہلے دولھا سورۂ اخلاص پڑھ لے۔ اس جلوے میں دُلھن آنکھیں بند کیے رہتی ہے۔ عورتیں دولھا سے آنکھیں کھولنے کے لیے طرح طرح کی التجائیں کراتی ہیں اور اسی سلسلے میں ہر قسم کی اطاعت و غلامی کا اُس سے اقرار کرا لیتی ہیں۔ بڑی مشکلوں اور خوشامدوں کے بعد دُلھن آنکھیں کھول کے ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اور اسی پر رسوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب دولھا باہر رخصت کر دیا جاتا ہے کہ دُلھن کو کپڑے پہنائے جائیں، زیور پہنایا جائے، بناؤ سنواری اور سسرال جانے کے لیے تیار کی جائے۔ اُس وقت ڈومنیاں بابل یعنی رخصتی کا نغمۂ جاں گداز گاتی ہیں اور خوشی کا گھر، ماتم کدہ بن جاتا ہے۔ جب دُلھن بنا چُنا کے تیار کر دی جاتی ہے، اس وقت میکے کے تمام عزیز دوست اور سب ملنے والے آتے، رو رو کے دُلھن کو رخصت کرتے اور جو کچھ توفیق ہوئی روپیا یا زیور اُسے دیتے ہیں۔

(۴۷)

اسی اثنا میں جہیز کا سامان نکالا جاتا ہے۔ اُس کی فردلا کے دولھا والوں کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ جس میں وہ تمام زیور، جوڑے، ظروف۔ پلنگ اور چوکی اور جو کچھ چیزیں دی جائیں، درج ہوتی ہیں۔ تمام چیزوں کا فہرست سے مقابلہ کر لیا جاتا ہے اور اب دُلھن رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار ہوتی ہے۔ اس کا لباس کوئی بھاری کام دار جوڑا نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک سوہے یعنی ٹول پر کی تنزیب کا کرتا اور سادہ ریشمی پائجامہ پہنے ہوتی ہے۔ اور اُن میں بھی سادگی کا اس قدر لحاظ رہتا ہے کہ گوٹ تک نہیں لگائی جاتی۔ اور ناڑے کا ازار بند

پڑا ہوتا ہے۔

اس کے سنگار اور کپڑے پہنانے کے وقت ڈومنیاں "بابل" یعنی میکا چھوٹنے کا راگ گاتی رہتی ہیں، جو نہایت ہی پُر حسرت اور جگر گداز ہوتا ہے۔ ایک عجیب رنج و الم کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ہر شخص ملول و حزیں ہوتا ہے۔ تمام اعزّہ، ملنے والے، اور خاندان کے دوست احباب مل مل کے اور سوز و گداز کے الفاظ کے ساتھ لڑکی کو رخصت کرتے ہیں۔ وہ خود زار و قطار روتی ہوتی ہے۔ اور فینس ڈیوڑھی میں لگا دی جاتی ہے۔ اُس وقت دولھا پھر اندر بلایا جاتا ہے کہ آکے اپنی دلھن کو لے جائے۔ وہ آتا اور دُلھن کو اپنی گود میں اُٹھا کے فینس میں بٹھا دیتا ہے۔

رخصت سے پہلے زنانے میں دولھا کو سلام کرائی دی جاتی ہے اور تمام اعزّہ و اقارب، دوست احباب بہ قدرِ حیثیت دیتے ہیں۔ اُسی وقت باہر شربت پلائی ہوتی ہے، جس میں شربت کا کنٹر اور گلاس فقط رسم کے طور پر لایا جاتا ہے، پیتا کوئی نہیں، مگر تمام حاضرینِ محفل شربت کی تھالی میں حسبِ حیثیت و توفیق روپیا ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اندر باہر جو کچھ روپیا سلام کرائی اور شربت پلائی میں جمع ہوتا ہے، دولھا کو دے دیا جاتا ہے۔

اب برات اُسی دھوم دھام اور اُسی شان و شوکت سے دولھا کے گھر کی طرف واپس روانہ ہوتی ہے۔ واپسی کے اس جلوس میں جو اضافہ ہوتا ہے، اُس میں سب سے پہلے تو دُلھن کی فینس ہے جو دولھا کے گھوڑے کے آگے رہتی ہے اور نہایت ہی ممتاز ہوتی ہے۔ پُر تکلّف چھپکا پڑا ہوتا ہے دونوں جانب کہاریاں چھپکے کو پکڑے ہوئے ساتھ رہتی ہیں۔ اردگرد دولھا کے ملازموں یا مخصوص لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور دولھا کے بعد

پھر اندر سب ساتھ والی عورتوں کی فینسیں رہتی ہیں۔

سب سے زیادہ نمایاں چیز اس جلوس میں جہیز کا سامان ہوتا ہے۔ یہ سب سامان سارے جلوس اور باجے والوں کے پیچھے اور دُلھن کی فینس کے آگے اس ترتیب سے جاتا ہے کہ تانبے کا ایک ایک برتن ایک ایک چنگیر میں رکھا ہوتا ہے اور ایک مزدور کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چینی اور شیشے کے ظروف کشتیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ اُن کے بعد صندوق وغیرہ ہوتے ہیں جن میں دُلھن کے جوڑے ہوتے ہیں۔ ان کے بعد پلنگ ہوتا ہے جس میں ریشمی توشک، لحاف، تکیے، چادر، سب سامان تیار موجود ہوتا ہے۔ اور بچھونا ریشمی ڈوریوں سے پایوں میں بندھا ہوتا ہے اور ڈوریوں کے دونوں سروں پر خاص وضع کے نقرئی گچھے لٹکتے ہوتے ہیں۔ لڑکی کو معاشرت کا تمام سامان دیا جاتا ہے۔ آیئنہ، کنگھی، سنگھار کی ضروری چیزیں، تیل، عطر اور اگر استطاعت ہو تو چاندی کا پاندان، خاصدان، لوٹا، کٹورا اور بعض اور چیزیں دی جاتی ہیں۔ بہرحال یہ سب سامان باجوں اور برات کے جلوس اور دولھا کے درمیان میں رہتا ہے۔ اور سب کے پیچھے ڈولیوں پر کھانے کی دیگیں ہوتی ہیں۔ یہ بھوڑے کا کھانا کہلاتا ہے جس کو عموماً لڑکی والے دولھا کو دیتے ہیں۔

اس شان سے جب برات دولھا کے گھر پہنچتی ہے تو خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ ڈومنیاں پہلے سے پہنچ کے بنڑے گانا شروع کرتی ہیں۔ جو خاص شادی کے گیت ہیں۔ اور اس مبارک سلامت کے زور شور میں دُلھن اُتاری جاتی ہے۔ بعض خاندانوں میں یہاں بھی اُسے دولھا ہی گود میں لے کے اُتارتا ہے۔ اور بعض گھرانوں میں دولھا کی ماں بہنیں آ کے اتارتی ہیں، اندر راستے لے جا کے بٹھاتے ہی دولھا سے اُس کے دامن پر نمازِ شکرانہ پڑھائی جاتی ہے۔ دُلھن کے پانو دُھلا کے، پانی مکان کے چاروں کونوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ رونمائی ہوتی ہے، جس میں

تمام عورتیں اور عزیز مردجی کھول کھول کے روپیا یا زیور دیتے ہیں اور مُنہ کھول کھول کے اُس کی صورت دیکھتے ہیں۔

اِس نئے گھر میں یہ پہلی رات دُلھن کے لیے نہایت سخت پابندیوں اور شرمیلے پن سے بسر کرنے کی رات ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی سے بول سکتی ہے، نہ باتیں کرسکتی ہے، نہ کسی کو آنکھ بھر کے دیکھ سکتی ہے سوا میکے کی ساتھ والیوں کے اور کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور اسی مصیبت سے بچانے کے لیے صبح ہوتے ہی اس کا بھائی یا اور کوئی رشتے دار چوتھی لینے کو آپہنچتا ہے اور جہاں تک بنتا ہے سویرے ہی سوار کرالے جاتا ہے۔ اِس مرتبہ بھی دُلھن اگرچہ امتیاز اور شان سے جاتی ہے، مگر جلوس اور باجے کی ضرورت نہیں۔ دولھا بھی دُلھن کے ساتھ جاتا ہے اور اُس کے ساتھ سات طرح کی ترکاریاں اور سات قسم کی مٹھائیاں جاتی ہیں۔

دن گزر کے، اُسی رات کو دُلھن کے گھر میں چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ دُلھن کو وہ بَر کا جوڑا اُتار کے چڑھاوے کا جوڑا پہنایا جاتا ہے جو سب جوڑوں سے زیادہ بھاری، کام دار اور نہایت ہی پُر تکلّف ہوتا ہے۔ یہ جوڑا پہنا کے، اُس کا خوب بناو چُناو کیا جاتا ہے۔ دولھا کی طرف سے اُس کی بہنیں اور رشتے دار عورتیں بھی آجاتی ہیں۔ اور اس مجمع میں دولھا دُلھن بٹھائے جاتے ہیں اور دولھا کی ساتھ والیاں اور دُلھن والیاں ترکاری اور پھولوں کی چھڑیوں سے باہم لڑتی ہیں۔ یعنی مٹھائی اور ترکاریاں ایک دوسرے کے کھینچ کھینچ کے مارتی اور چھڑیوں کے ہاتھ رسید کرتی ہیں۔ کبھی دل لگی دل لگی میں لڑائی تیز بھی ہو جاتی ہے اور بعض عورتیں خفیف سی چوٹ بھی کھا جاتی ہیں۔

چوتھی کے دو چار روز بعد پھر دُلھن، دولھا کے گھر میں آتی ہے اور اُس کے بعد

علی العموم چار چالے ہوا کرتے ہیں۔ چالے کا لفظ چال اور چلنے سے نکلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلھن اپنی سسرال سے بلائی جاتی ہے۔ مگر یہ بلانا خود اُس کے میکے میں نہیں بلکہ میکے والیوں میں ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی خالائیں، پھوپھیاں، ممانیاں ہمت کر کے باری باری اُسے اپنے یہاں بلاتی ہیں، جہاں وہ مع دولھا کے جاتی ہے۔ اور اس نئے جوڑے کے رکھ رکھاو کے لیے خاص اہتمام اور انتظام کیا جاتا ہے۔ فقط ایک رات دن دولھا دلھن مہمان رہتے ہیں اور رخصت کرتے وقت اُنھیں جوڑا، سلام کرائی، اور زیور وغیرہ بقدر ہمت و استطاعت دیے جاتے ہیں۔

یہ تھی لکھنؤ والوں کی شادی، جس کی بہت سی رسموں کو چھوڑ کر اس کا ایک اجمالی خاکا ناظرینِ دلگداز کو دکھا دیا گیا۔ دیہات والوں کی شادی کا طریقہ بہ جز عقدِ نکاح کے، اور تمام باتوں میں بدلا ہوا ہے۔ وہاں بھی مانجھا ہوتا ہے مگر دولھا کے لیے مانجھے کا زرد جوڑا اس کی بہنیں اور عزیز عورتیں لاتی ہیں۔ دلھن کے گھر سے دھوم دھام اور جلوس اور باجے کے ساتھ مانجھا نہیں آتا۔ نہ دولھا کے یہاں سے سانچق آتی ہے اور نہ دلھن کے گھر سے مہندی آتی ہے۔ بلکہ سانچق اور مہندی کا مقصد برات ہی کے دن ایک اور طریقے سے پورا ہو جاتا ہے وہ یہ کہ برات جب دلھن کے وہاں پہنچتی ہے تو اُس کے مکان سے ذرا فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے۔ وہاں سے پہلے بجائے سانچق کے، بری کے نام سے دلھن کا جوڑا اور اُس کے ساتھ اور بہت سے جوڑے اور سہاگ کی چیزیں جو ضروری سمجھی جاتی ہیں، کچھ شکر، کچھ کھیلیں، خوانوں پر لگا کے، باجے کے ساتھ دلھن کے دروازے پر بھیجی جاتی ہیں۔ دولھا کے اعزّہ و احباب ساتھ جاتے ہیں جو اُن سب چیزوں کو دلھن والوں کو علانیہ دکھاتے اور اُن کے سپرد کرتے، شربت پینے کے بعد واپس آتے ہیں۔

اس کے تھوڑی دیر بعد اسی طریقے سے دلھن کی طرف سے بری آتی ہے،

جس میں دولھا کا جوڑا ہوتا ہے۔ یہ بری دیہاتیوں میں مہندی کی قائم مقام ہے۔ اس کے بعد وہ جوڑا پہن کے جس میں جامہ، نیمہ، پگڑی، مقنع، سہرا، پھولوں کی بدھیاں اور جوتا وغیرہ ہوتا ہے، روانہ ہوتا ہے۔ اب برات دلھن کے دروازے پر جاتی اور اس مقام میں ٹھہرتی ہے جو محفلِ نکاح کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ یہاں رات بھر نغمہ وسرود اور ناچ گانے کی محفل گرم رہتی ہے، بجز اس وقت کے جب قاضی صاحب آ کے نکاح پڑھائیں۔ نکاح کا وہی طریقہ ہے جو شہر والوں میں بیان کیا گیا۔ عقد کے بعد لڑکی والے برات کا کھانا دیتے ہیں۔ شہر میں بجز بھوڑے کے کھانے کے برات کو کھانا دینا لازمی نہیں ہے۔ بلکہ دولھا خود کھلا پلا کے لے جاتا ہے۔ مگر دیہات میں لڑکی والوں کا اہم ترین فرض برات کو کھلانا ہے، جس میں ذرا بھی کمی رہ جائے تو ان کے خیال میں برادری میں ناک کٹ جاتی ہے۔

یہ کھانا پورا اتورا ہوتا ہے۔ جس میں پلاو، زردہ، قورمہ، خمیری روٹیاں، شیرمال، لازم ہیں۔ اور ہر ادنا و اعلا کو بلا استثنا و امتیاز پورا اتورا دیا جاتا ہے۔ کھانا لیتے وقت لڑکے والے نہایت بے حمیتی اور بے شرمی سے چونٹی چونٹی کے لیے کھانا مانگتے ہیں۔ گھوڑوں اور بیلوں کے لیے دانہ چارہ ضرورت سے بہت زیادہ طلب کرتے ہیں۔ اور لڑکی والوں پر فرض ہے کہ زبان سے نہیں نہ نکلے۔ کسی چیز کے دینے سے انکار کیا اور آبرو خاک میں مل گئی اور سب کیا دھرا برباد ہو گیا۔

اس کے بعد رخصتی اور واپسی کا قریب قریب وہی طریقہ ہے جو شہر والوں میں ہے۔ ہاں ایک رواج یہ بھی ہے کہ دیہات میں برات کے ساتھ عورتیں نہیں جاتیں۔ اور نہ دلھن کے ساتھ کوئی معزز خاتون آتی ہے۔ دائی اور خادمہ کی حیثیت سے دو ایک ادنا درجے کی عورتیں البتہ چلی آتی ہیں۔ ماسوا اس کے دیہات میں دلھن پر بھی بہت زیادہ سختیاں ہوتی ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ چوتھی میں واپس آنے کی

گھڑی تک سسرال میں جس طرح رکھ دی جائے، رکھی رہے۔ نہ کھائے نہ پیئے، نہ پیشاب پاخانے کو جائے، نہ بولے نہ چالے، نہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور نہ آنکھیں کھولے۔ اس لیے کہ یہ سب باتیں بے حیائی و بے شرمی میں داخل ہیں۔ اور اس اندیشے سے کہ دلھن کو سسرال میں جاکے پاخانے پیشاب کی ضرورت نہ پیش آئے، دو دن پہلے سے اُس کا کھانا پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اور زیادہ مصیبت یہ ہے کہ دیہات کی دلھن اکثر دوسرے گانو میں بیاہ جاتی ہے۔ اور آمد و رفت میں دو دو تین تین منزلیں طے کرنا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں دلھن بے چاری پر کیسی سخت مصیبتیں گزرتی ہوں گی۔

دیہات میں ساچق اور مہندی کے ترک ہو جانے اور برات کھلانے میں سختیاں ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ زیادہ تر برات سفر کر کے ایک بستی سے دوسری بستی میں جاتی ہے، جس کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ایک دن ایک جلوس یہاں سے جائے اور دوسرے دن دوسرا جلوس وہاں سے یہاں آئے اور پھر تیسرے روز برات روانہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس براتیوں کو گو کہ دولھا اکثر اپنے گھر سے کھلا کے لے جاتا ہے، مگر لڑکی والے کے گھر پہنچتے پہنچتے سارے براتی بھوکے بنگالی ہوتے ہیں اور کنگلوں کی سی شان دکھانے لگتے ہیں۔

(۴۸)

خوشی کی تقریبوں کو ہم بقدرِ ضرورت بتا چکے۔ اب غمی کی صحبتوں کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ مگر یہ سارے ہندوستان میں عام ہیں۔ جہاں تک میں نے غور کیا، ان میں لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی۔ غمی کا باعث، کسی کا مرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا مرنے کے دن اعزّہ و احباب کو خبر کر دی جاتی ہے۔ اور جن لوگوں کو مجبوری مانع نہیں ہوتی، ضرور آتے ہیں۔ عورتیں جو آتی ہیں، اپنی ڈولی یا سواری کا کرایہ آپ دیتی ہیں۔ شادی کی تقریبوں میں اور عام قسم کی آمد و رفت میں لازم ہے کہ مہمان

آنے والیوں کا کرایہ دیا جائے مگر غمی کا گھر اِس تکلیف سے مُستثنا کر دیا گیا ہے۔

اِس کے بعد مُردے کو نہلاتے ہیں۔ شیعوں کے یہاں معمول ہے کہ غسل کے لیے جنازہ پہلے غسل خانے میں لے جایا جاتا ہے، جہاں غسّال جو نہلانے میں نہایت مشّاق مگر اِس کے ساتھ قسیّ القلب مشہور ہیں، مُردے کو غسل دے کے کفن پہناتے ہیں۔ مگر سُنّیوں کے یہاں مُردہ اپنے گھر ہی میں نہلایا جاتا ہے اور خود اعزّہ و اقارب یا دوست احباب نہلاتے ہیں۔ اکثر مرد اور عورتیں جو زیادہ مشّاق ہوں، بلا لیے جاتے ہیں۔ اور اکثر جگہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شرع داں مولوی صاحب یا اور کوئی پڑھے لکھے واقف کار بزرگ بتاتے جاتے ہیں کہ اس ترتیب سے نہلانا چاہیے اور مسنون غسل میّت کیا ہے۔

غسل کے کفن پہنایا جاتا ہے، جس میں ازار، ایک کفنی، جو کُرتے کے نام سے مشہور ہے، پہنا کے، اوپر سے دو چادریں لپیٹ دی جاتی ہیں اور سر اور پانو کے پاس اور کمر میں کپڑے کی چٹّیں پھاڑ کے باندھ دی جاتی ہیں تاکہ کھلنے نہ پائیں۔

اِس کے بعد اگر شیعوں کا جنازہ ہے تو صندوق میں رکھ کے، اس پر کوئی دو شالا ڈال کے، جنازے کو شامیانے کے سایے میں لے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ کوئی شخص قرأت و اداے مخارج سے سورۂ رحمان کی بعض آیتیں پڑھتا جاتا ہے۔ صندوق، شامیانے کے اٹھانے والے علی العموم شہدے ہوتے ہیں، جن کا مدّتِ دراز سے مُردے اٹھانا پیشہ ہو گیا ہے۔ مگر ان لوگوں کی بے ہودگیوں اور بدتمیزیوں سے شیعوں میں خیال پیدا ہوا ہے کہ جنازوں کو خود اُٹھانا چاہیے۔ جس کے لیے متعدد کمیٹیاں شہر میں قائم ہو گئی ہیں، اور ان کے پُرجوش اور دین دار ارکان تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی مر جائے تو اس کے جنازے کو خود اپنے اہتمام میں لے کے مذہبی آداب اور احتیاطوں سے اٹھائیں۔

سُنّیوں میں میّت کو کسی ہلکی چارپائی پر لٹا کے، اور اوپر سے چادر ڈال کے لے جاتے ہیں۔ اگر عورت کا جنازہ ہو تو چارپائی پر بانس کی کھپاچوں کو قوس نما صورت میں قائم کرکے، اور ان کے سروں کو دونوں جانب چارپائی میں اٹکا کے، اوپر سے چادر ڈالتے ہیں۔ اِس کو گہوارہ بنانا کہتے ہیں اور اس کی ضرورت محض پردے کے خیال سے پیدا ہوئی ہے۔ سُنّیوں میں جنازے کو خود عزیزہ و احباب اپنے کندھوں پر اُٹھا کے آہستہ آہستہ کلمہ پڑھتے ہوئے لے جاتے ہیں اور نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے

قبر یہاں عموماً صندوقی کھودی جاتی ہے، جس میں انسان کے سینے تک ایک چوڑا حوض کھودا جاتا ہے، پھر اس کے اندر دونوں جانب کنارے چھوڑ کے ایک دوسرا پتلا حوض کھودا جاتا ہے۔ وہ بھی انسان کی کمر سے کم گہرا نہیں رہتا۔ جب قبر خوب صاف کرلی جاتی ہے، تو مُردے کو اُس میں نہایت احتیاط سے اتارتے ہیں، تاکہ ہاتھ سے گرنے اور چوٹ کھانے نہ پائے۔ قبر میں عموماً سرھانا شمال کی طرف رکھا جاتا ہے اور مردے کا مُنہ ڈھیلوں وغیرہ کی آڑ لگا کے قبلے کی طرف کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بند کھول دیتے ہیں اور اکثر اعزّہ کو مُنہ کھول کے میّت کی آخری صورت بھی دکھادیا کرتے ہیں۔ اس موقع پر شیعوں کے وہاں تلقین پڑھی جاتی ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی ثقہ اور متقی بزرگ قبر میں اتر کے میّت کا شانہ ہلاتے جاتے ہیں اور ایک عربی عبارت پڑھتے جاتے ہیں، جس میں میّت کی طرف خطاب کرکے بتایا جاتا ہے کہ وہاں نکیرین آکے سوال کریں تو تم یہ جوابات دینا، جس کے سلسلے میں تمام عقائدِ دینیہ کی تعلیم کردی جاتی ہے۔ اِس کے بعد اندرونی حوض پر تختے جمادیے جاتے ہیں۔ اور اگر ان میں دراز یا جھری ہو تو مٹی کے ڈھیلے رکھ رکھ کے اطمینان کرلیتے ہیں کہ مٹی اندر نہ جائے گی۔ قبر میں کافور اور خوشبو تو کفن ہی میں موجود ہوتی ہے، بعض لوگ کیوڑے کی بوتل بھی ڈال دیتے ہیں۔ اور

اس کے بعد اوپر سے مٹّی ڈال کے قبر کا اوپر والا حوض بھر دیا جاتا ہے۔ اور قبر کی صورت بنا دی جاتی ہے۔

مٹّی دینے کو لوگ بڑا اہم اور ضروری کام تصور کرتے ہیں۔ اور جب قبر میں مٹّی ڈالی جانے لگتی ہے تو حاضرین میں سے ہر شخص، عام اس سے کہ کوئی ہو، تین مرتبہ ہاتھ میں مٹّی لے کے قبر میں ڈالتا ہے اور قرآن کی تین آیتیں پڑھتا ہے، جن کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تم کو اس سے (مٹّی سے) پیدا کیا، ہم نے تم کو پھر اسی میں پہنچایا اور ہم پھر آیندہ (روزِ قیامت) تم کو اس سے نکال کے کھڑا کریں گے۔"

بہر حال جب قبر کے تیار ہو جاتی ہے تو اس پر وہی چادر جو جنازے پر پڑی تھی یا پھولوں کی چادر ڈال دی جاتی ہے اور فاتحہ پڑھ کے اور دعاے مغفرت کرکے لوگ واپس آتے ہیں۔

مرنے والے کے گھر میں اُس کی وفات کے دن چولھا نہیں جلتا بلکہ جنازے کے گھر سے نکلنے کے بعد کسی عزیز و قریب کے گھر سے پکّا پکایا کھانا آجاتا ہے، جس کو لوگ دفن سے واپس آکے کھاتے ہیں، اور اُسی وقت تمام مہمان اُس کھانے سے پیٹ بھرتے ہیں۔ تین دن تک معمولاً یہی ہوتا ہے کہ گھر میں کھانا نہیں پکتا۔ یہ طریقہ اصل میں آغازِ اسلام اور خود حضرت رسالت علیہ السلام سے شروع ہوا، جب کہ حضرت جعفرِ طیّار کی شہادت کا حال سن کر اور اُن کے گھر والوں کو روتا پیٹتا دیکھ کر آپ نے کھانا بھجوا دیا تھا۔ مگر لوگوں نے اس شایستہ بنیاد پر جو عمارت یہاں قائم کر لی ہے، وہ نہایت لغو اور شرم ناک ہے۔ کسی کے مرتے ہی، گھر میں جتنا کھانا تیار ہو، پھینک دیا جاتا ہے، گھڑوں مشکوں کا پانی بہا دیا جاتا ہے، اور اس کا سبب عورتیں بچّوں سے یہ بیان کرتی ہیں کہ فرشتۂ موت جس چھُری سے جان لیتا ہے، اس کو کھانے

پینے کی چیزوں میں دھو ڈالتا ہے۔

مرنے کے تیسرے دن اور کبھی مناسب دن دیکھ کے چوتھے روز سوم ہوتا ہے۔ دراصل اس کا آغاز اس سے ہوا کہ یہ دن اس لیے مقرر تھا کہ لوگ آکر مراسم تعزیت ادا کریں اور پسماندوں کی تسلی و تشفی کریں۔ مگر یہ خیال کر کے کہ ایک مجمع کثیر کا خالی بیٹھا رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ جو لوگ آئیں بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ اور دو ایک پارے پڑھ کے ان کا ثواب مرحوم کی روح کو بخشیں۔ چند روز میں تعزیت کا خیال جاتا رہا اور فقط یہ رہ گیا کہ اُس دن کتنے لوگ آئے اور کتنے قرآن مرنے والے کو بخشے گئے۔ ختم صحبت کے وقت پہلے مختلف لوگ قرآن کے چند رکوع اور آخر کی چھوٹی سورتیں پڑھ کر فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ اس میں ایک نیا لغو طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ تھوڑا گھسا ہوا صندل ایک پیالے میں تیل، اور تھوڑے پھول لا کے حاضرین میں سے ہر ایک کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ایک پھول اٹھا کے تیل میں ڈالتا ہے اور وہ صندل اور تیل اور پھول لے جا کے مرحوم کی تربت پر ڈال دیے جاتے ہیں۔

اُسی روز شام کو پہلے بڑی فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ اور گھر میں پہلی بار کھانا پکتا ہے۔ اگرچہ اب غربت نے ہم دردوں کی اس قدر کمی کر دی کہ میّت کے گھر کھانا بھیجنے والے بہت کم رہ گئے ہیں اور اکثر غریب گھر والوں کو اس سے پہلے ہی کھانا پکانے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے، لیکن مروّجہ طریقہ یہی ہے کہ تیجے یعنی سوم سے پہلے باہر ہی کے کھانے پر بسر ہو۔

سوم اور چہلم کی فاتحوں نے عوام میں عجب شان پیدا کر لی ہے۔ اصلیت تو اسی قدر ہے کہ جہاں تک ہو سکے غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے اور اُس کا ثواب مرنے والے کو پہنچا دیا جائے۔ ہندوستان میں ہندوؤں میں مُردوں

کی تیرھویں اور برسی ہوتے دیکھ کے، مسلمانوں کا جی چاہا کہ ہم بھی اسی قسم کے کام نامووری اور دھوم دھام سے کریں۔ اِس شوق کے تقاضے نے تیجے، دسویں، بیسویں، چہلم، اور دیسے کے نام سے غمی کی تقریبیں پیدا کر دیں۔ جن میں ہوتا وہی ایصالِ ثواب ہے مگر دکھانے، نام پیدا کرنے اور برادری کو کھانا دینے کی شان سے۔ پھر اُس پر قیامت یہ ہوئی کہ عوام میں یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ ان ہمارے مروّجہ فاتحوں میں جو کچھ دیا جاتا ہے، وہ خدا کے حکم سے بعینہٖ مُردے کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ اِس عقیدے نے فاتحوں میں یہ شان پیدا کر دی کہ گویا مُردے کی دعوت کی جاتی ہے۔ وہ کھانے زیادہ اہتمام سے دیے جاتے ہیں جو مرحوم کو مرغوب تھے۔ حالانکہ خیرات کا اصول یہ چاہتا ہے کہ جس غریب کو کھلایا جائے اُس کی پسند کا لحاظ رکھا جائے تاکہ اُس کے خوش کرنے سے ثواب میں ترقی ہو۔

اِسی قدر نہیں، فاتحوں میں تو اب یہ ہوتا ہے کہ چار چار یا پانچ پانچ جوڑ کھانے کے نکال کے ایک پاک و صاف مقام پر ترتیب سے چُنے جاتے ہیں۔ آبخورے میں پانی بھی لا کے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کھانے میں مُردے کو پانی پینے کی بھی ضرورت ہوگی۔ پھر اس کے لیے کپڑوں کے نئے اور حتّی الامکان نفیس و قیمتی کپڑے، اوڑھنا بچھونا، جانماز، نئی قلعی کیے ہوئے تانبے کے برتن، لوٹا، کٹورا، پتیلی وغیرہ بھی کھانے کے برابر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اور جب یہ سب سامان تیار ہو جاتا ہے تو کوئی مُلّا آ کے فاتحہ کرتا یعنی قرآن کی چند مخصوص آیتیں اور چھوٹی سورتیں پڑھ کر دُعا کرتا ہے کہ خداوندا! ان چیزوں کا ثواب فلاں شخص کو پہنچا۔ اِس طریقے سے عوام کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں مُردے کو پہنچ گئیں اور وہ سب کھانے اور چیزیں کسی محتاج یا دین دار مسلمان کے گھر پہنچا دی جاتی ہیں۔

اِن چیزوں سے خود مرحوم کے متمتّع ہونے کے خیال نے دلوں میں یہاں تک

رسوخ پیدا کرلیا ہے کہ بعض ادنا طبقے کی جاہل عورتیں فاتحے کی چیزوں کے پاس بن سنور کے خود بھی بیٹھ جاتی ہیں کہ مرحوم شوہران کھانوں اور کپڑوں سے لطف اُٹھائے گا تو خود اُن کے حُسن و جمال کی لذّت سے کیوں محروم رہ جائے۔

فاتحوں میں کھانا، فاتحے کی ضرورت سے بہت زیادہ پکوایا جاتا ہے، جو حسبِ توفیق اعزّہ و احباب میں، جن سے حصّہ داری ہے، تقسیم ہوتا ہے۔ اور تمام گھر کے برجیوں، دھوبی، نائی، حلال خور، وغیرہ کو دیا جاتا ہے، جنھوں نے فاتحوں کے، شان دار تقریبیں بن جانی کی وجہ سے اپنے حقوق پیدا کر لیے ہیں۔

گوکہ ہم نے یہ سب کارروائیاں فاتحہ سوم کے ضمن میں بیان کردی ہیں، لیکن ان کی تعمیل زیادہ اہمیّت کے ساتھ چہلم میں ہوتی ہے۔ جو کہنے کو تو مرنے کے چالیسویں دن مگر از روئے عمل درآمد چالیس سے دو چار روز کم زمانے میں ہوا کرتا ہے۔ اور فاتحے دسویں، بیسویں کے بھی گو امتیاز سے ہوتے ہیں اور ہر جمعرات کا دن خاندان کے بزرگوں کے فاتحے کے لیے مقرر ہو گیا ہے، مگر علی العموم سوم اور چہلم کے فاتحے غیر معمولی اہتمام سے ہوتے ہیں۔ اور حضراتِ امامیہ کے وہاں ہر غمی کے فاتحے میں لزوم کے ساتھ مجلسِ عزائے آلِ عبا علیہم السلام بھی ہوتی ہے۔

غمی کی تقریبوں کے خصوصیات ہم نے بیان کردیے۔ اب رہا محفلوں کی نشست کا طریقہ، وہ وہی ہے جو دوسری تقریبوں میں عرض کر دیا گیا۔ یہ خوشی اور غمی کی وہ تقریبیں تھیں جو اخلاقی و معاشرتی طریقے سے مروّج ہیں۔ مذہب نے جن محفلوں کو رواج دیا ہے، اُن کو ہم آیندہ بیان کریں گے۔

(۴۹)

آدابِ صحبت میں دسویں چیز مذہبی صحبتیں یعنی عزا داری کی مجلسیں اور مولد شریف کی محفلیں ہیں۔ مجلسوں کا عام رواج شیعوں میں ہے۔ اور مولد شریف کا

سُنیّوں میں۔ اگرچہ دونوں میں دونوں فریقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی بعض محبِّ اہلِ بیت سُنّی، مجلسِ عزا کرتے ہیں اور شیعہ حضرات کے یہاں مولد شریف کی محفل ہوتی ہے، مگر لکھنؤ کی خاص چیز جس نے لکھنؤ کی سوسائٹی پر اثر ڈالا اور نیز سوسائٹی اُس سے متاثر ہوئی، وہ مجلسیں ہیں۔ مولد کی محفلوں میں کوئی خصوصیت نہیں، جیسی سارے ہندوستان میں ہوا کرتی ہیں یہاں بھی ہوتی ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ بعض اُمرا کے یہاں مولد میں بھی قریب قریب وہی شائستگی و تہذیب نظر آتی ہے جو شیعوں کی شائستگی کی وجہ سے مجالس میں ہوا کرتی ہے۔

عزاداری کی مجلسیں بہت کثرت سے ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی شخص چاہے اور بیا لگاتار ہے تو سال بھر بغیر محنت مزدوری کے محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے اور فقط فیّاض و عقیدت مند شیعوں کی فیّاضی پر جی سکتا ہے۔ مجالس ہی کی برکت سے مختلف قسم کے ذاکر پیدا ہو گئے جو جدا جدا عنوانوں سے مصائبِ سیّد الشہدا علیہ السلام کو بیان کر کے روتے رُلاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے علما و مجتہدین کا بیان ہے۔ اِن کے بعد حدیث خواں ہیں جو احادیث کو سنا کر ایسی پُر درد اور سوز و گداز کی آواز میں فضائلِ ائمۂ اطہار و مصائبِ آلِ رسول بیان کرتے ہیں کہ سامعین بے اختیار رونے لگتے ہیں۔ اور کیسا ہی سنگ دل ہو ضبطِ گریہ نہیں کر سکتا۔ اِنھی سے ملتے جلتے واقعہ خواں ہیں جو واقعاتِ مصائبِ اہلِ بیت کو ایسے الفاظ اور ایسی فصیح و بلیغ عبارت میں سناتے ہیں کہ جی چاہتا ہے سنتے رہیے اور روتے جائیے۔ واقعہ خوانی کی فصاحت نے دراصل داستان گوئی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ ان کے بعد مرثیہ خواں یا تحت اللفظ خواں ہیں، جو مرثیوں کو شاعرانہ انداز سے سناتے ہیں۔ مگر اس سادگی کے سنانے میں بھی چشم و ابرو اور ہاتھ پانو کے حرکات و سکنات سے واقعات کی ایسی سچی اور مکمل تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ سامعین کو اگر رقت سے فرصت ملی تو

داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی مرثیہ خوانی کی ضرورت و قدر نے میر انیس اور مرزا دبیر پیدا کیے، جو کمالِ شاعری کے اعلاترین شہ نشین پر پہنچ گئے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ یا لکھنؤ کے کمالِ مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوا لیا کہ عالمِ شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصنافِ سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ قدر دانی نے بیسیوں مرثیہ گو اور صدہا مرثیہ خواں پیدا کر دیے جو محرم اور دیگر ایّامِ عزاداری میں لکھنؤ سے نکل کے ہندوستان کے بلادِ دُور و دراز میں پھیل جاتے ہیں اور وہاں کی صحبتوں میں اپنے کمالات کا سکہ بٹھا کے واپس آتے ہیں۔ مرثیہ خوانوں کے بعد سوز خواں ہیں۔ یہ لوگ نوحوں اور مرثیوں کو اصولِ موسیقی کی پابندی میں گا کے سناتے ہیں۔ ان میں علی العموم تین آدمیوں کا گروہ ہوتا ہے۔ دو سُر دیتے ہیں جو بازو کہلاتے ہیں اور تیسرا شخص جو بیچ میں بیٹھتا ہے، سوز سناتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی اصولِ موسیقی کے برتنے اور راگوں اور دھنوں کے ادا کرنے میں اس درجے ترقی کی ہے کہ گویّوں کو پیچھے ڈال دیا۔ اور لکھنؤ میں بہت سے اس پایے کے سوز خواں پیدا ہوئے کہ بڑے بڑے اُستاد گویّے اُن کے آگے کان پکڑنے لگے۔ بہرحال جو درجۂ کمال مرثیہ گویوں نے شاعری میں حاصل کیا، وہی سوز خوانوں نے موسیقی میں۔

یہ سب فن محض مجالسِ عزا کی برکت سے پیدا ہوئے اور خاص لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اور اِن سب نے علاوہ ادبِ اردو کو بے انتہا ترقی دینے کے، نظم و نثرِ اردو کی دنیا میں یہ خاص شان پیدا کر دی کہ انسانی جذبات کو جس طرح چاہیں، حرکت میں لائیں۔ اور جس قسم کے جذبات اور جیسے جوش کو چاہیں، پیدا کر دیں۔ اس فن کو باضابطہ طور پر یونانیوں نے ترقی دی تھی، جنھوں نے اپنی تقریروں کو موثر بنانے کے لیے پتا لگایا تھا کہ کن الفاظ، کن حرکات، کیسے لہجے اور کن آوازوں سے انسان کے دل میں خوشی یا غم یا رحم یا قہر و غضب کا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد کبھی اس فن کی طرف کسی قوم نے توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ اب یورپ کے آرٹیروں اور اسپیکروں نے

اس فن کو زندہ کرنا شروع کیا۔ مگر لکھنؤ میں محض ذاکری کے طفیل میں اس فن کو خود بہ خود اس قدر ترقی ہوگئی کہ یورپ والے بھی شاید اس درجے سے آگے نہ بڑھ سکے ہوں گے۔

مجلسوں میں ختم کے وقت شربت پلانا یا مٹھائی یا کھانا تقسیم کرنا لازم ہے۔ مگر مہذب اور دولت مند لوگوں نے اب یہ نہایت ہی شایستہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ جن حضرات کو بُلانا ہوتا ہے، اُن کے پاس دعوت کے رقعوں کے ساتھ حصّہ بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ مجلس سے واپس آتے وقت ہاتھ میں حصّہ لے کے چلنا بہت سے مہذب اور خوش حال لوگوں کو تہذیب کے خلاف اور نہایت مبتذل معلوم ہوتا تھا۔ گو کہ عوام اور بازاری لوگ اس میں مضائقہ نہیں سمجھتے مگر خوش حال اور وضع دار لوگوں کو یہ گراں گزرتا تھا۔ اگر خدمت گار موجود نہ ہو تو بہت سے لوگوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ مجلس ہی میں کسی دوست یا غریب آدمی کو اپنا حصّہ دے دیں۔

مجلس کی نشست کی شان یہ ہے کہ لکڑی کا ایک منبر جس میں سات آٹھ زینے ہوتے ہیں، دالان یا کمرے کے ایک جانب رکھا ہوتا ہے اور لوگ چاروں طرف دیوار کے برابر پُر تکلّف فرش پر بیٹھتے ہیں۔ اور اگر مجمع زیادہ ہوا تو بیچ کی جگہ بھی بھر جاتی ہے۔ جب کافی آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو ذاکر صاحب منبر پر رونق افروز ہو کر، پہلے ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں: فاتحہ۔ ساتھ ہی تمام حاضرین ہاتھ اُٹھا کے چپکے چپکے سورۂ فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اگر حدیث خواں یا واقعہ خواں ہوئے تو کتاب کھول کے بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور اگر مرثیہ خواں ہوئے تو مرثیے کے اوراق ہاتھ میں لے کے مرثیہ سنانے لگتے ہیں۔ مجتہدوں اور حدیث خوانوں کے بیان کو لوگ خاموشی و ادب سے سنتے اور رقّت کے موقعوں پر زار و قطار روتے ہیں۔ مگر مرثیوں کے سنتے وقت مجمع حاضرین سے بجز رقّت کے بندوں کے جب کہ رونے سے فرصت نہیں ملتی برابر صدائے آفرین و مرحبا بلند ہوتی رہتی ہے۔

سوز خواں منبر پر نہیں بیٹھتے بلکہ لوگوں کے بیچ میں ایک جانب بیٹھ کے نوحے اور مرثیے سناتے ہیں اور اکثر داد بھی پاتے ہیں۔

اکثر مجلسوں میں مختلف ذاکر یکے بعد دیگرے پڑھتے ہیں۔ اور عموماً حدیث خوانی کے بعد مرثیہ خوانی اور اس کے بعد سوز خوانی ہوتی ہے۔ سوز خوانی چونکہ دراصل گانا ہے، اس لیے اس کا رواج اگرچہ لکھنؤ ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں کثرت سے ہو گیا ہے؛ مگر مجتہدین اور ثقہ اور پابندِ شرع بزرگوں کی مجلسوں میں سوز خوانی نہیں ہوتی۔ مجتہدین کے وہاں کی مجلسوں میں پابندیِ دین کا بہت خیال رہتا ہے۔ خصوصاً یہاں غفراں مآب کے امام باڑے میں نویں محرم کو جو مجلس ہوتی ہے، وہ خاص شان اور امتیاز رکھتی ہے اور اس کی شرکت کے شوق میں لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اس میں اثنائے بیان میں اونٹ حاضرین کے سامنے لائے جاتے ہیں جن پر کجاوے یا محملیں ہوتی ہیں اور ان پر سیاہ پوششیں پڑی ہوتی ہیں۔ اور مومنین کو یہ منظر نظر آجاتا ہے کہ دشتِ کربلا میں اہلِ بیت کا لوٹا مارا اور تباہ شدہ قافلہ کس مظلومی و ستم زدگی کی شان سے شام کی طرف چلا جاتا تھا۔ حاضرین پر اس الم ناک منظر کا ایسا اثر پڑتا ہے کہ ہزارہا حاضرین سے دس بیس کو غش ضرور آجاتا ہے، جو بڑی مشکلوں سے اٹھا کر اپنے گھروں کو پہنچائے جاتے ہیں۔

خاندانِ اجتہاد سے مجالس میں اس ڈریمٹیک شان کی ابتدا ہونے کا یہ انجام ہوا کہ اکثر عقیدت مند امراجدّت طرازیاں کرنے لگے۔ اور بعض بزرگوں نے تو یہاں تک ترقی کی کہ مجلسوں کو بالکل ڈراما بنا دیا۔ چنانچہ مولوی مہدی حسین صاحب مرحوم کے یہاں مجلسوں میں وقتاً فوقتاً تھیٹر کے ایسے پردے کھلتے جن کے ذریعے سے واقعاتِ کربلا کے پُرالم سین پیشِ نظر کر دیے جاتے اور حاضرین پر عجب رقّت کا عالم طاری ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ ترقی مرحوم کے یہاں زنانی مجلسوں میں ہوئی، جن میں شہر کی ہزاروں عورتیں جمع ہو جاتیں۔ اور بجائے اس کے کہ ذاکرہ حدیث خوانی کریں، اسٹیج

پر کربلا کے سین زندہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ذریعے سے دکھائے جاتے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، علما و مجتہدین نے اِن بدعات کو پسند نہیں کیا، مگر عوام الناس کی دلچسپی ان میں روز بہ روز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی مجلسوں نے لکھنؤ کی معاشرت پر بہت نمایاں اثر ڈالا ہے۔ اور ان کے ذریعے سے آدابِ صحبت اور تہذیب و شائستگی کو بہت زیادہ ترقی ہوگئی ہے۔ اور مرثیوں کے ذوق نے شاعری و موسیقی کو زندہ ہی نہیں کر دیا بلکہ ان دونوں فنوں کا سچا مذاق مردوں سے تجاوز کر کے پردہ نشین شریف خاتونوں تک میں پیدا کر دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز یورپ کے سوا جہاں رقص و سرود لڑکیوں کی تعلیم میں داخل ہے، ایشیا کے کسی شہر میں نہ پیدا ہو سکی گی۔

مجلسوں کے علاوہ ایک اور طرح کی محفلیں بھی شیعوں میں ہوتی ہیں جو "صحبت" کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ ان کا زمانہ ۹۔ ربیع الاوّل یعنی عیدِ شجاع کے دن سے شروع ہو کر، چند روز تک باقی رہتا ہے۔ مجالسِ عزا جس طرح اہلِ بیت کے مصائب پر رونے اور آنسو بہانے کے لیے ہیں، اسی طرح یہ صحبتیں اس غرض سے کی جاتی ہیں کہ ڈریمٹک طریقے سے دشمنانِ اہلِ بیت کی توہین و تذلیل کی جائے اور اُن کو بے تکان گالیاں دی جائیں۔ اور چونکہ شیعوں کے خیال میں اہلِ بیت کے سب سے بڑے دشمن امّ المومنین عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رض تھے، اس لیے انھی دونوں محترم ناموں کی توہین کرنا اور اُن کے پتلے بنا کے ذلّت و نفرت کے ساتھ جلانا، اِن صحبتوں کا مقصودِ اصلی ہو گیا ہے۔ ان میں کسی سُنّی کے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اِس لیے کہ وہ اپنے مقتداؤں کی توہین کو گوارا نہیں کر سکتے۔ مگر سُنا جاتا ہے کہ یہ نہایت ہی بدتہذیبی و فحاشی کی شرم ناک محفلیں ہوتی ہیں، جن میں ابتذال اِس درجے تک ترقی کر جاتا ہے کہ کوئی مہذب شیعہ بھی بغیر روحی تکلیف اٹھائے واپس

نہیں آسکتا۔ ان صحبتوں نے بھی شیعوں کے مذاق پر بڑا اثر ڈالا ہے اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر سُنّی شیعوں میں لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔

شیعوں کی ان مجلسوں اور صحبتوں کے بعد سُنّیوں کی مجالس مولد شریف ہیں۔ ان کی نشست اور شان وہی ہوتی ہے جو مجلسوں کی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سُنّیوں کے یہاں منبر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ممتاز جگہ پر کوئی چوکی بچھا دی جاتی ہے، اس پر پُرتکلّف کا فرش کر دیا جاتا ہے، اور اُس پر بیٹھ کے واعظ یا مولد خوان صاحب مولد سناتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ کوئی مولوی صاحب حالاتِ ولادتِ سرورِ عالم بیان کر دیتے اور ذکرِ ولادت کے وقت سب لوگ کھڑے ہو جاتے۔ مولد خوان صاحب مسرّتِ ولادت میں کوئی نظم پڑھتے اور لوگوں پر گلاب پاش سے کیوڑا چھڑکا جاتا۔ یا کوئی واعظ نہ ملتا تو کوئی پڑھا لکھا آدمی مولوی غلام امام شہید کا مولد شریف پڑھ کے سنا دیتا۔ مگر عوام کے لیے مولد خوانی کا یہ طریقہ اطمینان بخش نہ ثابت ہوا۔ اور سوز خوانوں کی دیکھا دیکھی ایسے مولد خوان پیدا ہو گئے جن کے ساتھ دو شر ملانے والے ہوتے ہیں اور اُن کے بیچ میں وہ بیٹھ کر ترنّم کے خاص لہجے میں واقعاتِ ولادت بیان کرتے ہیں اور درمیان درمیان میں برابر اشعار و قصائد گاتے جاتے ہیں جن میں دونوں بازو ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر سوز خوانوں نے تو موسیقی کو زندہ کر دیا اور مولد خوان گانے والوں نے سچ یہ ہے کہ موسیقی کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

لیکن مولد خوانی کے اعتبار سے لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہیں حاصل ہے۔ اس لیے کہ اسی طرز سے اور اسی شان کی مولد خوانی سارے ہندوستان کے سُنّیوں میں جاری ہے۔ اور یہی حال سُنّی صوفیوں کی صحبتِ حال و قال کا ہے، جو ہر جگہ یکساں ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے زمانے ہی سے مجلسِ سماع کی بنیاد پڑ گئی۔ مگر اس سے سوا اس کے کہ قوّالوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، جو رتبے اور موسیقی دانی میں ڈھاڑیوں اور گویّوں سے گرا ہوا سمجھا جاتا ہے، فنِ موسیقی کو کوئی نمایاں نفع نہیں

حاصل ہوسکا۔ حالانکہ سوز خوانی نے ایک صدی کے اندر ہی موسیقی کو اپنی لونڈی بنالیا اور حاکمانہ شان سے اُس پر تصرّف کرنے لگی۔

(۵۰)

مجلسوں اور محفلوں کا حال ہم بیان کر چکے۔ اب ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم لوازمِ صحبت کو بھی شرح وبسط سے بتا دیں۔ اس لیے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے معاشرت اور وضعِ صحبت کا حال آئینے کی طرح روشن ہوجاتا ہے۔ لوازمِ صحبت بہت زیادہ بلکہ بے شمار ہیں، جن کو ہم وقتاً فوقتاً بتائیں گے۔ مگر فی الحال سب سے مقدّم چیزیں حقّہ، خاصدان، اُگلدان، اور اگالدان ہیں۔ یہ اس قدر ضروری اشیا ہیں کہ رؤسا کے ہمراہی خدمت گاروں کے پاس لازمی طور پر موجود رہا کرتی ہیں۔ چند روز پیشتر اعلا طبقے کے دولت مندوں کے ہمراہ ایک خدمت گار کے ہاتھ میں حقّہ بھی رہا کرتا تھا مگر اب یہ طریقہ چھوٹ گیا۔ حقّہ دراصل دہلی کی ایجاد ہے۔ اور وہیں شاہی بھنڈاری خانوں میں مختلف وضعوں کے حقّے تیار ہوگئے تھے۔ لکھنؤ نے جو کچھ ترقی کی وہ سب سے پہلے پیچوانوں، چلموں، اور چمبروں کی شکل اور قطع کی اصلاح سے متعلق ہے۔ دہلی کے حقّے بھدّے اور بدصورت تھے۔ لکھنؤ میں نہایت موزون و خوش نما بنا دیے گئے۔ پھر تانبے، پیتل، پھول اور جست کے حقّوں کے علاوہ مٹّی کے حقّے ایسے خوش نما بن گئے جو لوگوں کو اپنی نفاست و نزاکت کے لحاظ سے نہایت ہی پسند آئے۔ اور اکثر لوگوں کو مٹّی کے نازک، سبک، خوش نما، اور سوندھے حقّے، پُرتکلّف قیمتی حقّوں سے زیادہ اچھے معلوم ہوئے۔

حقّوں کی شکل میں اصلاح و ترقی ہونے کے بعد، خود تمباکو میں عجیب عجیب لطافتیں اور خوبیاں پیدا کی گئیں۔ تمباکو کو گڑ یا شیرے میں ملا کے کوٹ لینا غالباً دہلی ہی کی ایجاد ہے، جس کی وجہ سے پینے کے تمباکو کی اصلاح میں ہندوستان کو

دنیا کے سارے ملکوں اور صفحۂ زمین کی تمام قوموں پر فوقیت حاصل ہے۔ تمباکو ساری دنیا میں پیا جاتا ہے۔ چرٹ، سگرٹ اور پائپ کے لیے تمباکو کی اصلاح میں اگرچہ یورپ نے بے انتہا کوششیں کیں اور طرح طرح کی نفاستیں پیدا کردیں مگر یہ تدبیر کسی کو نہ سوجھ سکی کہ شیرہ یا گڑ ملا کے تمباکو کی تلخی اور گلو گیری مٹائی جائے اور دھوئیں میں لطف اور قوام پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد لکھنؤ نے یہ ترقی کی کہ خمیرہ ملا کے اور خوشبوئیں شریک کر کے تمباکو سی بدبودار ناگوار چیز کو اس قدر خوش آیند اور لطیف بنا لیا کہ چلم بھر کے رکھتے ہی سارا کمرا خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔ اور جو حقّہ نہ پیتے ہوں، ان کا بھی جی چاہنے لگتا ہے کہ دو ایک کش کھینچ لیں۔ ہندوستان کے بعض خطّوں کا تمباکو بہت اچھا ہوتا ہے اور ان شہروں کے نام سے تمباکو مشہور بھی ہو گیا ہے، مگر وہ شہرت کسی انسانی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ کوشش اور تدبیر سے جو نفاست تمباکو میں لکھنؤ نے پیدا کی ہے، اور کسی شہر کو نہیں نصیب ہوئی۔ اکثر شہروں کے لوگ خمیرے کو نہیں پسند کرتے، یا شاکی ہیں کہ اس سے نزلہ ہو جاتا ہے، مگر یہ محض ان کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے ہے، اور ویسا ہی ہے جیسے انگریزوں کو قورما ناپسند ہے، یا اسے ہضم نہیں کر سکتے۔ تمباکو کے ساتھ حقّے کے تمام لوازم میں ترقی ہوئی۔ چلمیں بھی پہلے سے زیادہ نازک و نفیس اور خوش نما ہو گئیں۔ چمبروں میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ چمبروں میں خوبصورت تہری نقرئی زنجیریں لگائی گئیں۔ طرح طرح کی منہنالیں ایجاد ہوئیں، پھر پھولوں کے نفیس اور دل فریب حقّے ایجاد ہوئے۔ غرض یہاں کی سوسائٹی نے حقّے کو سنوار کے اور آراستہ کر کے دلھن بنا دیا۔

حقّے کے بعد نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیز لوازم صحبت میں خاصدان ہے۔ جس کی بار بار ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ اور باہر آنے جانے میں خدمت گاروں کے پاس رہتا ہے۔ خاصدان وہ چیز ہے جس میں پانوں کی گلوریاں بنا کے رکھی جاتی

ہیں۔ پان، ہندوستان کی قدیم چیز ہے۔ ہندوؤں کے زمانے سے اس کی اہمیت چلی آتی ہے۔ اگلے دنوں راجاؤں اور بادشاہوں کو جب کوئی بڑی مہم پیش آتی یا کوئی ذمے داری کا کام لینا ہوتا تو پان کا بیڑا (گلوری) بنا کے سامنے رکھتے اور کہتے کہ کون اسے اٹھائے گا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس مہم پر کون جائے گا؟ یا اس ذمّے داری کے کام کو کون انجام دے گا؟ ارکانِ دولت، سرداروں یا عام حاضرینِ دربار میں سے جو کوئی اُس بیڑے کو اٹھا لیتا وہ گویا وعدہ کرتا کہ اس کام کو میں انجام دوں گا، یا اس مہم کو میں سر کروں گا۔ یہ رسم تو مٹ گئی مگر یہ کہاوت آج تک زبانوں پر موجود ہے کہ "فلاں شخص نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے" یعنی اس کو اپنے ذمّے لیا ہے۔

پُرانے درباروں میں حاضرین کو انعام واکرام کے ساتھ پان بھی مرحمت ہوا کرتے۔ جس کا ذکر ابنِ بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پان، ہندوستان کی تاریخی چیز ہے۔ لہٰذا چاہیے تھا کہ مرورِ زمانہ سے پانوں اور پان کے سامان کو یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی۔ مگر ہمیں بالکل نہیں نظر آتا کہ پان جب تک دہلی میں تھا، اس کو کیا ترقی ہوئی۔ اس کے مسالے کے جو اجزا قدیم الایّام سے چلے آتے ہیں، آخر تک وہی قائم رہے، اور اُن کی بھی کسی قسم کی اصلاح نہیں ہوئی۔ اِس کے مسالوں میں کتھا، چونا، ڈلیاں اور الائچیاں قدیم زمانے ہی میں منتخب ہو چکی تھیں۔ تمباکو بھی لکھنؤ میں آنے سے پہلے ہی اس کے اجزا میں شامل ہو چکا تھا۔ مگر اس کا بالکل پتا نہیں لگتا کہ اگلی بیسوں صدیوں اور سیکڑوں گذشتہ درباروں اور سلطنتوں نے اس کو کون سی خاص ترقی دی۔ لکھنؤ میں پان کا رواج دہلی کی بہ نسبت بہت زیادہ ہو گیا۔ اس کے لیے خاص قسم کے ظروف ایجاد ہوئے۔ اور اس کی تمام چیزوں کو جدا جدا ترقی حاصل ہوئی۔ پہلے تو خود پانوں یعنی اس کے پتّوں کی اصلاح ہوئی۔ ہندوستان کے بعض شہروں مثلاً مہوبے وغیرہ کے پان قدرتی طور پر بہت اچھے اور اعلا درجے کے ہوتے ہیں۔ اطرافِ لکھنؤ میں

اگرچہ پان کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، مگر ان میں بالذات کوئی خاص خوبی و فوقیت نہیں ہوتی۔ مگر یہاں کے ترقی پسند اُمرا کی توجہ سے تمبولیوں (پان والوں) نے صنعتی اصول پر پانوں کو ترقی دینا شروع کی اور اس درجے پر پہنچا دیا کہ یہاں کے پان سب جگہ سے بڑھ گئے۔ وہ پانوں کو مہینوں زمین میں دفن کر کے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کا کچّا پن دور ہو جاتا ہے، ہرائند بالکل نہیں باقی رہتی ہے، رگیں نازک اور نرم ہو جاتی ہیں، رنگ میں سفیدی اور پختگی آجاتی ہے۔ کچّے پان میں جو ایک طرح کی تیزی ہوتی ہے، وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ اور ایسا نرم اور نازک اور لطیف ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ کا پان مزے اور لطف میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی بنے ہوئے پان، بیگمی پان کہلاتے ہیں، جو دُور دُور کے شہروں میں جاتے اور نہایت ہی شوق اور بڑی قدر سے لیے جاتے ہیں۔

پان کے پتّے کے بعد چونا ہے۔ ہر جگہ اور ہر شہر میں معمولی چونا استعمال ہوتا ہے جو اکثر چھنا ہوا صاف بھی نہیں ہوتا۔ ماسوا اس کے چونا نہایت ہی تیز اور اکّال چیز ہے۔ نیا تازہ چونا ہوا یا زیادہ ہو گیا تو مُنہ کٹ جاتا ہے۔ ان مضرّتوں سے بچنے کے لیے یہاں یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ اُسے خوب چھان کے اور صاف کر کے اِس میں تھوڑی سی بالائی یا تازے دہی کا توڑ چھان کر ملا دیتے ہیں۔ اس طریقے سے لکھنؤ کے نفیس مزاج لوگوں کے پاندانوں میں ایسا اچھّا، خوش گوار، لطیف اور بے ضرر چونا ہوتا ہے کہ اور جگہ نہیں نصیب ہو سکتا۔

دوسری چیز پان کے لوازم میں سے کتھّا ہے۔ کتھّا بجائے خود نہایت ہی بکٹھی، کڑوی اور بدمزہ چیز ہے۔ پان میں وہ فقط چونے کی اصلاح اور اچھّا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کا بکٹھاپن بہت ناگوار گزرتا ہے، جو عادت ہو جانے سے چاہے گوارا ہو جائے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بدمزہ چیز ہے۔ کتھّے کے بنانے کی یہ تدبیر تو سب جگہ عام ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

کرکے اُسے پانی میں پکاتے ہیں اور جب جوش کھا کر وہ سرخ شربت سا ہو جاتا ہے، تو کپڑے میں چھان کر پانی میں رکھ کے جما لیتے ہیں۔ عام طور پر سب جگہ اتنا ہی ہوتا ہے۔ مگر یہاں ایک طباق یا توے میں راکھ بھر کے، اُس پر ایک کپڑا اڑھا لیتے ہیں اور اور اُس کپڑے پر اس جمے ہوئے کتھے کو روٹی کی طرح پھیلا دیتے ہیں اور اس پر بار بار پانی چھڑکتے جاتے ہیں۔ پانی اُس کی سرخی کو لے کر جس میں بکٹھا پن ہوتا ہے، راکھ میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس طرح صاف کرتے کرتے کتھے کا فقط وہ لطیف ترین حصّہ باقی رہ جاتا ہے جو دھوئے کپڑے کا سا سفید اور نہایت ہی نفیس ہوتا ہے۔ پھر اُس میں کیوڑے کی خوشبو دے کر یا کیوڑے کے پھولوں میں رکھ کر خشک کر لیتے ہیں۔ اس تدبیر پر بعض اور مقامات میں بھی اب عمل ہونے لگا ہے، مگر یہ ایجاد لکھنؤ ہی کی ہے۔ اور جس تکمیل کے ساتھ یہاں اس پر عمل ہوتا ہے اور کہیں ہو بھی نہیں سکتا۔ اب اس قسم کا کتھا اکثر تاجر لکھنؤ میں تیار کر کے فروخت بھی کرنے لگے ہیں، جن میں سے ہمارے مکرم مہربان قاضی محمد یونس صاحب مقیم محمود نگر لکھنؤ نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ مگر نفاست پسند اُمرا کے گھروں میں جو سفید اچھا اور صاف کتھا خود ہی بنا لیا جاتا ہے وہ اس قدر نفیس ہوتا ہے کہ اس کی نفاست کو بازار والوں کا تیار کیا ہوا کتھا، چاہے کیسا ہی اچھا ہو، نہیں پہنچ سکتا۔ دکن کے شہروں پونا وغیرہ میں ایک نئی طرح کا بنا ہوا خشک کتھا بازار میں ملتا ہے جو سوکھا ہی پان میں ڈالا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کو وہ کتھا پسند بھی ہے مگر ہم باوجود کوشش کے اس کی خوبیوں کو نہ محسوس کر سکے اور نہ سمجھ سکے؛ اس لیے کہ بظاہر وہ کرکرا بھی ہوا کرتا ہے اور بکٹھا پن اُس میں اصلی بے بنے کتھے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

پان کے مسالوں میں تیسری چیز ڈلیاں ہیں، جو سروتے سے کاٹ کے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پان میں ڈالی جاتی ہیں۔ ان کا کاٹنا ایک معمولی چیز تھا مگر لکھنؤ میں

ڈلیوں کا کاٹنا بھی ایک صنعت بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اب اکثر خاتونیں باجرے کے دانوں کے برابر باریک کاٹتی ہیں، جس میں سب دانے برابر اور یکساں ہوتے ہیں۔ اور پھر اس شرط کے ساتھ کہ چورا زیادہ نہ نکلے اور ڈلی کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے۔

الائچیوں میں کسی اصلاح کی گنجائش ابھی تک محسوس نہیں ہوئی اس لیے کہ جیسی آتی ہیں ویسی ہی استعمال ہوتی ہیں۔ مگر تکلفات نے اتنا ضرور کیا ہے کہ خاص تقریبوں میں اور خاص موقعوں پر ان میں چاندی کا ورق لگا دیا جاتا ہے۔ اور جب خاصدان یا تھالی میں رکھی جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے چمکتے ہوئے ٹکڑے رکھے ہیں۔

اس کے بعد تمباکو ہے۔ تمباکو کا استعمال دھوئیں کی صورت میں جس طرح عالم گیر ہے، اسی طرح کھانے میں بھی اس کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ انگلستان میں میں نے بہت سے انگریزوں کو دیکھا جو تمباکو کی خشک پتی مل کر پھانک لیا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی مدت سے خشک تمباکو کے کھانے کا رواج چلا آتا ہے۔ جس کو دہلی میں اس کی سنہری رنگت کے لحاظ سے زردہ کہتے ہیں۔ پہلے فقط غیر مدبّر اور غیر اصلاح شدہ پتی کو پان میں ڈال کر کھایا کرتے تھے۔ مگر اگلے ہی دنوں یہ بھی رواج تھا کہ بہت سے گھروں میں تمباکو کی پتی میں اس کے ڈنٹھلوں کو اُبال کر اور اس کے عرق میں چند اعتدال پر لانے والے خوشبودار مسالے ملا کر تمباکو کی کڑواہٹ اپنے مذاق کے مطابق گھٹا یا بڑھا دی جاتی اور لطافت و خوشگواری کے ساتھ اس میں ایک جاں فزا خوشبو بھی پیدا کر دی جاتی۔ مگر یہ تدبیر مخصوص گھروں اور خاندانوں تک محدود تھی، عام لوگ تمباکو کی پتّی ہی بغیر بنائے کھاتے، جو ہر پاندان میں موجود رہا کرتی۔ لیکن اب تقریباً بیس برس ہوئے منشی سید احمد حسین صاحب نے اپنی ایجاد سے ایک خاص قسم کا بنا ہوا تمباکو جس کی صورت ٹرّے دار باروت کی سی ہوتی ہے، ملک کے سامنے پیش کیا۔ اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ چند ہی سال کے اندر بے بنی

پتّی کے کھانے کا رواج قریب قریب اُٹھ گیا۔

(۵۱)

تمباکو میں پتّی کی اصلاح سے پہلے، جس کا سہرا ہمارے مکرم دوست منشی سید احمد حسین صاحب کے سر ہے، اصلاح کی ایک اور کامیاب کوشش کی گئی۔ وہ یہ کہ تمباکو کی پتّی اور ڈنٹھلوں کو خوب اچھی طرح اُبال کر، اس کا عرق نکال لیا جاتا ہے، اور پکاتے پکاتے وہ اس قدر گاڑھا کر دیا جاتا ہے کہ لیئی یا تازی افیون کی سی شکل ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں مُشک، کیوڑا، اور بہت سی مناسب خوشبوئیں ملا کے اس درجہ لطیف و معطّر بنا دیا جاتا ہے کہ پان کے ساتھ رتی برابر قوام کھا لیجیے تو تمباکو کا مزہ آنے کے ساتھ مُنہ میں دن بھر خوشبو آتی رہتی ہے۔ پھر نفاست مزاجی نے اس پر اور زیادہ ترقی کی یعنی اس قوام کی ننھّی ننھّی گولیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور ہر گولی ایک خوراک کی مقدار میں ہوتی ہے۔ پھر گولیوں پر چاندی یا سونے کے ورق لپیٹ کر ایسا خوش نما اور دل فریب بنا دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے موتی رکھے ہوئے ہیں۔ قوام اور گولیوں کو مفتی گنج کی ایک بیگم صاحب بے مثل بناتی تھیں۔ خاص لکھنؤ والوں کو ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی گولیوں کے سوا کسی کارخانے کی گولیاں نہیں پسند تھیں۔ مگر انھی کے زمانے میں اصغر علی محمد علی کے کارخانے نے ان دونوں چیزوں کو تیار کر کے سارے ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا۔ چند روز بعد ان بیگم صاحب کا انتقال ہو گیا اور ہر جگہ اصغر علی کے کارخانے ہی کے قوام اور گولیوں کا رواج ہو گیا۔ بعد ازاں اور بہت سے لوگوں اور متعدد کارخانوں نے ان چیزوں کو اپنے اہتمام سے تیار کیا، مگر ابھی تک کوئی اصغر علی مرحوم کے کارخانے سے سبقت نہیں لے جا سکا۔ لیکن قوام اور گولی میں ایک عیب تھا، وہ یہ کہ چاہے خوشبو دیر تک ٹھہر جائے مگر تمباکو کا مزہ اور اس کا کڑوا پن

پہلی ہی پیک میں جاتا رہتا۔ اِسی عیب کو مٹانے کے لیے منشی سید احمد حسین صاحب نے یہ جدید بدر تیر و معطر ٹکی ایجاد کی جس کی تلخی اور عطریت آخر تک پان کا ساتھ دیے جاتی ہے۔ اور اِسی خوبی کا نتیجہ ہے کہ یکایک دنیا کا رُخ اس طرف پھر گیا۔ اور قوام اور گولیاں گواب بھی تیار کی جاتی ہیں، مگر تقویم پارینہ ہو گئیں۔ اور ان کا مذاق گھٹنے کی یہی رفتار رہی تو امید ہے کہ تھوڑے ہی زمانے میں بالکل مٹ جائیں گی۔

پان ہی کے متعلق یا اُس کی مناسبت سے لکھنؤ میں چند اور ایجادیں ہوئیں مثلاً ایسی الائچیاں ایجاد کی گئیں کہ ایک الائچی کھا لیجیے تو منہ پان سے زیادہ سرخ ہو جائے۔ ان کی تیاری میں اگرچہ پان ہی کے اجزا سے کام لیا جاتا ہے جو رنگ ملا کر الائچی کے چھلکوں میں بھر دیے جاتے ہیں، مگر بجز اس کے کہ رنگ چوکھا آتا ہے، وہ پان کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اور کسی کے پان کھانے کی غرض ان مصنوعی الائچیوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اور قسم کی الائچیاں تیار کی گئیں، جن میں مسّی بھر دی جاتی ہے۔ اور عورتیں بجائے اس کے کہ دیر تک بیٹھ کے مسّی ملیں، اس قسم کی ایک الائچی پان میں ڈال کر کھا لیں تو مسّی خود بخود لگ جاتی ہے۔ اور گہری نیلگونی خوب اچھی طرح ریخوں میں جم کر بیٹھ جاتی ہے۔ مگر ان دونوں قسم کی الائچیوں سے وہ مقصد بخوبی نہ حاصل ہو سکا جس کے لیے ایجاد کی گئی ہیں۔ مثلاً سرخ الائچیاں پان کا بدل نہیں ہو سکتیں اور سیاہ الائچیوں میں عمدہ معطر مسّی کی خوشبو نہیں ہوتی۔ اِس لیے عام پسند اور مقبول نہ ہو سکیں اور آج تک ان سے بجز مذاق اور دل لگی کے کوئی ضروری کام نہیں لیا جا سکتا، جو لازمۂ معاشرت ہو۔

اِسی سلسلے میں ہمیں چکنی ڈلی کو بھی بیان کر دینا چاہیے جو اگر پان کا جزو ملا ینفک نہیں تو اس کے لواحق میں ضرور ہے۔ بعض لوگ معمولی ڈلیوں کے عوض اسے پان میں کھاتے ہیں اور پان میں نہ کھائیں تو بہت سے لوگ اسے تنہا

منہ میں رکھتے ہیں جو الایچی کے ساتھ مل کر بہت لطف دیتی ہے۔ خصوصاً ہندو احباب چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ کی گلوری نہیں کھا سکتے، اس لیے ان کی خاطر و تواضع محض چکنی ڈلی اور الایچی ہی سے ہوتی ہے، لہٰذا وہ بھی معاشرت کا ایک ضروری سامان بن گئی ہے۔

چکنی ڈلی دراصل وہی ڈلی ہے جو پانوں میں ڈالی جاتی ہے مگر مدبّر اور اصلاح شدہ۔ یہ لکھنؤ یا دہلی یا حیدرآباد یا دیگر متمدّن شہروں میں نہیں بنتی بلکہ جہاں پیدا ہوتی ہے، وہیں سے بنی بنائی آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصلی ڈلی کو دودھ میں ڈال کے اُبالتے اور پکاتے ہیں۔ خیر جس طرح بنتی ہو، اس میں ایک لعاب پیدا ہو جاتا ہے۔ خشکی دفع ہو کے ایک دُہنیت آجاتی ہے۔ اور بعض اوقات زیادہ ڈلی کھا جانے سے گلے میں جو پھندا پڑ جاتا ہے، وہ عیب چکنی ڈلی میں بالکل نہیں باقی رہتا۔ اور سچ یہ ہے کہ معمولی ڈلی سے بدرجہا زیادہ بامزہ، لطیف و نفیس ہو جاتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، چکنی ڈلی کا رواج حیدرآباد، دہلی اور دیگر شہروں میں لکھنؤ کے مقابل بہت زیادہ ہے۔ اور انھی مقامات کے شوقینوں کا کام تھا کہ اس میں کسی قسم کی اصلاح کرتے یا اس کو اپنے مذاق میں ترقی دیتے۔ مگر تعجب ہے کہ کسی شہر میں اس جانب توجہ نہ کی گئی۔ اور چکنی ڈلی کی بھی اصلاح کی تو لکھنؤ والوں نے۔ چکنی ڈلی کا اصلی مغز نہایت لطیف خوش مزہ و نازک ہوتا ہے۔ اور جو حصّہ قشر سے ملا رہتا ہے، کسی قدر بکٹھارہ جاتا ہے۔ خصوصاً پیندی کی طرف کا حصّہ بہت زیادہ ناقص ہوتا ہے۔ انھی عیوب کے مٹانے اور ناقص حصّے کے نکال ڈالنے کے خیال سے کانٹ چھانٹ کر معمولی چکنی ڈلیاں کئی قسم کی تیار ہونے لگیں۔ سب سے اوّل تو دورخی کہلاتی ہیں۔ ان کے بننے کی شان یہ ہے کہ نیچے اوپر سے زیادہ تر حصّے کو اور تھوڑے تھوڑے کناروں کو گرد سے

کاٹ کر خوش نما اور خوش رنگ کٹوریاں سی بنادی جاتی ہیں، جن میں فقط وہی نرم ولطیف مغز رہ جاتا ہے جو چکنی ڈلی کا بہترین حصہ ہے۔ دوسرے درجے کی چکنی ڈلیاں یک رخی کہلاتی ہیں۔ ان میں بھی اگرچہ چاروں طرف سے تھوڑی بہت کاٹ چھانٹ ہوتی ہے، مگر نیچے اوپر کے دونوں ناقص حصوں میں سے ایک طرف کا زیادہ تر حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ چکنی ڈلی کے مغز کے خوش نما ہشت پہل ٹکڑے بنا دیے جاتے ہیں۔ اس کاٹ چھانٹ میں جو چورا نکلتا ہے، وہ جداگانہ فروخت ہوتا ہے۔ اور دراصل لکھنؤ میں وہ مدبر چکنی ڈلی کی پانچویں قسم بن گیا ہے۔ پھر اس کی بھی دو تین قسمیں ہوگئی ہیں۔ اس لیے کہ دورخی اور یک رخی ڈلیوں میں سے جو چورا نکلتا ہے، وہ الگ رہتا ہے اور دونوں کی لطافت و نرمی اور مزے میں نہایت فرق ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کی قیمتوں میں بھی زمین و آسمان کا فرق رہا کرتا ہے۔ الغرض چکنی ڈلی اگرچہ اس قدر زیادہ لکھنؤ والوں کے شوق کی چیز نہیں ہے، مگر اس کی اصلاح بھی انھوں نے اس قدر کی جو کسی جگہ نہیں ہوسکی تھی۔

اب چونکہ پان کے اجزا ختم ہوگئے، لہٰذا ہم اس کے ظروف و آلات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ پانوں کے سامان رکھنے کی سب سے اہم چیز یا یوں کہیے کہ پانوں کی گلوریوں میں جو قوت برقی کی سی اخلاقی اور معشوقانہ کشش ہوتی ہے، اس کی بیٹری، پاندان ہے۔ اگلے زمانے میں خصوصاً دہلی میں پٹاری ہوا کرتی تھی جو گول اور مربع یا ہشت پہل سب قطعوں کی ہوتی ہیں۔ اور غالباً دہلی ہی سے حیدرآباد میں پٹاری نما پاندان گئے جن کی نقل وہ ٹین اور شیشے کے مربع پاندان ہوتے ہیں جو حیدرآباد کی شادیوں میں کمال فیاضی سے چونا، کتھا، ڈلیاں، چکنی ڈلیاں، الائچیاں، لونگیں اور پان وغیرہ رکھ کر مہمانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بہر حال پرانے پاندان یہی پٹاریاں تھیں اور انھی پٹاریوں کو ساتھ لیے ہوئے دو ڈیڑھ صدیوں پیش تر کی محترم خاتونیں

دہلی سے لکھنؤ آئی تھیں۔ یہاں جب تک دہلی کی تقلید رہی، وہی پٹاریاں رہیں۔ مگر جس دن سے لکھنؤ والوں نے اپنی وضع، معاشرت اور زبان میں اپنی تراش خراش شروع کی، اس روز سے پاندانوں کا نقشا بھی بدلنا شروع ہو گیا۔ پہلے تو پان رکھنے کے لیے فقط تانبے کی قلعی دار گول پٹاریاں اختیار کی گئیں۔ پھر اُن کے ڈھکنے میں بلندی اور گولائی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ چند روز میں ان کی قطع ایک چوڑے نقرئی قبّے کی سی ہو گئی، جس پر چوٹی کی جگہ گرفت کے لیے ایک لمبوترا کڑا لگا دیا جاتا ہے۔ کڑے کے دونوں سرے کنڈھوں میں پنہا دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ بجائے اوپر کی طرف قائم رہنے کے، وہ اِدھر اُدھر پڑا رہتا ہے۔ اس پاندان کے اندر دو کتھے چونے کی کلھیاں ہوتی ہیں۔ جن کی قطع بعینہٖ چھوٹی پتیلیوں کی سی ہوتی ہے۔ انھی کلھیوں کے سلسلے میں تین برابر کی بڑی ڈبیاں ہوتی ہیں۔ جن میں سے بعض میں مسلّم اور بعض میں کٹی ہوئی ڈلیاں اور چکنی ڈلیاں رکھی جاتی ہیں۔ یہ تینوں ڈبیاں اور دونوں کلھیاں برابر ایک حلقے میں جمی رہتی ہیں، اور ان کے بیچ میں یعنی مرکز کے مقام پر جو جگہ چھوٹتی ہے، اس میں ایک اور چھوٹی ڈبیا رکھ دی جاتی ہے۔ جس میں علی العموم الائچیاں یا لونگیں رکھی جاتی ہیں۔ ڈبیوں کے ڈھکنے کسے ہوئے ہوتے ہیں، خود بخود نہیں کھل سکتے، بلکہ کھلنے میں تھوڑا بہت زور مانگتے ہیں۔ مگر کلھیوں کے ڈھکنے تھالی نما ہوتے ہیں۔ جو ان کے منہ پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں کتھا چونا لگانے کی چمچیاں ہوتی ہیں، جن کے سروں پر کبھی تو مور بنا دیا جاتا ہے اور کبھی سادی رہتی ہیں۔ ان کلھیوں کے اوپر ایک بڑی پورے پاندان بھر کی تھالی ہوتی ہے، جس میں پان کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اگلے دنوں ایک اور پان کی قطع کا جداگانہ ڈھکنے دار ظرف ہوتا تھا، جس میں پان رکھے جاتے، وہ ناگردان کہلاتا تھا۔ مگر تجربے نے اُس کو غیر ضروری اور

ناقص ثابت کیا۔ اس لیے کہ اس میں بند کر دینے سے ہوا نہ لگتی اور پان خراب ہو جاتے۔ اس وجہ سے ناگردان اگرچہ بعض بعض پرانے پاندانوں میں اب بھی نظر آجاتا ہے مگر دراصل اس کا رواج بالکل چھوٹ گیا اور عن قریب عنقا ہو جائے گا۔

چند روز میں پاندان عورتوں کو صندوق، خزانے اور کیش بکس کا کام دینے لگا۔ اور عورتوں کے لیے سچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں عمرو عیار کی زنبیل تھا۔ اس ضرورت سے وہ وسعت اور جسم میں بڑھنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ دس دس سیر اور بیس بیس سیر کے پاندان بننے لگے۔ اور پھر سخت ضروری تھا کہ جہاں جانے میں ہر جگہ وہ ساتھ رہے۔ اس لیے کہ بہ مصداقِ "شعلہ بقدرِ علم"، جتنا بڑا پاندان ہوتا تھا، اتنی ہی بڑی بیگم صاحب کی حیثیت و وجاہت سمجھی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈولی میں ساری جگہ پاندان لے لیا کرتا۔ اور بیگم صاحب کو بڑی مشکلوں سے دبنے اور سمٹنے کے بعد بیٹھنے کو جگہ ملتی۔ پھر تقدیریہ پاندان وزن اور قامت میں روز افزوں ترقی کرتے جاتے تھے کہ یکایک اختصار پسندی نے نئی طرح کے چھوٹے، بلند، گنبد نما اور کلس دار پاندان ایجاد کیے جو پہلے تو آرام دان کہلاتے تھے مگر اب عموماً حسن دان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں اندر تو وہی چیزیں ہوتی ہیں جو پاندان میں ہیں، مگر بیرونی قطع ایک کلس دار خوش نما گنبد کی سی ہوتی ہے اور بجائے کڑے کے، اسی کلس یا چوٹی کو پکڑ کے اٹھایا جاتا ہے۔ یہ حسن دان عموماً پسند کیے گئے۔ لکھنؤ میں بھی اور دیگر بلاد میں بھی ان کی مانگ بڑھی۔ لکھنؤ میں پہلے پہل ان کو مردوں نے اختیار کیا یا اُن لوگوں نے جو نمائش اور دکھاوے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ مگر چند روز میں عام ہو گیا۔ اور گو اگلی وضع کے پاندان نہیں مٹے مگر اب زیادہ رواج حسن دانوں ہی کا ہے۔ اور جن گھروں میں پاندان باقی بھی ہیں تو اُتنے بڑے نہیں بلکہ چھوٹے۔ اب مراد آباد میں بھی ایسے ہی لکھنؤ کی وضع کے حسن دان بننے لگے ہیں۔ مگر وہ زیادہ پھیلے ہوتے ہیں اور اس قدر

خوب صورت نہیں ہوتے جیسے کہ لکھنؤ میں بنائے جاتے ہیں لکھنؤ کے حسن دانوں کا تناسب ہی ایک چیز ہے جو یہاں کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی جگہ کے کاریگروں سے اس تناسب کا قائم رہنا قریب قریب غیر ممکن ہے۔

پاندان کے بعد "خاصدان" ہے۔ یہ وہ ظرف ہے جس میں رکھ کے گلوریاں محفل یا صحبتِ احباب میں لائی جاتی ہیں۔ دہلی میں یہ کام ایک کھلی ہوئی تھالی دیتی ہے جس میں ایک طرف کتری ہوئی ڈلیاں رکھ دی جاتی ہیں اور دوسری طرف آدھے آدھے پان چونا کتھا لگا کر اور دہرا کے یعنی موڑ کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اور چونکہ اب بھی وہاں یہی تھالی مروّج ہے، اس لیے امید ہے کہ اگلے زمانے میں بھی پانوں کے صحبت میں لانے کا یہی طریقہ ہوگا۔ مگر لکھنؤ میں کم از کم دو پانوں کی گلوریاں بنائی جاتی ہیں، جو پہلے تو سنگھاڑے کی وضع کی خوب گٹھی ہوئی ہوتی تھیں، اب عموماً بڑے ہوتے ہیں۔ اور ان کی قطع ایسی ہوتی ہے جیسی کہ بوتلوں میں لگانے کے لیے کاغذ کی ڈاٹ بنائی جاتی ہے۔ پھر ان کے قائم رکھنے کے لیے کیلیں لگا دی جاتی ہیں۔ پہلے لونگیں لگادی جاتی تھیں۔ بعد ازاں زنجیروں کا ایک لچھا ایجاد ہوا۔ لچھے کی صورت یہ ہے کہ چاندی کی ایک ڈبیا یا کیری نما عطر دان میں چاروں طرف بہت سی زنجیریں لگا دی جاتی ہیں، جن میں کیلیں لگی ہوتی ہیں۔ یہ پورا لچھا مع پانوں کے خاصدان میں رکھ دیا جاتا ہے۔ مگر اس کو تطویل خیال کر کے، یہ رواج ہو گیا کہ گلوریوں میں لوہے کی کیلیں لگا دی جایا کریں۔ مگر اب سب سے اچھا طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ گلوری کے اوپر پان ہی کا ایک غلاف چڑھا دیا جاتا ہے جو اس کو کھلنے نہیں دیتا۔

بہر حال ان گلوریوں کے لیے صرف تھالی مناسب نہ تھی، اسی لیے اس تھالی پر ایک گنبد نما کلس دار ڈھکنا ایجاد کیا گیا۔ جس کو تھالی پکڑ لیا کرتی۔ ڈھکنے نے خاصدان کی صورت بھی چھوٹے حسن دان کی سی کر دی۔

(۵۲)

پانوں کی گلوریاں رکھنے کے لیے اگرچہ خاصدان میں بہت ترقی کی گئی، اس کی خوش نمائی و نظر فریبی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا، مگر جب یہ نظر آیا کہ گرمیوں کے موسم میں تانبے کے قلعی کیے ہوئے خاصدان جل اٹھتے ہیں، اور ان میں رکھنے سے پُرتکلّف گلوریوں کے خشک ہونے کے علاوہ وہ ایسی گرم ہو جاتی ہیں کہ کھانے میں بجائے تفریح کے تکلیف ہوتی ہے اور بعوض تسکین کے، مُنہ خشک ہو جاتا ہے تو اس موسم میں ان کے رکھنے کے لیے مٹّی کی کوری ہانڈیاں اختیار کی گئیں، جن میں پان ٹھنڈے رہتے ہیں۔ ان کی تازگی و فرحت بخشی میں اور ترقی ہو جاتی ہے اور ان میں نہایت ہی سوندھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کاغذی ہانڈیاں لکھنؤ میں ایسی سبک، خوشنما اور ورق کی سی باریک بنتی ہیں کہ اور کسی جگہ نہیں بن سکتیں۔ جب ان کو پانی میں بھگو کے اور ان میں گلوریاں رکھ کے سامنے لائی جاتی ہیں تو پان تو بعد میں کھایا جائے گا، ان کی صورت دیکھتے ہی آنکھوں میں تازگی آ جاتی ہے۔

پھر اُمرا کے تکلّف نے اِس خیال سے کہ ان کو بار بار بھگونا دشوار ہے، اور جب تک پانی میں تر نہ ہوں، ان میں لطف نہیں آسکتا، ان پر کپڑا منڈھا تا کہ کپڑا ان کو تر رکھے۔ اور معمولی سفید کپڑا چونکہ جلدی میلا ہو جاتا ہے اور گلوریاں رکھنے کی وجہ سے اس میں جا بہ جا سرخ دھبّے پڑ جاتے ہیں، اِس لیے بجائے سفید کے، ان پر سرخ ٹول منڈھا گیا، جو نہ جلدی میلا ہوتا ہے اور نہ پان کے دھبّے اس کو بدنما کر سکتے ہیں۔ زیادہ آراستگی کے لیے ان ہانڈیوں میں ٹول پر باریک روپہلی دھنک سے پھانکیں سی بنا دی جاتی ہیں۔ اِن چیزوں نے پان کی ہانڈیوں کو بنا سنوار کے دلھن بنا دیا۔

تانبے کے خاصدان بھی عموماً غلاف میں بند رہتے ہیں۔ اور اسی طرح

کے غلافوں کا رواج پاندانوں اور حسن دانوں کے متعلق بھی ہے جو بڑے اہتمام سے حسب درجہ و حالت پُر تکلّف بنائے جاتے ہیں۔ جن میں فقط حفاظت ہی نہیں، آرائش بھی ملحوظِ خاطر ہوتی ہے۔

ایسا ہی ٹول، دھنک کے ساتھ صُراحیوں پر بھی منڈھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے صراحیوں میں پانی خوب ٹھنڈا رہتا ہے اور ان کی صورت دیکھتے ہی بے پیاس کے پانی پی لینے کو جی چاہتا ہے۔

پان کھانے والوں کو اکثر پیک تھوکنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، جس کے لیے بار بار اٹھنا زحمت سے خالی نہیں۔ اور پھر جن کمروں میں پُر تکلّف فرش بچھا ہو، تھوکنے کو جگہ مشکل سے اور دور جا کے ملتی ہے۔ اور جگہ ملے بھی تو پیک کے دھبّوں سے مکان خراب ہوتا ہے۔ اس لیے پان ہی کے سلسلے میں ایک اور ظرف کی ضرورت پیش آئی جو تھوکنے کے لیے ہو۔ یہ ظرف اگالدان کہلاتا ہے۔ اگالدان کوئی نئی چیز نہیں جس کو لکھنؤ کے ساتھ خصوصیت ہو۔ پہلے اگالدان غالباً دہلی میں ایجاد ہوئے اور وہ بعینہٖ لکھنؤ میں منتقل ہوآئے۔ ان کی قطع یہ تھی کہ نیچے گول پیندا، اس کے اوپر ایک گول لٹّو، پھر اُس کے اوپر کنول نکا دہانہ۔ یہ اگالدان تانبے، پیتل اور جست کے ہر جگہ بننے لگے۔ بیدر میں ان پر وہاں کا بے نظیر بیدری کا کام بنا۔ لکھنؤ میں تانبے پر نقّاشی کا کام بنایا گیا۔ پھر مراد آباد میں بنے اور ان پر وہاں کی نفیس نقّاشی ہوئی۔ لکھنؤ میں پھر مٹّی کے اگالدان اسی قطع کے بننے لگے۔

مگر ان میں خرابی یہ تھی کہ اُن کے نیچے کا حصّہ ہلکا اور اوپر کا زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے وزنی ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اکثر بے احتیاطی یا غفلت میں گر جاتے اور فرش خراب ہوتا۔ اس عیب کو دور کرنے کے لیے جے پور، حیدر آباد اور اس کے بعد مراد آباد میں ایک دوسری قطع کے اگالدان بننے لگے، جو شاید دہلی ہی کی ایجاد ہوں۔ ان

کی قطع کہاروں کی ٹہلک، یا مداری کی ڈگڈگی کی سی ہوتی ہے۔ اور لکھنؤ میں بھی بہت سے لوگوں کو اس قسم کے اگالدان اختیار کر لینا پڑے۔ اگرچہ یہاں ابھی تک پرانی وضع چھوٹی نہیں اور اسی وضع کے بہت بڑے بڑے اگالدان اب بھی بنتے ہیں، مگر اب بہت سے گھروں میں اس نئی وضع کے بھی موجود ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اگالدان کی ایجاد و ترقی میں لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگرچہ ان کا رواج لکھنؤ میں ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔

اب ایک نئی قطع کے بیٹھے اور پھیلے ہوئے انگریزی اگالدان بھی آتے ہیں جو چینی اور تام چینی کے ہوتے ہیں۔ مگر وہ غالباً چرٹ پیتے وقت تھوکنے کے لیے ہیں۔ پان کی پیک تھوکنے کے لیے بالکل موزوں نہیں ہیں۔

خاصدان کے بعد امرا اور خوش باش لوگوں کے ہمراہی سامان میں پانی کی لٹیا بھی ہے، جو خدمت گاروں کے پاس رہا کرتی ہے۔ علی العموم یہ تلبیے کی اوسط درجے کی سادی یا نقشی لٹیاں ہوا کرتی ہیں۔ جن لوگوں کو خدا نے استطاعت دی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ امارت و دولت مندی نے ان کو پابندیِ شرع سے آزاد کر دیا ہے، وہ چاندی کی لٹیاں ساتھ رکھتے ہیں۔

لٹیا پرانی ہندوؤں کے عہد کی چیز ہے، جو ایک بے ٹونٹی کا گول ظرف ہوتا تھا۔ جس کا منہ، پیٹ سے چھوٹا ہوتا۔ اور چونکہ کنویں سے پانی بھرنے کی اکثر ضرورت پیش آیا کرتی، اس لیے ہر مسافر کے ساتھ سفر میں لٹیا ڈوری ضرور رہا کرتی۔ اور دیہات کے ہندوؤں اور نیز وہاں کے ادنا طبقے کے مسلمانوں میں آج تک اسی اگلی شان میں اس کا رواج ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانے میں اس لٹیا میں ٹونٹی لگادی، تاکہ پانی کے استعمال میں آسانی ہو۔

میں نہیں جانتا کہ دہلی کے امرا میں بھی یہ رواج تھا۔ اور جن لوگوں کے ساتھ خدمت گار رہا کرتے تو ان کے پاس لٹیا بھی ضرور ہوتی، جو پانی پینے، کلی کرنے اور دیگر

ضرورتوں میں کام آیا کرتی۔ مگر لٹیا کی موجودہ قطع اور اس کی خوشنمائی میں لکھنؤ کو بڑا دخل ہے جس کا حال ہم تانبے کے برتنوں کے سلسلے میں بیان کریں گے۔

گرمیوں میں رنگین کپڑے کا منڈھا ہوا جھالردار پنکھا بھی خدمت گاروں کے پاس رہتا۔ اور بعد کے زمانے میں چھتری بھی لازم ہو گئی جس کو دھوپ میں نوکر آقا کے سر پر لگائے رہتا۔

گھروں کی اندرونی ضرورتوں میں ہاتھ دھونے کے لیے سلفچی، آفتابہ، اور چوں کہ صابن کا رواج نہ تھا، اس لیے بیسن دانی بھی ضروری چیزیں تھیں۔ سلفچی، آفتابہ ہندوستان کے دولت مند گھرانوں کی پرانی چیزیں ہیں، جو دہلی میں خدا جانے کب سے مروّج تھیں، اور اپنی قدیم وضع و شان سے لکھنؤ میں آ گئیں۔ یہاں سلفچی تو وہی رہی اور گو اب اس کی جگہ تسلے کا زیادہ رواج ہو گیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ سلفچی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سلفچی ایک گول پیٹ کا ظرف ہے جس کا منہ ذرا چھوٹا کر کے، اگرچہ ایک اُتھلے تشت کی وضع میں بہت زیادہ پھیلی ہوتی ہیں۔ اور منہ پر ایک پردے کی جالی رکھ دی جاتی ہے، جس میں سے ہاتھ دھونے میں سب پانی گر جاتا ہے۔ اس پردے کو جب چاہیں اٹھا کر اس کو خوب اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ اس جالی کے اوپر تھوڑی گھاس ڈال دی جاتی ہے کہ پانی کے گرنے میں چھینٹیں نہ اڑیں۔ اس میں بہت بڑی خوبی اور نفاست یہ ہے کہ میلا پانی جس کی صورت کریہ ہوتی ہے، نظر کے سامنے نہیں رہتا اور جن کے مزاج میں نفاست ہے، ان کو تکلیف ہوتی ہے (کذا)۔ مگر آفتابے کی جگہ لکھنؤ میں لوٹا رائج ہو گیا۔ دراصل آفتابہ ہی پرانے زمانے کا لوٹا تھا جس پر لکھنؤ کے مذاق نے تصرّف کر کے موجودہ لوٹے کی سڈول شکل پیدا کی۔ پُرانا لوٹا جو آفتابہ کہلاتا، اس کی شکل یہ تھی کہ تانبے کا ایک مخروطی شکل کا ظرف ہوتا جس میں پیٹ اور گلے کا کچھ امتیاز نہ تھا۔ پیندے کے پاس جتنا دور ہوتا، وہ اوپر کی طرف تدریجاً گھٹتا

چلا جاتا۔ آخر میں وہی گلا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ کنارے موڑ کے مُنہ بنا دیا جاتا۔ اور ایک جانب اس میں خم دار ٹونٹی لگا دی جاتی۔ اس شکل کے لوٹے حیدر آباد میں آج بھی مل جاتے ہیں، جو اپنی قدامت اور ہمارے لوٹوں کے نقشِ اولیں کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی شکل مصر و شام کے گلی ظروفِ آب یا انگریزوں کے یہاں مُنہ دھوتے کی میز پر جو چینی کا جگ رہتا ہے، اس کی سی ہوتی۔ اور اسی سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو عرب و ایران سے اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ چند روز بعد ہندی تمدّن کے اثر نے اس میں پہلا تصرف یہ کیا کہ پیٹ گول بن کر، گردن سے جدا اور متمائز ہو گیا۔ مگر اصلیت کی قربت کے باعث لمبوترا پن باقی تھا یعنی عرض اور پھیلاؤ، بلندی کی مناسبت سے نہ تھا۔ اُس وقت تک پیٹ کی گلائی بھی کُرے کی شکل نہیں، بلکہ بیضاوی تھی۔ یہی شکل اُس آفتابے کی ہے جس کا ذکر اُردو کی اگلی مثنویوں اور قصے کہانیوں میں ہے۔ لکھنؤ میں یہ ہوا کہ پیٹ بیضاوی سے کُروی ہو گیا۔ اور جتنی بلندی ہوتی، اُسی کی مناسبت سے اس کا دور اور پھیلاؤ بھی بڑھ گیا۔ گلوں میں ایک موزوں ڈھلاو ہو گیا اور ٹونٹی بھی ابتداءً وسیع اور نوک کے پاس تنگ، خم دار اور بہت ہی خوش نما ہو گئی۔ یہ لکھنؤ کا موجودہ لوٹا ہے، جس سے زیادہ خوش نما اور سڈول لوٹے ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں بنتے۔ اور ہر جگہ کے شوقین فرمائشیں کر کر کے لکھنؤ سے منگوایا کرتے ہیں۔ جو تناسب لوٹوں میں یہاں پیدا ہو گیا ہے، چھوٹی لُٹیا سے لے کر بڑے سے بڑے لوٹے تک سب میں نظر آتا ہے۔ اسی قسم کا مناسب تصرف تانبے کے تمام برتنوں میں ہوا ہے، جس کو ہم آیندہ بیان کریں گے۔ اس لیے کہ اس محل پر اس کے بتانے کا موقع نہیں ہے۔

بیسن دانی دراصل تانبے کی ایک بے ٹونٹی کی لُٹیا ہوتی ہے۔ عموماً کھانے کے بعد زُہنیت چھڑانے کے لیے اس میں سے بیسن لے کر ملا جاتا ہے اور پھر پانی سے دھو ڈالا جاتا ہے۔ بعض مگر بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو بیسن کی جگہ بیسن دانی میں اُبٹنا یا

کھلی رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ بیسن کھلنے کی چیز ہے، جس کو ہاتھ دھونے میں ضائع کرنا اُن کے خیال میں ناجائز یا نامناسب ہے۔ مگر اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے، اس لیے کہ اُبٹنا شادیوں کے سوا اور کسی موقع پر نہیں بنتا۔ اور کھلی سے ہاتھ میں اس کی تیز بو آنے لگتی ہے۔

(۵۴)

معاشرت کے بہت سے سامانِ ضروری اور آدابِ نشست و برخاست کو ہم اس سے پیش تر بیان کر چکے ہیں، مگر ابھی ہم کو یہاں کے شرفا کی باہر کی آمد و رفت کی وضع و شان بتانے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان کے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی انگریزیت اس قدر غالب آ گئی ہے کہ ایشیا کے آخری تمدّن میں جو وضع پیدا ہوئی تھی، بالکل مٹ گئی۔ مگر ہم کو اس موقع پر وہی چیز بیان کرنا ہے جو مٹ چکی ہے یا مٹنے کے قریب ہے۔ لہٰذا ہم آج سے ساٹھ ستر برس پیش تر سے بھی پہلے زمانے میں نکلے چلتے ہیں اور اُس زمانے کی تصویریں ناظرین کے پیشِ نظر کرتے ہیں، جو اب کہیں نہیں نظر آ سکتیں۔

آج کل کی سی عمدہ موٹروں اور لمبی چوڑی فٹنوں اور لینڈو گاڑیوں کے نہ ہونے سے، اور نیز حال کے اصولِ حفظِ صحت کے پیشِ نظر نہ ہونے کے باعث، اُن دنوں آج کل سی لمبی چوڑی اور وسیع و کشادہ سڑکیں نہ تھیں۔ بلکہ تنگ گذرگاہیں تھیں جن میں ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، ہوادار، بوچے، پینسیں، میانے، سکھپالیں، ڈولیاں، رتھیں، بہلیں، آدمیوں کی بھیڑ میں سے ہٹو بچو کرتی ہوئی ہر وقت گزرا کرتی تھیں۔ کیسا ہی مرجعِ عام بازار اور کیسی ہی پسندیدہ سیر گاہ ہو، سب کی حالت بلا استثنا یہی تھی۔

ایک اونٹ تو نہیں جو فوجی ضرورتوں، نامہ بر قاصدوں، یا بار برداری کے لیے مخصوص تھے، باقی اور تمام سواریاں شرفا و رؤسا میں حسبِ حالت و حیثیت مروّج

تھیں۔ اعلا طبقے کے شاہ زادے اور نوّاب یا اُنھی کے درجے کے اور اُمرا، ہَوادار وں اور لوچوں پر سوار ہو کے نکلتے۔ ہَوادار، ٹمٹم کی وضع کی ایک کُھلی ڈولی تھی جس کے پیچھے چمڑے کا ٹپ ہوتا اور لوہے کی کمانیوں کے ذریعے سے کھولا یا بند کیا جا سکتا۔ ٹھنڈے اوقات میں جب ٹپ گرا دیا جاتا تو ہر طرف کی فضا کھلی رہتی۔ آگے پیچھے اس میں فنس کے سے ڈنڈے لگے ہوتے۔ چار کہار اُس کو کاندھوں پر اُٹھا کے لے جاتے اور جو شخص سوار ہوتا وہ نہایت وقار و تمکنت سے بازار کی سیر کرتا، ہر چیز کو دیکھتا بھالتا اور شناساؤں سے صاحب سلامت کرتا ہوا جاتا۔ ہَوادار کی قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص انگریزوں کی ایجاد کی ہوئی چیز تھی۔ ہندوستان میں آکر انھوں نے اپنے مذاق کے مطابق اور اپنی جدّت طرازی سے اس کو ایجاد کیا۔ اور اپنی نفاست، خوشنمائی، اور صفائی کی بدولت رؤسائے ہند کو بہت پسند آیا۔ اب اس کا رواج بالکل اُٹھ گیا۔ اگرچہ بعض پرانے رؤسا کے یہاں چند ہَوادار اب بھی پڑے ہوئے ہیں جو رؤسا کی آمد و رفت میں تو نہیں مگر دولت مند ہندوؤں کی براتوں میں وہ کبھی کبھی نظر آجایا کرتے ہیں۔

بوچا، اس سے زیادہ باوقار اور متین سواری تھی۔ اس کی قطع آج کل کی بروہم یا اَدّھا گاڑیوں کی سی ہوتی، جس میں پہیوں کے بجائے پایے ہوتے۔ اور آگے پیچھے فنس کے ایسے دو ڈنڈے ہوتے اور کم از کم آٹھ اور اکثر سولہ کہار اُس کو اٹھا کے لے چلتے۔ اس لیے کہ وہ کہاروں کے اٹھانے کی تمام سواریوں سے زیادہ بھاری ہوتا۔ اس سواری پر شاید کبھی اور اُمرا بھی سوار ہوئے ہوں مگر میں نے فقط واجد علی شاہ کو کلکتے میں اس پر سوار ہوتے دیکھا۔ اور اُن کے سوا یہ سواری میں نے کہیں اور کسی کے پاس نہیں دیکھی۔ بادشاہ اپنے باغوں، محلوں اور کوٹھیوں میں اسی پر سوار ہو کے پھرا کرتے اور گردِ جلوسی خُدّام کے علاوہ معزز ارکانِ دولت اور حضور رس مصاحبین پا پیادہ ساتھ چلتے۔ مگر یہ بھی یقیناً انگریزوں کی ایجاد تھا، جو اُس عہد کی انگریزی گاڑیوں سے اخذ کر کے کہاروں

کے اٹھانے کے قابل بنالیا گیا۔

سُکھپال اُن دنوں عورتوں کی نہایت معزز سواری تھی، جو خالص ہندوستانی چیزاور ہندی مذاق کے تکلّفات کا مکمل نمونہ تھی۔ یہ ایک سرخ گنبد نما ڈولی تھی۔ ایک لمبے چوڑے کھٹولے پر ایک شان دار لال برج سا بنا دیا جاتا، جس میں سونے چاندی کے کلس لگے ہوتے۔ چاروں طرف پردے لٹکتے ہوتے۔ اس میں بھی آگے پیچھے دو دو ایک ایک ڈنڈے ہوتے اور بہت سے کہاران کو اٹھا کے لے چلتے۔ یہ سواری عالی مرتبہ بیگمات اور محلِ شاہی کی خاتونوں کے لیے خاص تھی۔

رتھ اسی وضع کی پہیوں دار گاڑی تھی جس میں بیل جوت دیے جاتے۔ رتھیں دیہات کے تعلقداروں اور معزز زمینداروں کے یہاں اور دیسی ریاستوں میں اب بھی موجود ہیں، مگر روز بہ روز بے کار ہوتی جاتی ہیں اور ان کا رواج اٹھتا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں خاص شاہی محلات کی ضرورت کے لیے اُن دنوں ہزاروں رتھیں تھیں۔ شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ، نواب آصف الدولہ کے عہد میں جب اپنی بیوگی کی زندگی ایک حکمراں ملکہ کی شان سے فیض آباد میں بسر کرتی تھیں تو اکیلی اُن کی سرکار میں آٹھ نو سو رتھیں تھیں۔ اور قدیم الایّام میں جب شاہانِ دہلی اپنی مملکت میں دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے تو اُن کے محلاتِ عالیات انھی رتھوں پر سوار ہو کے ساتھ جاتے۔

بہل، بیلوں کی عام گاڑی تھی، جس میں ایک کھٹولے کو دو پہیوں پر قائم کرتے۔ پھر اس پر چار ڈنڈے کھڑے کر کے، ایک چھتری لگا دیتے۔ اور اس پر پردے کے لیے غلاف ڈال دیا جاتا۔ اس میں اکثر مرد اور عورتیں سفر کرتیں۔ اُن دنوں متوسّط طبقے کے دیہاتیوں اور شہریوں دونوں کے لیے سفر کا ذریعہ یہی سواری تھی۔ بہلیں، دیہاتوں میں اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ مگر اُن کی ضرورت روز بہ روز گھٹتی جاتی ہے۔ اور عن قریب ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ یہ سواری عنقا ہو جائے گی۔

اِن کے سوا تمام سواریوں کو لوگ خود ہی جانتے ہیں، ہمیں اُن کی شکل وصورت بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال یہ سب سواریاں شہر کے تمام راستوں اور گلی کوچوں میں گزرتی نظر آتیں زیادہ تر لوگ فنسوں پر سوار ہوتے۔ علما، اطبا، امرا، اور خوش باش، جن کو خدا استطاعت دیتا، چار کہار نوکر رکھ لیتے جو خدمت گاری بھی کرتے اور سواری کا بھی کام دیتے۔ جن لوگوں میں ذرا بھی بانکپن ہوتا یا سپہگرانہ شان دکھانا چاہتے، جو اُن دنوں تمام اہلِ شہر میں عام تھی وہ گھوڑے پر سوار ہو کے نکلتے، جو چاندی کے زیور اور کارچوبی سازوبراق سے دُلھن بنا دیے جاتے۔ اعلا درجے کے معززین ہاتھیوں پر بیٹھے آمدورفت کرتے، جو باوجود اس قدوقامت کے تمام گلی کوچوں میں بلاتکلف گزر جاتے، ہاتھیوں پر سادی بانات یا کارچوبی جھولیں ہوتیں اور ان پر کھلے ہودے یا سایہ دار بُرج نما عماریاں کسی جاتیں۔

زنانی سواریاں جو سکھپالوں اور فنسوں پر ہوتیں، وہ بڑے تکلف اور شان سے نکلتیں۔ فنس پر سرخ جھمکے پڑے ہوتے، جن پر کبھی گوٹا لچکا بھی ٹانک دیا جاتا۔ کہار سرخ بانات کے چُغے پہنے ہوتے۔ سروں پر سرخ گردار پگڑیاں ہوتیں، جن کی گگروں پر چاندی کی مچھلیاں ٹکی رہتیں۔ مچھلی، ہندوستان میں بہترین شگون مانی گئی ہے۔ رخصت کرتے وقت یا کسی کو کسی اہم کام کے لیے جاتے وقت آج بھی عورتوں کی زبان سے نکل جاتا ہے، "دہی مچھلی!" غالباً اِس کو نجوم سے تعلق ہو اور یہ بھی نجومیوں ہی کا نکلا معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کی مچھلیاں بنوا کر کہاروں کی پگڑی میں ٹانک دی جائیں جو آگے رہتے ہیں۔ تاکہ کہیں جاتے وقت مچھلیاں ہر وقت پیشِ نظر رہیں۔

زنانی فنس کے ساتھ ساتھ ایک کہاری جھمکے کا کونا پکڑے دوڑتی جاتی۔ ان کہاریوں کی وضع بھی خاص قسم کی تھی۔ سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ لہنگے میں اتنی چوڑی گوٹ ہوتی ہے کہ اُس کا آدھے سے زیادہ حصّہ فقط گوٹ کا ہوا کرتا۔

ان سواریوں میں سے شہر میں اب فقط فنس باقی رہ گئی ہے۔ یا کبھی کبھی کوئی رئیس گھوڑے یا ہاتھی پر دکھائی دے جاتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ باہر نکلنے میں شرفا کی کیا وضع ہوتی تھی۔ لباس کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ مگر ان کی تصویر دکھانے کے لیے ہمیں پھر ایک حد تک ان کی وضع قطع بتانے کی ضرورت ہے۔ سواری کی شان کے متعلق میں نے جو کچھ بیان کیا، اس میں بجز لوچے اور رہوادار کے، اور تمام چیزیں وہی ہیں جو دہلی سے آئیں۔ لکھنؤ کو ان سے کوئی خصوصیت نہیں۔ دراصل یہ دہلی ہی کی شان تھی جو اپنی آخری جھلک بڑے کرّوفر کے ساتھ لکھنؤ میں دکھا کے غائب ہو گئی۔

لیکن لباس میں لکھنؤ، دہلی سے جدا ہو گیا۔ اب گھر میں کرتا یا قمیص اتار کے بیٹھنا معیوب ہو گیا ہے۔ مگر ان دنوں یہاں گھر کا لباس سچ پوچھیے تو ایک غرقی تھی۔ یہاں کا دربار شیعہ تھا اور ہر چیز یہاں تشیّع ہی کے سانچے میں ڈھلتی تھی۔ فقہ امامیہ کی رُو سے رانوں کے کھلے رہنے میں مضائقہ نہیں۔ بخلاف حنفیوں کے، کہ اُن کے مذہب میں ناف سے لے کر گھٹنوں تک جس قدر حصۂ جسم ہے، ستر میں داخل ہے۔ اس کا چھپانا ضروری ہے۔ اور اسی بنا پر دہلی میں علی العموم تہمت کی وضع کی لنگی باندھی جاتی۔ جس میں گھٹنوں کے نیچے تک جسم ڈھنکا رہتا ہے۔ یہاں کے تمدّن میں اس کی ضرورت نہیں باقی رہی۔ اور یہاں کی لنگی فقط ایک پتلی سی غرقی یا جانگھیا رہ گئی، جس میں ناف سے کچھ ران تک تو جسم ڈھنک جاتا ہے باقی سب جسم کھلا رہتا ہے۔ لوگوں میں مہذّب اور مرد آدمی بن کے نکلنے کا خیال تو بڑھا ہوا تھا مگر گھر میں بجز ایک غرقی کے جسم پر ایک دھاگا بھی نہ رہتا۔ اور یہ بات اس قدر عام ہو گئی تھی کہ اسی برہنگی کی وضع سے اپنے گھر کسی سے ملنے میں کبھی مضائقہ نہ سمجھا جاتا۔ مگر یہی حضرات جب باہر نکلتے تو شان ہی اور ہوتی قالب پر چڑھی چوگوشیہ ٹوپی، اجلا صاف اور برّاق انگرکھا، جو معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی دھوبی کے گھر سے آیا ہے اور اسی وقت گوٹ اور آستینیں چُنی گئی ہیں۔ گلبدن یا

نین شکھ کا عرض کا پاجامہ۔ کاندھے پر مثلّث رومال۔ ہاتھ میں دستی رومال اور چھڑی۔ اور پانو میں لکھنؤ کا بنا ہوا سبک مخملی خُردنوکا جوتا، باہر نکلنے میں ہر وضع دار شریف کی یہی وضع تھی۔

بہت سے لوگوں کو باہر نکلنے میں اس وضع ولباس کا اس قدر لحاظ تھا کہ کبھی ان کے کپڑے میلے نہ نظر آتے۔ معلوم ہوتا کہ اِسی وقت دھوبی کے یہاں سے آئے ہیں۔ حالانکہ مہینوں اُن کے دھلنے کی نوبت نہ آتی۔ اور ہوتا یہ کہ دو گھڑی دن رہے گھر سے نکلے، خراماں خراماں ہر چیز سے بچتے اور اپنے سایے تک سے بھڑکتے ہوئے چوک کی سیر کی۔ دو گھڑی رات گئے واپس آ گئے۔ اور آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ٹوپی قالب پر رکھ کے ایک کپڑے سے اُڑھا دی۔ انگرکھے، پاجامے، اوڑھنے کے رومال کو احتیاط سے تہ کر کے، دستی رومال میں گٹھری کی طرح باندھ کے کھونٹی پر رکھ دیا۔ اور عرقی باندھ کے اور کوئی پرانا جوتا یا زیرپائی پہن کر بیٹھ رہے۔ اسی داشت کی برکت تھی کہ قیمتی اور شالی کپڑے چار چار پانچ پانچ پُشتوں تک اس احتیاط سے رہتے کہ نہ میلے ہوتے، نہ پھٹتے، نہ کیڑا کھاتا۔ ہمیشہ نئے نئے رہتے اور شادی کی تقریبوں یا شان وشکوہ کی محفلوں میں ایسا شاہانہ لباس پہن کر جاتے کہ لوگوں کو جو اُن کی حالت وحیثیت سے واقف ہوتے، تعجب ہوتا۔

گو کہ اعلا طبقے کے اُمرا خصوصاً شاہ زادے، علما اور اطبّا لزوم کے ساتھ سواریوں پر نکلتے مگر شرفا کے لیے پیدل پھرنا آج کل کے زمانے کی طرح معیوب نہ تھا۔ ہر طبقے اور درجے کے لوگ یکساں حالت سے پاپیادہ باہر کی سیر کرتے اور پیدل چلنے والے بڑے سے بڑے رئیسوں اور معزّز لوگوں کے برابر بیٹھتے اور مضائقہ نہ ہوتا۔

(۵۳)

اب ہم مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ لکھنؤ کی معاشرت نے اپنی ضرورت و

قدر دانی سے کن کن چیزوں کو ترقی دی اور کن کن فنون کو یہاں نشوونما ہوا۔ اس سلسلے میں بہت سی چیزوں کا ذکر آئے گا۔ مگر ہم پہلے مٹی کے برتنوں سے شروع کرتے ہیں۔

مٹی کے برتن دنیا کی پہلی ایجاد ہیں۔ ہر ملک اور ہر سرزمین سے کھود کے قدیم الایام کے خزف پارے برآمد کیے گئے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مٹی کو بھٹی میں پکا کے خزف بنا لینا، انسان کو اپنی ترقیوں کے بہت ابتدائی دور میں معلوم ہو گیا تھا۔ اور غالباً دنیا کے عہدِ حجریت ہی میں معدنی فلزات کے برآمد ہونے سے پہلے انسان کو برتن بنا کے ان کو پکانا آ گیا تھا۔ مصر میں عہدِ فراعنہ کے گلی ظروف اور بابل و نینوا میں غذا اور پانی کے ظروف کے ساتھ نہایت پختہ اینٹیں برآمد ہوئی ہیں۔ فراعنہ کے دور میں امرائے مصر جن تابوتوں میں لاشوں کو ممی بنا کے رکھا کرتے، وہ مٹی ہی کے ہوتے تھے۔ یہی نہیں، اگلی دنیا خزف پاروں اور ٹھیکروں سے بہت دنوں تک کاغذ کا کام لیتی رہی ہے۔

ہندوستان والوں کو بھی قدیم الایام ہی میں یہ فن آ گیا تھا۔ اور عہدِ قدیم کے نکلے ہوئے ظروف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اس فن نے دیگر مقامات سے کم ترقی نہیں کی تھی۔ مخصوصاً بت پرستی نے ہندوؤں میں بھی مٹی کی مورتوں کی بنیاد ڈالی، جس میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ اور یہاں کمہاروں کی ایک ذات پیدا ہو گئی، جس کا خاندانی اور آبائی پیشہ یہی ہے کہ مٹی کے ظروف اور کھلونے بنا کے پکاتے ہیں۔

دہلی میں اسلامی دور نے عام کمہاروں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ کسگروں (کاسہ گروں) کا ایک نیا گروہ پیدا کر دیا جو مسلمان ہیں، اور ظروف کے ساتھ کھلونے بھی بناتے ہیں۔ اور اگرچہ شرعِ اسلام مورتوں کے بنانے کو مطلقاً ناجائز بتاتی ہے، مگر کسگروں کا چونکہ ذریعۂ معیشت یہی کام ہے، اس لیے وہ ایک حد تک کھلونے بنانے

اور بیچنے پر مجبور ہیں۔ مسلمان کسگر عام معاشرت و شائستگی اور نیز اپنے فن میں کمھاروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

دہلی سے مسلمان اُمراان کسگروں کو بھی اپنے ساتھ لکھنؤ میں لائے۔ اور امرا کی شوقینی کی بدولت ان کی صنعت کو یہاں زیادہ اور نمایاں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ کمھار اور کسگر دونوں نے اپنے کام میں وہی ذہانت و طباعی اور جدّت طرازیاں دکھانا شروع کیں جو ایک مصوّر، تصویروں میں اور ایک شاعر، اشعار میں دکھایا کرتا ہے۔

حُسنِ اتّفاق سے لکھنؤ کی مٹّی اس فن کے لیے مناسب ثابت ہوئی جس نے کاری گری کو اظہارِ کمالات کا موقع دینا شروع کیا۔ اور برتن اور کھلونے دونوں ایسے بننے لگے جیسے کہ کہیں نہ بن سکتے تھے۔ ظروف میں تو یہ ترقی ہوئی کہ ایسے سبک، باریک اور صاف اور اس کے ساتھ خوش قطع برتن یہاں بنتے ہیں کہ کہیں نہیں بن سکتے۔ امروہے کی مٹّی بھی اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ وہاں بھی اس فن کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور وہاں کے کاری گروں کے ظروف، گل دستوں اور لکھنؤ کے ظروف کی وضع میں فرق ہے۔ اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ لکھنؤ کے کاری گروں کا کام نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بڑھا ہوا ہے۔

عام چیزوں میں لکھنؤ کے گھڑے، بدھنیاں، سارے ہندوستان کے گھڑوں اور بدھنیوں سے سبک اور خوشنما ہوتے ہیں۔ گھڑوں کی گلائی نہایت ہی مکمل اور اپنے حدود میں پوری ہوتی ہے۔ بدھنیاں، تانبے کے لوٹوں کی قطع سے بہت زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ ظروف میں سفالی کے برتن یہاں سے اچھے شاید کہیں کم ملیں گے۔ مگر چونکہ مٹّی کے برتنوں میں کھانے کا رواج بالکل اُٹھ گیا ہے، اس لیے کمھاروں کی توجہ اب ان کی طرف سے ہٹ گئی اور روز بہ روز گھٹتی جاتی ہے۔ مگر جن ظروف میں یہاں کے کسگروں نے اپنے کمالات کا اعلاترین ثبوت دیا، وہ آبخورے۔ صراحیاں۔ جھجریاں اور حقّے ہیں۔

اور ان کے بعد کھیر کی ہانڈیاں۔

آبخورے، پانی پینے کے ظروف ہیں۔ اگرچہ شیشے اور تام چینی کے سبک اور خوش نما اور نفیس گلاس اور نیز مراد آباد وغیرہ کے گلاس اور کٹورے کثرت سے رواج پا گئے ہیں، مگر ہندوستان میں گرمیوں کا ایک ایسا موسم آتا ہے جب کہ بجز مٹی کے آبخوروں کے، کسی ظرف میں پانی مزہ نہیں دے سکتا۔ اِس لیے کہ پانی ان میں ٹھنڈا رہتا ہے اور خود ان کی ٹھنڈک سے، ہاتھ اور ہونٹھوں پر خنکی کی ایسی لذّت دیتی ہے جو اور کسی چیز سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ علاوہ بریں، مٹّی کے کورے آبخورے میں ایک ایسی روح کو تازہ کرنے والی خوشبو ہوتی ہے، جس کے شوق نے یہاں مٹّی کا عطر ایجاد کرا دیا۔ غرض اس ضرورت نے آبخوروں کو باقی رکھا، جن میں طرح طرح کی نفاستیں پیدا کی گئیں۔ ایسے نازک، ہلکے اور سبک آبخورے بنے جو کاغذی کہلاتے ہیں۔ اور اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ شیشے کے گلاسوں کی نزاکت کو بھی یہاں مٹّی کے آبخوروں کی سبکی اور باریکی نے مات کر دیا۔ پھر ان پر نقش و نگار بنا کے بالو کی ایک تہ چڑھا دی جاتی ہے کہ پانی کو زیادہ ٹھنڈا رکھے۔ انھی کے مناسب اُن کے جوڑ کی تھالیاں ایجاد ہوئیں۔ آخر آبخوروں کی قطع ایسی خوش نما اور دل کش ہو گئی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور زمانے کو مان لینا پڑا کہ انسانی صنعت نے جو کمال پگھلنے والے فلزّات کے استعمال میں دکھایا ہے، وہی مٹّی میں بھی دکھا سکتی ہے۔

آبخوروں کے بعد، پانی رکھنے اور اس کے ٹھنڈا کرنے کے ظروف میں صُراحیاں ہیں۔ صراحی بہت پُرانی چیز ہے، جس کا رواج ایران و مصرِ قدیم میں بھی تھا۔ مگر لکھنؤ کی صراحیاں، مٹّی کی خوبی اور کاریگروں کی لطافتِ مذاق سے نفیس، کاغذی اور بہت ہی سبک ہو گئیں۔ اور پھر اُن کی شکل بھی ایسی خوب صورت ہو گئی کہ ان دونوں باتوں میں کہیں کی صراحیاں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ان کے ڈھالنے پر ایسی متناسب خمیدگی پیدا ہو گئی کہ لکھنؤ کی صُراحیوں کا دہانہ ہی ایسی چیز ہے جو اور کسی جگہ نظر

نہیں آسکتی۔ جھجریاں بھی ویسی ہی نازک وسبک ہیں۔ ان کا پیٹ تو وہی صراحیوں کے مثل ہوتاہے مگر اس کے اوپر لمبی گردن کے عوض ایک ٹھنگر لگا دیا جاتا ہے۔ کام اور نزاکت ولطافت کے اعتبار سے وہ بھی صراحیوں سے کم نہیں ہوتیں۔

حقّے۔ ان میں بھی ٹھنڈک کی بے انتہا ضرورت ہوا کرتی ہے تاکہ دھواں ٹھنڈا آئے۔ مٹّی کے کاغذی حقّے یہاں ایسے نفیس اور خوش قطع بننے لگے کہ کسی جگہ نہیں نصیب ہو سکتے۔ پھر نئے آنوا سے ہوئے کورے حقّوں سے دھویں میں خنکی اور نفاست کے ساتھ ساتھ کوری مٹّی کی ایسی نفیس خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ عہدِ شاہی کے بہت سے عالی مرتبہ رئیسوں کو سوا ان کے کسی حقّے میں مزہ نہ آتا تھا۔ عظیم اللہ خان نے ان میں اور خوشنمائی و نفاست پیدا کر کے، عظیم اللہ خانی حقّے اپنی یادگار چھوڑ دیے جو آج تک مٹّی کے کل قسموں کے حقّوں سے اچھے، سبک اور مقبولِ عام ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ لندن کے ملک الشعرا لارڈ ٹنیسن کی نسبت سُنا کہ اُن کو مٹّی کے سفید پائپ جو "گلی پائپ" کہلاتے ہیں، اس قدر پسند تھے اور اُن کی شاعرانہ نفاست پسندی، کورے پائپوں کی اس قدر رسیا تھی کہ سامنے ایک ٹوکری میں بھرے ہوئے کورے ذرا چھوٹے پائپ رکھے رہتے۔ وہ ایک پائپ کو لے کر اس میں تمباکو بھرتے، پیتے، اور چند منٹ میں اس کو توڑ کے دوسری ٹوکری میں ڈال دیتے۔ پھر دوبارہ ضرورت ہوتی تو دوسرا پائپ لیتے اور چند کش لے کر اسے بھی توڑ کے ڈال دیتے۔ یوں ہی دن بھر بیٹھے کورے پائپ بھرا، پیا، اور توڑا کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر لارڈ ٹنیسن کو لکھنؤ کے عظیم اللہ خانی حقّے مل جاتے، تو ان گلی پائپوں کو بھول جاتے۔ اس لیے کہ ان کے دھویں میں جو ٹھنڈک، نفاست اور خوبی ہوتی ہے، اس کا پتا گلی پائپوں میں کوسوں نہیں ہے۔

کھیر کی ہانڈیاں۔ پکانے کی ہانڈیاں ہر جگہ بنتی ہیں مگر لکھنؤ کی ہانڈیاں،

تانبے کی پتیلیوں کی جتنی سچی نقل ہیں، اور کہیں نہ ہوں گی۔ خصوصاً گلابی ہانڈیاں، جو حصّوں میں کھیر وغیرہ تقسیم کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ آبخوروں اور صُراحیوں کی طرح یہ بھی کاغذی اور بہت ہی خوبصورت بنتی ہیں۔ ان میں اب اکثر نازک اُمرا گلوریاں بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ گرمیوں کے موسم میں خاصدان جل اُٹھتے ہیں اور ان میں گلوریاں بھی بہت گرم ہو جاتی ہیں۔ مگر ان ہانڈیوں میں وہ اس قدر ٹھنڈی رہتی ہیں اور ان میں ایسی سوندھی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ نہایت ہی فرحت بخش ہو جاتی ہیں۔ مگر برتنوں سے بھی زیادہ کمال کمھاروں نے کھلونوں اور مٹّی کی مورتوں میں دکھایا۔ بُت تراشی کا فن بُت پرستی کے طفیل میں بہت بڑا ہے۔ مصریوں، بابلیوں اور ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں، سب نے اپنے اپنے عہد میں اس فن میں کمالات دکھائے جن کے نمونے آج یورپ کے نامور عجائب خانوں میں نظر آ سکتے ہیں۔ خصوصاً اہلِ یونان نے پتھّر کی مورتیں تراشنے اور اعضا کا تناسب قائم رکھنے میں ایسا کمال دکھایا کہ آج کا زمانہ بھی باوجود بے انتہا ترقیوں کے ان کی چابک دستی پر حیران ہے۔ اور ان کی بنائی ہوئی مورتیں حال کے بت تراشوں اور مصوّروں کے لیے بہترین "ماڈل" یا معیار سمجھی جاتی ہیں۔ مگر مٹّی کے کھلونوں میں تناسب اعضا قائم رکھنے اور فطرت کی سچّی نقل اتارنے میں جو کاریگری یہاں کے اَن پڑھ جاہل کمھار دکھا رہے ہیں، وہ یونان کے کمال سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔ وہ انسان کو دیکھ کر، اُس کی پوری صورت اتنی ہی بڑی جتنا کہ اُس کا جسم ہو، تیار کر دیتے ہیں۔ پھر چھوٹی مورتوں میں ہر وضع اور ہر طبقے کے لوگوں کی ایسی مُطابقِ اصل تصویریں بناتے ہیں کہ اُن کے کمال میں شاعرانہ نازک خیالیوں کا پتا چلتا ہے۔ دیوالی میں ہندو کثرت سے کھلونے خریدتے اور تقسیم کرتے ہیں۔ اور اسی ضرورت سے ہر سال اس موسم میں یہاں کے کمھاروں کو اپنے فن میں نئی نئی ایجادوں، طبّاعیوں، اور نازک خیالیوں کے ظاہر کرنے کا موقع مل جایا کرتا ہے۔

اِن کمھاروں نے جو مورتوں کے طرح طرح کے گروپ اور سِٹ تیار کیے ہیں، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزی بینڈ، رنڈیوں اور بھانڈوں کے طائفے، قدیم نوابوں کی محفل، اُمرا کے

دربار، مختلف اہلِ حرفہ کے مجمع، خاص شان رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ نمائش کے موقع پر یہاں کے ایک کمھار نے ایک ہندوستانی گاؤں بنایا تھا، جس میں آبادی کے اندر دکان اور مکانوں کے درمیان مختلف الوضع لوگوں کا چلنا پھرنا، بیلوں اور گاڑیوں کا گزرنا دکھانے کے بعد، گرد کے میدان میں کسانوں کا ہل جوتنا اور نالیوں کے ذریعے سے کھیتوں میں پانی پہنچانا دکھایا تھا۔ نالیوں میں پانی بہنا اور اس میں ننھی ننھی لہروں کا پڑنا تک نمودار ہوتا تھا اور یہ چیز نمایاں طور پر دکھائی گئی تھی کہ جو بیل ہلوں میں کام کر رہے ہیں، نہایت دُبلے ہیں اور اُن کی پسلیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ اسی طرح شاہی زمانے کے لکھنؤ کی ایک تصویر بھی میں نے دیکھی جس میں اُس وقت کی آبادی اور گلیوں اور ٹیلوں کا نقشہ دکھا دیا گیا تھا۔ مگر افسوس کہ یہ سب محنتیں ایک وقتی جوش کے طور پر دو چار روز نظر آ کے غائب ہو جاتی ہیں اور کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں ان تمام صناعیوں کے نمونے محفوظ رکھے جاتے ہوں۔ لندن میں "میڈم ٹساڈس اگزبیشن" کے نام سے ایک مومی تصویروں کا عجائب خانہ ہے، جس میں ہر قسم کی قدِ آدم تصویریں کل مشاہیرِ زمانہ کی اور نیز وہ جن میں صناع نے کوئی خاص کمال دکھایا ہے، جمع کر دی گئی ہیں۔ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ ممکن نہیں ہر جانے والے کو کسی نہ کسی مورت پر دھوکا نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ان مٹی کی مورتوں کا ایک عجائب خانہ یہاں قائم کر دیا جائے اور اس میں کمھاروں کی تمام کاری گریاں جمع کر دی جائیں تو میرا خیال ہے کہ فن کی ترقی میں بے حد مفید ہونے کے علاوہ نفع بخش بھی ہو گا۔ اس کے داخلے کے لیے ایک ٹکٹ مقرر کرایا جا سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی باہر کا سیاح بغیر اس کے دیکھے نہ جائے گا۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ خود ہم میں کوئی ذوق اور جوش نہیں ہے۔ اور ہم ہر بات میں گورنمنٹ کے دست نگر رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی دولت مند امیر زادے کو بجائے عیاشی کے، اس کا شوق ہو جائے تو کس قدر ناموری و خدمتِ وطن کا باعث ہو سکتا ہے؟

عجائب خانوں میں اس قسم کے کھلونے اکثر جمع کر دیے گئے ہیں، مگر وہ بہت ہی محدود ہیں۔ اور لکھنؤ میں اس صنعت کا درجہ اتنا ہی نہیں ہے کہ دیگر اعجوبۂ روزگار چیزوں کے ضمن میں چند کھلونے بھی رکھ دیے جائیں۔ یہاں کھلونوں اور گِلی مورتوں کی مستقل نمائش ہونی چاہیے۔